ممتاز شیریں نمبر

اردو اور پشتو زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار

ماہانہ ادبی مجلہ

ایڈیٹر: آذر تاج سعید

سب آفس

الف/۲۷۴، ظہیر آباد چارسدہ روڈ، پشاور

ناشر: پریمیر شوگر ملز اینڈ ڈسٹلری کمپنی لمیٹڈ، مردان

نیشکر گرچہ بند بند بود
حاصل اتفاق قند بود
—— (جعفر علی جعفری)

فن

متاعِ شیریں

افکارِ شیریں

جلد : ۳۰ ناشر اکبر علی خان نے گولڈن پرنٹنگ پریس محلہ جنگی پشاور سے چھپوا کر
شمارہ : ۴-۵ پرمیئر شوگر ملز مردان سے شائع کیا۔
جنوری - فروری سنہ ۱۹۷۴ء

قیمت
زر سالانہ

تزئین : خادم حسین کششؔ

ممتاز شیریں اردو ادب میں اپنی عالمانہ بصیرت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ انہوں نے نہ صرف خوبصورت افسانے لکھے ہیں بلکہ معیاری افسانوں کے تراجم سے اردو ادب کے دامن کو بھی مالا مال کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے اردو تنقید میں بھی ایک نیا معیار قائم کرنیکی کوشش کی ہے چنانچہ ان کے تنقیدی مضامین ان کے وسیع مطالعے، فاضلانہ تبحر اور اُن کی ناقدانہ ژرف نگاہی کا اعلےٰ نمونہ ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان کی بے وقت وفات نے ان کے ادبی منصوبوں کی تکمیل نہ ہونے دی۔ البتہ اس بات کی خوشی ہے کہ اپنی زندگی ہی میں انہوں نے منٹو کے افسانوں کے بارے میں جو کتاب "نورکی ناری" کے نام سے لکھنی شروع کی تھی وہ مکمل ہو چکی ہے۔

ہم ڈاکٹر صمد شاہین صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر ممتاز شیریں کے مکمل اور نامکمل غیر مطبوعہ اور گرانقدر مسودات اس نمبر کے لیے فراہم کیے جو اس نمبر کی ادبی وقعت میں اضافہ کا سبب بنے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس نمبر کے لیے تصاویر کی فراہمی میں بھی بڑی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بھانجی زینت جہاں (بنگلور) نے ممتاز شیریں کے انگریزی میں لکھے ہوئے خطوط کی اشاعت میں ہمارے ساتھ تعاون کر کے ان کی زندگی کے ایک اہم گوشے کی نقاب کشائی میں ہماری امداد کی ہے لہٰذا زینت صاحبہ بھی ہمارے خصوصی شکریے کی مستحق ہیں۔

بھائی منیر احمد شیخ کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی صحبت میں رہ کر نہ صرف ان کو قند کے اس نمبر کی تکمیل کے لیے آمادہ کیا بلکہ مرحومہ کی سوانح کے دو مختلف مسودوں کے تفصیلی مطالعے کے بعد ان کی کڑیاں ملانے اور انہیں ایک لڑی میں پرونے کا کام بھی سرانجام دیا۔

"قند کا ممتاز شیریں نمبر پیشِ خدمت ہے یہ کیسا ہے؟
اس کا فیصلہ آپ اس کے مطالعے کے بعد ہی کر سکیں
گے۔ ہمیں افسوس صرف اس بات کا ہے کہ کاغذ
کی گرانی کی وجہ سے ہم اس کی ضخامت کو
خاطر خواہ طور پر بڑھا نہیں سکے"۔

فن کار، موت ــــ اور زندگی

احمد ظفر

فن، میری روح کی پیاس ہے
اور میری روح کی پیاس میرے فن کی آواز ہے
میں ایک پیاسا ایک بے آواز فن کے دشت میں کس سے کہتا؛
میری روح پر کیا گذر رہی ہے؟
میری آواز کسی پیڑ، کسی پھول، کسی پتے تک کیوں نہیں پہنچتی؛
میری آواز ان تک پہنچتی تو پیڑ بے برگ و بار نہ ہوتے۔
پھول کبھی جگر چاک نہ ہوتے۔ پتے ہوا کے ایک جھونکے سے
دشت دشت کے مسافر نہ ہوتے۔

میں جو ہوں اور جو نہیں بھی
میں جو ہوں۔ جو اپنے آپ کو کسی سفر میں اس شہر کے مکینوں میں
اپنے آپ کو بھی ایک میں ہی سمجھ لیتا ہوں، جو دیکھتے دیکھتے میری
نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ میں پھر شہر خموشاں کا ایک مسافر،
ایک مکین، جس کی کوئی منزل نہیں۔
میں جو نہیں ہوں کسی سرخمیدہ گھنے درخت کی طرح کنارِ دریا کھڑا ہوں۔
لہریں ہمک ہمک کر اُچک اُچک کر مجھے دیکھتی ہیں کہ میں کون ہوں! اور میرے پتے
ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ تالیاں بجا بجا کر کہتے ہیں، "جسے تم تلاش کر رہی ہو
وہ تو یہاں نہیں ہے"۔ یہ تو ایک پیڑ ہے، جو تمہارے سفر اور اپنے قیام کے حجاب
میں صدیوں سے خاموش ہے۔ اسلئے کہ اس کے رگ و ریشے میں روح کی پیاس
اور اسکی خاموشی ہی اس کی آواز ہے۔ دریا کے کنارے کھڑے ایک پیڑ سے گفتگو کی
خواہش عبث ہے کہ اسکی آواز دوسروں تک تو کیا خود اپنے آپ تک نہیں پہنچ سکتی۔

حبیب حشی

۲۵۴ وارپل روڈ
رینیز پارک لندن
ایس ڈبلیو ۲۰

ایک خط

پروین شاہین

رواں دواں انسانیت
اپنے جلو میں ایک تلخ حقیقت لئے ہوئے ہے
میں ــــ اس سرمائے کو غارت نہیں کروں گا
اور نہ ہی معصومیت اور نوعمری کے ایک اور مرثیے سے
سازِ حیات کو اس کے مقدس مقام سے گراؤں گا۔

ــــ ڈائلن تھامس

عزیز ڈائلن! اس کی موت نے
قتل کیا ہے انسانیت کو
خدا کی۔
اگر میرا دیوانہ پن اور گریہ وزاری
اور غم و غصے میں ڈوبی ہوئی سرد آہیں
کلماتِ کفر ہیں
تو مجھے ہرزہ گوئی، یہ بے ادبی کرنے دو! کرنے دو!
نہ تو قتل اس سے قبل کبھی اتنا منصفانہ تھا
اور نہ ہی شیریں سے زیادہ کوئی نغمے، اتنی شیریں ہے

ــــ پرویز

میرے عزیز جگر، اور عزیز ترین ابا جان
مجھے کچھ نہیں معلوم کہ میں اس خط میں کیا لکھنے بیٹھا ہوں۔ پس اگر آپ کو یہ ایک پریشان ذہن کی بے معنی گفتگو

نظر آئے تو مجھے معاف کیجئے۔ مجھے کئی دنوں سے معلوم تھا لیکن میرے دکھ میں آج آپ کا خط پڑھنے سے مزید اضافہ ہوا ہے۔ جوانی اور خشک آنکھیں جنہیں میں دیوانگی سمجھتا تھا آج میرے قابو میں نہیں۔ میں ایک بچے کی طرح چلا رہا ہوں اگرچہ میں اب ایک بالغ ہوں۔

اس خبر کے سننے سے پہلے اس ماہ کی پندرہ تاریخ کو میں نے ایک نہایت ہی پُر اسرار خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ امی مکمل سکون کی حالت میں دراز ہیں ان کی آنکھیں بند ہیں اور ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر ہے وہ بے حد خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ سرخ تھے۔ گہرے سرخ نہیں۔ خون کی طرح سرخ۔ یہ مجھے کوئی بے معنی بات نہیں لگی بلکہ بہت مناسب اور فطری معلوم ہوئی۔ میں جھکا اور ان کے ہونٹوں پر بوسہ دیا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں جیسے وہ کچھ اور بند ہونا چاہتی ہوں۔ میں اس سے باخبر تھا بالکل ایسے جیسے خواب میں کوئی ہوتا ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں وہاں رہوں لیکن —— انہوں نے میرا نام کیوں نہیں پکارا۔ میرا نام سرگوشی میں ہی لیا ہوتا یا پھر وہ مسکراہٹ کچھ اور پھیل گئی ہوتی؛ یہ وہ کیسے کر سکتی تھیں؛ انہیں تو دنیا سے گذرے دس دن ہو چکے تھے۔ لیکن ہونٹ گرم اور زندگی سے بھرپور تھے۔ میں انہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اے خدا (اگر کہیں خدا ہے —— اور خدا ہونا چاہیئے) میرا بوسہ ان کے ہونٹوں تک پہنچا دے۔

گل ریز! تم نہیں جانتے کہ میں کس قدر شکر گزار، پرسکون اور ممنون محسوس کرتا ہوں کہ تم وہاں ایسے میں موجود ہو اور ابا جان کے لئے ذہنی تسکین کا باعث ہو۔ تم نے کتنی جرات سے یہ سب کچھ دیکھا سنا اور اس تجربے سے گزرے مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تم ابا جان کے اس عظیم دکھ میں ان کو دلاسہ دو۔ ہمارا خاندان کبھی بھی ایک طویل مدت کے لئے یکجا نہیں ہو سکا۔ محبت ہی ہمارا ایک رشتہ رہا ہے اور ہم نے کبھی ظاہری طور پر اس محبت کا اظہار ایک دوسرے کے لئے نہیں کیا۔ لیکن اظہار نہ کرنے کے باوجود محبت کی شدت میں کبھی کمی نہیں نہیں آئی۔ امی ہم میں زندہ رہیں گی جیسے کہ ہم ان کی وجہ سے زندہ ہیں۔

لندن سے تمہارے جانے کے فوراً بعد ہیلری نے مجھ سے فون پر ابا جان کا اسلام آباد کا پتہ دریافت کیا۔ میں ذرا چونکا کیوں کہ میرا خیال تھا کہ تم پتہ بتا چکے ہو گے۔ اس نے مجھ سے یہ بھی پوچھا کہ آیا امی کی صحت کی خرابی کے بارے میں مجھے کوئی خط موصول ہوا ہے؛ اس نے تار کا ذکر نہیں کیا۔ بعد ازاں روبی نے ٹیلیفون پر پوچھا کہ جی ایل سی کی جانب سے اس کا کوئی خط تو نہیں آیا۔ اس کے بعد نواب بھائی کا فون آیا اور کہا کہ میں ان کے گھر پہنچ جاؤں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں امی کی صحت کے بارے میں پریشان ہوں گا۔ لیکن مجھے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں اور اپنی پوری توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کرنا چاہیئے انہوں نے یہ بھی بتایا کہ انہیں چچا جان کا ایک تار موصول ہوا ہے جس میں امی کی صحت کے بارے میں تشویش کا اظہار اور مجھے پریشان نہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ آدھ گھنٹہ کے بعد نواب بھائی کا دوبارہ ٹیلیفون آیا۔ اس طویل گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ میں اب تک امی کی صحت کے بارے میں جو کچھ سوچ رہا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ خراب ہے اور مجھے کسی وقت بھی کسی بڑے حادثے کی خبر کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ میں اس صبح بالکل ٹھیک تھا لیکن مسلسل ٹیلیفون کی گھنٹیوں نے مجھے پریشان کر دیا آخر کار ہمارے دوست اور عزیز وہ بُری خبر سنانے میں کامیاب ہو گئے جس سے وہ نیک نیتی سے گریز کرنا چاہتے تھے۔

یہ سب کچھ بہت عجیب و غریب تھا۔ بہت غیر حقیقی احساس۔ میں اپنے آپ کو یہ جھوٹی تسلی دیتا رہا کہ یہ سب بے بنیاد ہے لیکن —— یہ سب حقیقت تھی —— بہت تلخ حقیقت۔

میں کالج سے سیدھا نواب اور نسیم کے ہاں پہنچا۔ پورے دو گھنٹے تکلیف، مایوسی اور کرب کی حالت میں گزرے

نواب بھائی نے جو کچھ ٹیلیفون پر کہا تھا وہی سب دہرایا۔ وہ مجھ سے بار بار یہ وعدے لے رہے تھے کہ ان دلدوز لمحوں میں جب وہ مجھے یہ المناک خبر سنا رہے تھے میں کہیں کوئی احمقانہ قدم نہ اٹھالوں یا اپنی تعلیم ترک کرنے کا فیصلہ نہ کرلوں۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ امی فوت ہوگئی ہیں۔ یہ سب بیچارے کس ذہنی کرب سے گزرے ——— میں نے کہا نواب بھائی اگر امی انتقال کر گئی ہیں تو مجھے فوراً بتائیے۔ میں یہ خبر سننے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی تعلیم جاری رکھوں گا اور مئی میں امتحان بھی دوں گا۔ میں یہ سب اس لیے کروں گا کہ امی کی یہی خواہش تھی۔ پھر انہوں نے کہا، ممانی ۱۱ تاریخ کو ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی ہیں اس کے بعد ان کی ہچکی بندھ گئی۔ پھر میں نے انہیں تسلی دی اگر آپ نے اس طرح رونا شروع کر دیا تو میں کس طرح صبر کر سکوں گا۔ براہ کرم میری مدد کیجیے کہ میں اس مشکل سے عہدہ برآ ہو سکوں۔ ہمارے لیے اس دکھ کو صبر سے برداشت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ سوائے جدوجہد کے کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ پھر میں نے موضوع گفتگو بدلا نواب بھائی کی اولاد ——— ان کی دیکھ بھال، تعلیم وغیرہ ——— جب انہیں پورا یقین ہوگیا کہ میں اس صدمے کو برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں تو پھر انہوں نے مجھے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ آل انڈیا ریڈیو سے انہوں نے یہ خبر سنی اور جنگ کے لندن ایڈیشن میں بھی ان کے کسی دوست نے ان کو یہ خبر دکھائی۔ ان کے اس دوست نے امی کی تخلیقات پڑھی تھیں۔ نواب بھائی نے مجھے زینت کے دو آخری خطوط بھی دکھائے۔ جن میں سے ایک نواب بھائی اور دوسرا نسیم کے نام تھا۔ پہلا خط امی کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے تحریر کیا گیا تھا۔ تقریباً اس تمام خط میں امی کا ذکر تھا۔ اس میں میری کچھ ان نظموں کا حوالہ بھی تھا جو میں نے امی کو بھجوائی تھیں۔ دوسرا خط اس کے ایک دن بعد کا تھا۔ اب ان کو بھی یہ خبر مل چکی تھی۔ وہ امی کی بڑی مداح تھیں۔ کیوں کہ ان کے جذبات کی بے ساختگی کا اظہار ان دونوں خطوط سے ہو رہا تھا۔

جب میں نواب بھائی کے گھر سے واپس ہوا تو اس وقت وہاں فضا کچھ ایسی غیر حقیقی سی تھی کہ میں نے اپنے آپ میں اتنا حوصلہ محسوس کیا کہ اس اندوہناک خبر کو یوں برداشت کر لیا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اس کی معنویت کو پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا۔ میں نے صرف وہ کلمات سنے تھے جن کا اظہار کیا گیا تھا۔ جب میں گھر جانے کے لئے سیڑھیوں سے ہوتا ہوا زمین دوز اسٹیشن پر پہنچا تو میری نظر دیوار پر چسپاں ایک پوسٹر پر پڑی جس پر لکھا تھا۔

APRIL I IS MOTHERS DAY. SHOW HER YOU CARE.

جب میں نے یہ دیکھا تو مجھے پہلی مرتبہ اپنی آنکھوں میں آنسو اترتے ہوئے محسوس ہوئے لیکن میں چلایا نہیں یقیناً وہ خوش نصیب تھے جنہوں نے اپنی ماؤں کو گلدستے اور تہنیتی کارڈ بھجوائے تھے تاکہ وہ اپنی محبت کا اظہار کر سکیں۔ میں جو کچھ کر سکتا تھا وہ یہ کہ میں نے امی کو تصور میں چوم لیا۔ کوئی بھی اس ایک بوسے کے عوض دنیا بھر کے پھول نہیں پیش کر سکتا۔ میں اس وقت صرف موت کے بھیانک عفریت کو کوس سکتا تھا۔ میں نے جان ڈن کے ساتھ یہ محسوس کیا۔

موت ——— مغرور مت ہو

مختصر سی نیند گزر گئی۔ ہم دائمی بیداری میں ہیں۔
موت اب نہیں ہوگی ——— موت تم خود مر جاؤ گی۔

میں نے ایک دفعہ موت کے موضوع پر فلسفے کے سیمینار کے لئے ایک مضمون لکھا تھا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ موت میں کوئی فلسفہ نہیں ہے صرف شاعری ہے اگر آپ اس اشارے کو نہیں سمجھ سکے تو صرف اس لئے کہ اس میں سمجھنے کی کوئی بات نہیں

ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے سمجھ لیا ہے تو میں غلط فہمی کو فریب دے رہا ہوں۔ یہ ہماری زندگی کے پہیوں کی طرح صاف شفاف ہے۔

میرے پیارے اباجان!

میرے پاس کہنے کو وہ الفاظ نہیں جو آپ کے اس پہاڑ جیسے غم میں سے رتی بھر دکھ بھی کم کر سکیں ہم تینوں کو اب وہ حوصلہ اور صبر پیدا کرنا چاہیئے جس کا مجسمہ امی کی ذات تھی اور جس کا اظہار اُن کے آخری ایام میں ہوا۔ اس عظیم خاتون کی قوت اب ہماری قوت ہونا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ اس دکھ میں گریز آپ کے لئے بڑی طمانیت کا باعث ہے۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ بھی اس کے لئے سہارا بنیں۔ اس کے خط سے اس دکھ اور احساس کا پتہ چلتا ہے جس کا مجھے کبھی شائبہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کا خط تین مرتبہ پڑھا اور تینوں مرتبہ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔

اباجان اور گریز ——— آپ دونوں کا بے حد شکریہ! آپ کا وجود ہے، خدا کا شکر ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی ہمارے اردگرد موجود ہیں جو ہمارے قدردان ہیں نواب اور نسیم ——— ہیلری اور رومی کی طرح بڑے ہمدرد رہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس مشکل سے میں میٹری کے بغیر کیسے عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔ میں اس رات جب یہ المناک خبر سننے کے بعد گھر پہنچا تو اس نے اپنی چھاتی کے ساتھ میرا سر لگا لیا۔ وہ کچھ بھی تو نہیں بولی صرف اپنے قریب رکھا۔ اس نے میرے لئے محسوس کیا اور یہ احساس ان ہزاروں لفظوں پر بھاری تھا جو وہ میرے دکھ میں شریک ہونے کے لئے زبان سے ادا کرتی۔

اے معزز خاتون! صنوبر اور چیل کے درختوں
کے نیچے آرام کر۔

ایک دل ابدی نیند سو گیا۔
اے اداس آنکھو! تم بھی آرام کرو۔ کہیں رو رو کر بہہ ہی نہ جاؤ
وہ مکمل آرام کی نیند سو رہی ہے۔

——— محبتوں کے ساتھ! پرویز

صلہ: بیگم پرویز

(انگریزی سے ترجمہ: محسن احسان)

دائیں سے بائیں بیٹھے ہوئے:
ڈاکٹر صمد شاہین۔ ممتاز شیریں
بیگم اوکتائی

دائیں سے بائیں کھڑے ہوئے:
پرویز شاہین۔ نعیم
گریز شاہین۔ جوہر سہیل
اوکتائی۔

مرزا ادیب

ممتاز شیریں سے ایک ملاقات

آپ کسی شخص سے پہلی بار ملتے ہیں تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ یہ ہستی جو اس وقت آپ کے سامنے بیٹھی ہے اس ہیولے سے مختلف نہیں جو آپ نے اس کے بارے میں سوچا تھا وہ ہستی آپ کے تصورات کے سانچے میں اس طرح ڈھل جاتی ہے کہ آپ سوچنے لگتے ہیں کہ یہ سانچہ بالکل اس ہستی کے مطابق بنایا گیا تھا۔ اس قسم کی شخصیت سے مل کر آپ کو کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ کوئی اچنبھا نہیں ہوتا۔ مگر کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آپ ایسے شخص سے ملاقات کر بیٹھتے ہیں جسے سمیٹنے کے لئے آپ کے تصورات کا سانچہ قطعاً غیر موزوں ہوتا ہے اور ایسے موقع پر آپ کو یقیناً حیرت ہوتی ہے اس حیرت کا خوشگوار یا ناخوشگوار ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ یہ شخص آپ کے تصورات سے مختلف ہو کر بھی ایک دلچسپ شخصیت ہے یا نہیں یا اس میں عام انسانی خوبیاں کس حد تک موجود ہیں اور میں نے جس شخصیت سے ملاقات کی تھی اس کا تعلق دوسرے زمرے سے ہے یعنی ممتاز شیریں میرے خیالات اور توقعات کے بالکل برعکس ثابت ہوئیں تاہم مجھے ان سے مل کر وہ مسرت ہوئی جس کا اظہار الفاظ کے ذریعے ممکن نہیں۔

ممتاز شیریں جس وقت دنیائے ادب میں داخل ہوئیں تو ان کی حیثیت افسانوں کے ایک سخت گیر نقاد کی تھی۔ ان کے مضامین پڑھے تو پتہ چلا کہ یہ خاتون اردو کے افسانے تو رہے ایک طرف انگریزی، روسی اور فرانسیسی افسانوی ادب کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کر چکی ہیں۔ ان کے مضامین میں قدم قدم پر غیر ملکی افسانوں اور ناولوں کے حوالے مل جاتے تھے۔ کسی کردار کا تجزیہ کرتی تھیں تو اس تجزیاتی مطالعے میں کئی ایسے کرداروں کا ذکر بھی چل نکلتا تھا جن سے ان کے بیشتر قاری غیر متعارف ہوتے تھے۔

ان کا مقالہ "تکنیک کا تنوع" سویرا میں چھپا تو ہر طرف اس کی دھوم مچ گئی۔ یہ مقالہ ایک ایسے ذہن کی پیداوار معلوم ہوتا تھا جس نے برسوں افسانے کی متنوع تکنیک سمجھنے کی کوشش کی اور دنیا کے نامور افسانہ نگاروں کے مشہور افسانوں کو غور و فکر کی گرفت میں لے چکا ہے۔

یہ مضمون اور ان کے دوسرے مضامین پڑھ کر میں نے ان کے بارے میں ایک خاص تصویر بنائی تھی اس کے بعد ان کے افسانے چھپنے لگے معلوم ہوا کہ وہ جتنی اچھی نقاد ہیں اسی قدر ماہر فن افسانہ نگار بھی ہیں۔ اپنی افسانوی تخلیقات میں وہ زندگی کی ہر حقیقت کو، وہ کتنی بھی تلخ اور مکروہ کیوں نہ ہو، اس کی پوری جزئیات کے ساتھ پیش کر دیتی تھیں۔ جنسی موضوعات کے سلسلے میں ان کا قلم خاص طور پر بڑا بے باک تھا۔ سعادت حسن منٹو ان کا پسندیدہ افسانہ نگار تھا اس سے بھی ان کے تخلیقی رجحانِ طبع کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ان کے مضامین پڑھ کر میں نے جو تصویر بنائی تھی۔ اب ان کے افسانے پڑھ کر اس کے خدوخال خصوصی طور پر تیکھے ہو گئے۔ یہ تصویر مجموعی لحاظ سے بڑی شوخ تھی اور میں جب ان سے ملا تو میرے ذہن میں اسی تصویر کے شوخ اور تیز رنگ چمک رہے تھے۔

مگر ان سے ملنے سے پہلے ایک اور حادثہ بھی رونما ہو چکا تھا۔

میں نے ان کی تصویر دیکھ لی تھی کسی ادبی رسالے میں۔ تصویر دیکھ کر میں کچھ مرعوب ہوگیا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مسحور ہوگیا۔

ادبی رسالوں میں خواتین کی تصویریں چھپتی ہی رہتی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اب تک صرف تین چار خواتین اہلِ قلم کی تصویروں نے دیکھنے والوں کو اور پڑھنے والوں کو متاثر کیا ہے۔ ان میں سے ایک خاتون تو ہیں قرۃ العین حیدر اور دوسری ممتاز شیریں۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ ممتاز شیریں سے ملاقات۔۔۔ وقت ہوئی جب میرے خیالوں میں ان کی ایک خاص تصویر تشکیل پذیر ہو چکی تھی۔

'ادبِ لطیف' کا سالنامہ شائع ہونے والا تھا۔ میں نے ابن انشا کو خط لکھا کہ کراچی کے ادیبوں اور شاعروں کی چیزیں جمع کر کے بھجوائیں کہ یہ کام وہ پہلے بھی کرتے رہے ہیں جواب میں انہوں نے فرمایا برادرم ایسی بات نہیں بنے گی۔ اگر پاؤں کی مہندی سوکھ چکی ہو تو خود تشریف لائیے جن سے چیزیں لینے کا نیک ارادہ ہے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر تسلیمات بجا لائیں اور میں تسلیمات بجا لانے کے لیے کراچی پہنچ گیا۔

کراچی ہر طرف پھیلا ہوا شہر اور میں ایک اجنبی۔ انشاجی نے اتنی مہربانی کی کہ کچھ ادیبوں کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے میرے ساتھ چلنے کی زحمت گوارہ فرمائی، کچھ ادیبوں کے پتے بتا دیئے جن لوگوں کے ٹیلیفون تھے انہیں اطلاع دے دی کہ لاہور سے ایک مدیر آیا ہے اور آپ کے دیدار کا شائق ہے۔

ادیبوں سے ملاقات کا مرحلہ ہر چند کٹھن تھا مگر طے ہوگیا کچھ زیادہ دقت پیش نہ آئی۔ کسی ادیب نے اپنی چیز عنایت فرما دی اور کسی نے محض وعدے پر ٹرخا دیا۔ اچانک خیال آیا کہ ممتاز شیریں کے یہاں تو حاضری ہی نہیں دی۔ انشاجی سے کہا۔

"آپ کو ممتاز شیریں یاد نہیں"!

جواب ملا۔ یہ کام آپ کا ہے میرا نہیں'

عرض کیا۔ چلیئے آج!

کہا گیا۔ میں نہیں جا سکتا آج اسمبلی میں بڑا کام ہے۔

اس زمانے میں انشاجی اسمبلی میں مترجم کے فرائض ادا کرتے تھے۔

کافی مشکل پیش آئی میں عورتوں سے ملنے میں شرمیلا تو کبھی نہیں تھا لیکن ممتاز شیریں سے ملنے میں بڑی جھجک محسوس ہوتی تھی۔ ان کے مقالے ان کے افسانے اور ان کی تصویر، دماغ ایک الجھن میں مبتلا ہوگیا۔

یاد آیا کراچی میں اسداللہ بھی تو رہتے ہیں اس معاملے میں ان سے استمداد کی جا سکتی ہے۔ اسداللہ حیدرآباد دکن سے آئے تھے اور ادب سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ منٹو کے قریبی دوست تھے۔ منٹو کے انتقال کے بعد انہوں نے منٹو کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس زمانے میں وہ کراچی کے کسی ہوسٹل میں رہتے تھے۔ قریب قریب روز ان سے ملاقات ہو جاتی تھی دوسرے دن وہ ملے تو میں نے عرض کیا۔

"اسداللہ صاحب! کیا آپ مجھ پر احسان کرتے ہوئے ممتاز شیریں سے مضمون یا افسانہ لے آئیں گے"؟

"آپ خود کیوں نہیں جاتے ان کے پاس"؟ انہوں نے استفسار کیا۔

"میری طبیعت ذرا خراب ہوگئی ہے آپ تکلیف کرلیں۔"

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی ان سے مل کر" اسداللہ نے کہا

میں نے ان کی آنکھوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ڈھونڈنے کی کوشش کی گر وہ تو بڑی سنجیدگی سے یہ الفاظ کہہ رہے تھے۔ میرے اصرار کا اسداللہ پر کوئی اثر نہ ہوا آخر یہ طے ہوا کہ دوسرے دن میں اسداللہ کے ساتھ جاؤں گا اور ممتاز شیریں سے ملاقات کروں گا۔

ابھی آٹھ ہی بجے ہوں گے کہ اسداللہ نے انشاجی کے دروازے پر دستک دی۔

یہ آپ ہی کا کوئی دوست ہے میرا کوئی ملنے والا اس طرح دروازے پر دستک نہیں دیا کرتا۔ انشاجی نے بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے کہا۔ باہر نکلا تو اسداللہ کھڑے تھے۔

"چلیئے!"

"کہاں!" میں نے پوچھا

اسداللہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا

"ممتاز شیریں کے ہاں چلو گے نہیں!"

چلنا پڑا۔ ان سے بھلا کیا عذر کر سکتا تھا

راستے میں بہت کم باتیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا۔ ممتاز شیریں سے آپ کی ملاقات ہوئی ہے پہلے!"

"کئی بار"

"کیسی ہیں — میرا مطلب ملنسار ہیں نا۔"

"آپ دیکھ لیں گے کیسی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کے یہاں پہنچ جائیں گے۔"

کچھ اور پوچھنا بے کار تھا۔

ممتاز شیریں کے مکان کے نیچے پہنچ گئے۔ اندیشہ ہائے دور دراز سے میری عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔

ممتاز شیریں کا خاندان اس بلڈنگ کی دوسری منزل پر رہتا تھا ہم اوپر آ گئے، نوکرانی نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ عام سا کمرہ تھا کسی جگہ بھی پر تکلف فرنیچر نظر نہیں آتا تھا۔

سات آٹھ منٹ گزر گئے میں نے قریبی بک شیلف سے کوئی کتاب نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگ گیا۔

اچانک اسد اللہ کھڑے گئے اور ساتھ ہی ان کی انگلیوں کا دباؤ میری گردن پر پڑا۔ میں بھی اٹھ گیا۔

"یہ جی میرزا ادیب ہیں"

"ادب لطیف کے ایڈیٹر صاحب"

یہ دو فقرے میرے کانوں نے سنے اور دماغ کی یہ حالت جیسے کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

"آپ خیریت سے ہیں!" کمرے میں آنے والی پست قد خاتون نے مجھے مخاطب کر کے کہا

معلوم نہیں میں نے اس کا کیا جواب دیا۔

"کب کراچی آئے۔"

اس کا جواب اسد اللہ نے دیا۔ شاید محترمہ کے پہلے سوال کے جواب میں میں نے بے خیالی کا اظہار کیا تھا۔

"تشریف رکھئے" اور ہم نے تشریف رکھ دی۔

اسد اللہ میری طرف سے مضمون کی درخواست پیش کرنے لگے اور میں نے محترمہ کو بڑے غور سے دیکھا۔

"یہ ممتاز شیریں ہیں؟"

دل نہیں مانتا تھا۔ میں نے ان کی جو تصویر بنائی تھی اس کا اس ممتاز شیریں سے دور کا بھی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ وہ وسیع المطالعہ نقاد ممتاز شیریں مقالے اور افسانے لکھنے والی ممتاز شیریں — وہ تصویر والی ممتاز شیریں جس کے بالوں میں گلاب مہکتا رہتا ہے — وہ کون ہے — اور یہ بالکل عام سی عورت — بالکل گھریلو عورت، جس کے بالوں میں کوئی گلاب نہیں ہے — جس کے چہرے پر سادگی برس رہی ہے جس کی گفتگو میں شوخی نام کو نہیں — کون ہے! کیا ممتاز شیریں کے دو روپ ہیں۔ ایک ادبی روپ اور ایک یہ گھریلو روپ۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اس ممتاز شیریں کو دیکھ کر اس ممتاز شیریں کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ ممتاز شیریں اور ہے اور یہ کوئی اور — لیکن میں تو اس ممتاز شیریں کے ہاں آیا ہوں جو ایک اعلےٰ درجے کی نقاد ہے — جس نے بڑے جامع اور فاضلانہ مقالات لکھے ہیں جو بڑے خوبصورت افسانوں کی مصنفہ ہیں۔

یہ ممتاز شیریں تو میرے تصورات — میرے خیالات سے بالکل مختلف ہے۔ اس ممتاز شیریں سے تو میں مرعوب تھا مسحور تھا اور یہ ممتاز شیریں تو ایسی خاتون معلوم ہوتی ہے جو گھر میں ہانڈی روٹی پکاتی ہے نوکروں سے سودا سلف منگواتی ہے۔ دھوبی کو کپڑے دیتے وقت ایک ایک کپڑا نوٹ کرتی ہے اور جب کپڑے دھل کر آتے ہیں تو ایک ایک کپڑے کا جائزہ لیتی ہے جو خود گھر کی صفائی کرتی ہے اور جو —

"معاف کیجئے میں صفائی کر رہی تھی۔ آپ کو انتظار کرنا پڑا۔" انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں اپنی ادھیڑ بن میں مصروف تھا اور انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں کچھ پریشان ہوں۔

"جی نہیں — کوئی بات نہیں!" میں نے کہا

میں نے دیکھا ان کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ بھی میلا میلا دکھائی دے رہا تھا۔ رک رک کر بات کرتی تھیں یقیناً دھیان ابھی صفائی ہی میں تھا۔

کراچی میں جہاں کہیں بھی گیا التزاماً پوچھا گیا۔ کیا پئیں گے۔ چائے آئی تو استفسار کیا گیا کتنے چمچے مگر یہاں خاتون خانہ نے ایسا کوئی تکلف روا نہ رکھا نوکرانی چائے کی ٹرے لے کر آئی تو وہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر چائے بنانے لگیں۔

میں نے دیکھا کہ وہ ایک بات کہتی ہیں اور پھر نظریں جھکا لیتی ہیں۔

ارشاد ہوا "ہماری بھابی کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔"

"بچے؟"

"شکریہ، ٹھیک ہیں۔"

"کتنے ہیں؟"

"ماشاء اللہ والا معاملہ ہے" میں نے سوچا تھا وہ میرے اس فقرے پر مسکرائیں گی مگر کیا مجال جو ان کے ہونٹوں نے مسکراہٹ کی ہلکی سی تہمت بھی گوارا کی ہو۔

"ادب لطیف کا سالنامہ چھپ رہا ہے" اسد اللہ نے گفتگو بدل کر حقیقی موضوع کے لیے راہ ہموار کی۔

"میں ادبِ لطیف پڑھا کرتی ہوں۔"

"اس کے لیے لکھئے بھی" میں نے عرض کیا۔

"اچھا جی" جواب ملا اور موضوع ختم!

چند لمحے خاموشی رہی۔

"آپ کے بچوں کو بھی افسانہ نگاری کا شوق ہوگا" سوال پوچھا گیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اب گفتگو ادب کے بارے میں ہوئی مگر توبہ کیجئے صاحب!

پتہ نہیں میں نے کیا جواب دیا۔ دوسرے لمحے فرمانے لگیں "یہ بچوں کا معاملہ کافی پریشان کن ہے۔ کوئی نہ کوئی بیمار ہو جاتا ہے۔"

توقع تھی کہ ادب کے متعلق کچھ گرما گرم قسم کی بحث ہوگی وہ ادب کی سب سے بڑی تحریک ترقی پسندی کے خلاف کئی مضمون لکھ چکی تھیں اس بارے میں ان سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا

"آپ ترقی پسندی کے خلاف کیوں ہیں؟"

"جی — کچھ خلاف تو نہیں ہوں۔ کچھ پہلو ایسے ہیں جن سے مجھے اور صمد شاہین صاحب کو اختلاف ہے — آپ چائے پی نہیں رہے، میں خود چائے بنایا کرتی ہوں آج نوکرانی کے ذمے یہ کام ڈال دیا۔ چائے پسند نہیں آئی آپ کو؟" اور وہ انگلیوں سے ساڑھی کے پلو کو مسلنے لگیں۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"جی ایسا تو نہیں ہے" میں نے تکلفاً کہا۔ چینی کا صرف ایک چمچ ڈالا گیا تھا اور میں اچھا خاصا چینی خور ہوں۔

"بسکٹ نہیں لیے آپ نے!"

"شکریہ"

"لیجئے نا"

اور بسکٹوں سے بھری ہوئی پلیٹ میری طرف بڑھا دی گئی

چند منٹ کے بعد ہم اٹھ بیٹھے۔

"بھابی صاحبہ سے میرا سلام کہئے — اور —"

"بچوں کو پیار" میں نے ان کا فقرہ مکمل کیا۔

"جی ہاں —" وہ ذرا سی مسکرائیں "بھابی اور بچوں کو لے کر یہاں ضرور آئیے گا" انہوں نے تاکیداً کہا اور ہم نیچے اتر آئے۔ مختصر ملاقات ک بہت مختصر ملاقات ختم ہوگئی۔

"اسد اللہ! یہ بتاؤ کہ ہم کس سے مل کر آرہے ہیں؟" میں نے سیڑھ سے اتر کر اسد اللہ سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"یار! سچ بتاؤ! یہ ممتاز شیریں تھیں؟"

اسد اللہ کئی لمحے مجھے حیرت سے دیکھتا رہا۔

آئینہ

اختر جمال

وہ آئینہ جو دائم نقاب میں اس کے پیش نظر رہتا ہے وہ ادب ہی تو ہے!

ادب اور فن کے آئینہ میں ہی انسان اپنے آپ کو پہچانتا ہے زندگی اپنا چہرہ دیکھتی ہے تاریخ اپنا سفر طے کرتی ہے ہمارے پیش رو ادیب ہمیں اتنا دے جاتے ہیں کہ ان کا ہم پر اتنا قرض ہوتا ہے مگر افسوس ہم انہیں کچھ نہیں دے سکتے ہم تو صرف انہیں یاد کر سکتے ہیں وہ ہمیں بیکراں روشنی دیتے ہیں راہ کی ساری تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں سب چیزوں کے مطلب اور معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے چپ چاپ چلتے رہتے ہیں ننھی ننھی سی چنگاریاں اپنے وجود کو خاک میں چھپائے اس کوشش میں کہ شاید کبھی اس چنگاری سے کوئی شعلہ پیدا کر سکیں وہ بھی بشرطیکہ زمانے کی سرد ہواؤں اور آندھی کے جھکڑوں سے چنگاری سلامت رہ جائے۔!

اردو ادب کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ اردو تنقید میں ان کے سوا کوئی خاتون ہے جو ان کے مقابل کھڑی ہو سکے اردو افسانے میں ان کا انداز منفرد تھا وہ ان ادیبوں کی صف میں ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ جس نے ہماری نسل کو متاثر کیا اور لکھنا سکھایا۔ ہم نے ان سے بہت سیکھا۔ بہت پایا۔ ان کی موت سب کا نقصان ہے اور سب سے زیادہ ان کے شوہر اور بچوں کا نقصان۔!

مگر میں تو جب ان کے لئے روئی تو اردو ادب۔ اردو تنقید ان کے شوہر اور بچوں کے لئے نہیں اپنے لئے روئی۔ ادب اور فن کی دنیا کے رشتے بھی روحانی رشتے ہوتے ہیں اور اس رشتہ سے وہ میری بڑی بہن تھیں۔ میں نے ان کے لئے جب اپنے بیٹے اور بیٹی کو روتے دیکھا تو سوچا کہ انہیں اردو ادب کے نقصان کا احساس بھی نہیں ہے وہ تو اپنی خالہ کے لئے رو رہے ہیں۔

مولانا روم نے کہا "روح جسم سے باہر نکل کر ہی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے جس طرح تلوار نیام سے باہر آتی ہے تو اس کی اصلیت معلوم ہوتی ہے" اور اب وہ ممتاز شیریں جو کم گو اور خاموش مشہور تھیں ہر زبان سے بول رہی ہیں۔

پہلی نظر میں وہ خاموش اور کم گو نظر آتی تھیں مگر ان کے قریبی جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ جتنی پیاری اور خوبصورت باتیں ممتاز شیریں کرتی تھیں کم لوگ کرتے ہوں گے۔

ان کے انتقال کو ایک مہینہ ہونے والا ہے مگر اس عرصہ میں انہوں نے کسی دن بھی تو تنہا نہیں رہنے دیا محبت کی سرحدیں ہی دونوں کی سرحدیں ہوتی ہیں اس لئے دور جا کر وہ اور قریب آ گئی ہیں لیکن آنکھیں انہیں قریب دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں اس لئے ان کی دوری بہت محسوس ہوتی ہے۔ ایک خلا۔ ایک سناٹا۔!

اور پھر جب ان پر لکھنے کو قلم اٹھایا تو یہ محسوس ہوا کہ وہ سامنے بیٹھی مسکرا رہی ہیں۔ یاد کی کتاب کا ہر صفحہ خود الٹتی جا رہی ہیں۔ ان کی محبتیں اور شفقتیں یاد آنے لگیں۔

وہ تو ان لوگوں میں سے تھیں کہ جن پر لکھنا اور قلم اٹھانا ایک

مشکل بن جاتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بات ان کی ہے کیا بات ہماری ہے کیا کہیں ____ کیا نہ کہیں ___ اور ان کی اور اپنی باتوں کو الگ الگ کیسے کریں۔ ؟

ممتاز شیریں تو ایک خوبصورت آئینہ تھیں۔ اس آئینہ خانے میں جہاں ہر طرف آئینوں کی چکاچوند ہے اتنے خوبصورت آئینے بہت کم ملیں گے۔ جب کوشش کر کے ہم ان آئینوں تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر وقت اور زمانے کا سفر انہیں دور کر دیتا ہے لیکن یہ سارے آئینے اور یہ گنبد مینائی اسی کی جلوہ گاہ ہے جہاں نہ وقت کوئی چیز ہے نہ مقام۔ بس آغاز سے انتہا تک سفر ہی سفر ہے۔ !

ان کی یاد کی کتاب کا پہلا صفحہ کھولا تو آئینہ ہی نظر آیا ممتاز شیریں کی پہلی کہانی جو میں نے پڑھی اس کا عنوان آئینہ تھا یہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے ان دنوں میں فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی ادب کی محبت گھٹی میں شامل تھی رفتہ رفتہ یہ احساس ہوا کہ ادب کی یہ محبت تو اپنی ذات کی تلاش کا سفر ہے تو پھر خود قلم اٹھا لیا۔ ! "آئینہ" کی وساطت سے ممتاز شیریں کو دیکھا تھا۔ پھر ان کی تصویر دیکھی اتنی خوبصورت آنکھیں۔ ! میں نے اپنی پسند کے سب لکھنے والوں کی آنکھیں بہت خوبصورت پائیں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ جنت کی حوروں کی اللہ میاں نے جو اتنی تعریف کی ہے شاید وہ سب بھی اہل قلم ہوں گی۔ !

[illegible]ء میں جب ہم لاہور آئے تو احمد بھائی جو احسن کے بچپن کے دوست ہیں ہوائی اڈے سے مجھے سیدھا اپنے گھر لے گئے اور جب وہاں جا کر مجھے یہ پتہ چلا کہ احمد بھائی کی بیوی ہاجرہ مسرور ہیں تو پھر میری خوشی کی انتہا نہ رہی پھر خدیجہ بہن اور ڈھیر ڈھیر سے کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ عجیب اتفاق ہے کہ ممتاز شیریں اور ادا جعفری سے اتنے برسوں بعد اسلام آباد آنے پر ملاقات ہوئی جب مجھے معلوم ہوا کہ ممتاز شیریں اسلام آباد میں رہتی ہیں تو ان سے ملنے کو بڑا جی چاہا مگر پھر سوچا کہ یوں پہنچ جانا کچھ اچھا نہیں لگتا شائد جانتی ہی نہ ہوں۔

ایک دفعہ ادا بہن سی بی کالج جا رہی تھیں انہوں نے مجھ سے بھی چلنے کو کہا اور بتایا کہ ممتاز شیریں بھی مباحثہ میں جج ہیں میں نے سوچا کہ چلیں ممتاز شیریں کو بھی دیکھ آئیں۔ میں نے ادا بہن سے کہا کہ مجھے ساتھ ہی لیتی جائیے گا۔

انہوں نے کہا ممتاز شیریں بھی ساتھ جا رہی ہیں میں نے سوچا لو ہم تو انہیں دیکھنے جا رہے تھے اور وہ ساتھ ہی چل رہی ہیں۔

جب ممتاز شیریں کے گھر کے سامنے موٹر رکی تو بہت خوبصورت ساڑھی میں ملبوس گہرا میک اپ کئے خوبصورت بال بنائے بڑے بڑے گانگز لگائے ایک خاتون آئیں انہوں نے ہلکا سا زیور بھی پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں۔ چھوٹے چھوٹے سے ہاتھ نیل پالش کئے ہوئے نفاست سے تراشے ہوئے لمبے ناخن۔ مگر ان سب چیزوں سے زیادہ اچھی مجھے وہ مسکراہٹ معلوم ہوئی جو تعارف کے بعد ان کے چہرے پر کھیل گئی۔ ادا بہن نے ہمارا تعارف کرایا۔ وہ بولیں "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" یہ جملہ میں کہنے کا ارادہ کرتی رہ گئی۔ اور جواب میں صرف مسکرا دی۔ مجھے زیادہ میک اپ کئے ہوئے خواتین کچھ اتنی بیگم نما لگتی ہیں کہ میں ان سے ملتے ہوئے جھجکنے لگتی ہوں اب جو وہ بیگم نما لگیں تو میں راستہ بھر خاموش ہی بیٹھی رہی۔ ادا بہن کی باتوں میں بھی ان کے شعروں کی مٹھاس ہوتی ہے وہ بولتی رہیں میں سنتی رہی ممتاز شیریں کبھی کبھی ایک آدھ جملہ بول دیتیں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کم گوئی اور خاموشی ان کی شخصیت کا ایک خوبصورت پہلو تھی واپسی میں انہوں نے اپنے گھر اترنے کو کہا مگر دیر ہو چکی تھی ہم نے پھر کبھی آنے کا وعدہ کیا۔ میرا قلم سی بی کالج میں کہیں کوٹ سے گر گیا تھا مجھے بیٹھے بیٹھے اس کا شدید غم لاحق ہوا تو ادا بہن نے سمجھایا کہ اختر بہن تو یہ بات کہا کرتے ہیں کہ جو چیز دوبارہ حاصل ہو سکتی ہے اس کا غم نہیں کرنا چاہیئے" میں نے کہا ہائے اس قلم سے میں نے اتنا لکھا تھا مجھے عادت تھی اس سے لکھنے کی وہ اب دوبارہ نہیں مل سکتا۔ ! اور کوئی چیز کھو جاتی تو غم ہوتا"

مہینوں گزر گئے ممتاز شیریں کے گھر جانے کا پھر اتفاق نہ ہوا۔ اسلام آباد میں جب پہلی عید آئی تو میں نے احسن سے کہا کہ یہاں تو ادب کا ہی رشتہ سب سے بڑا رشتہ ہے چلو ممتاز شیریں اور ادا بہن کے گھر عید ملنے چلیں" سرکاری عید ملنے کی ہم کو کبھی توفیق نہیں ہوئی دوست اور عزیز سب دور تھے۔

ہمارے جانے سے دونوں میاں بیوی بہت ہی خوش ہوئے انہوں نے ہماری بہت خاطر کی ممتاز شیریں سرخ چمکدار ساڑھی پہنے تھیں بہت خوبصورت زیور پہنا تھا۔ بہت ہی خوبصورت اور چمکدار چوڑیاں وہ بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ان کا ڈرائنگ روم ایک عجائب گھر کی طرح خوبصورت تھا۔ جہاں جہاں وہ گئی تھیں وہاں کے نوادرات کے نمونے سجے ہوئے تھے۔ میں ان سب چیزوں کو دلچسپی سے دیکھتی رہی چند چیزوں کے بارے میں ممتاز شیریں نے بتایا کہ وہ کہاں سے لی ہیں۔

ممتاز شیریں کی ایک بہت بڑی تصویر مینٹل پیس پر آویزاں تھی جو ترکی کے کسی آرٹسٹ نے بنائی تھی۔ مصوّر نے اس تصویر میں شوخ رنگوں سے محبت کرنے والی ممتاز شیریں کو اور بھی شوخ بنا دیا تھا۔ پھر کونے میں رکھے ہوئے وینس کے مجسّمے پر میری آنکھیں جم کر رہ گئیں!

وہ دونوں میاں بیوی دوسرے ہی دن سویرے سویرے ہمارے گھر آئے تو میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ دوپہر تک ہمارے گھر میں اور انہیں میرا بنایا ہوا بھوپال کا شیر خاص طور پر بہت پسند آیا انہوں نے اس کی ترکیب بھی پوچھی۔ اس روز ان کے جانے کے بعد میں سوچتی رہی کہ وہ جو مجھے بیگم نما معلوم ہوئی تھیں وہ تو صرف زرق برق ساڑھی اور میک اپ کی وجہ تھی ورنہ وہ تو بس ممتاز شیریں تھیں ہم رفتہ رفتہ ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے ہم دونوں میں چند باتیں مشترک بھی تھیں خاص کر پڑھنے اور تنہا رہنے کی عادت پھر وہ پڑھنے میں بھی شامل ہوگئیں اور تنہائی بھی بانٹنے لگیں۔ بہت سی چیزیں میں نے ان کے کہنے سے پڑھیں۔ سارتر کے ناول وغیرہ۔ مگر کافکا میں میرا جی نہ لگا اور میں نے کہا کہ جوائس کی بھول بھلیاں مجھے پسند نہیں آتیں۔ یہ شعور اور لاشعور کی دنیا پرسے تو ہمارے صوفی شعرا نے جس طرح پردے اٹھائے ہیں اب ان میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا کسی کے بس کی بات نہیں ہے وہ کہتیں دراصل اردو شاعری پڑھا پڑھا کر اور پھر میاں بھی شاعر ہیں اس لئے اب آپ کو اور چیزوں میں مزا ہی نہیں آتا۔"

میں نے انہیں تقاضا کر کر کے "آگ کا دریا" پڑھوایا۔ میں نے کہا اس ناول کے ساتھ یہاں پورا انصاف نہیں ہوا۔ آگ کا دریا ہمارے عہد کا سب سے اچھا ناول ہے۔ آپ پڑھئے انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے قرۃ العین حیدر کی ابتدائی چیزیں اور ناول ہی پڑھے ہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ قرۃ العین حیدر وہ واحد لکھنے والی ہے جس کے ہاں سفر ہی سفر ہے آگے اور آگے۔ ! پھر میں نے ان سے قرۃ العین کے ناولٹ اور نئی کہانیوں کا تذکرہ کیا انہوں نے کہا کہ مجھے ان کی نئی کہانیاں اور ناولٹ لا کر دیجئے میں تو اتنے عرصہ ملک سے باہر رہی رسائل بھی نہیں آتے تھے۔" پھر انہیں قرۃ العین کی نئی کہانیاں ناولٹ بہت پسند آیا۔

آگ کا دریا پڑھ کر وہ بہت متاثر ہوئیں اور اکثر آگ کا دریا کی تعریف کرتیں تو میں بہت خوش ہو جاتی۔ جب میں قرۃ العین کی تعریف کرنے پر آتی تو وہ کہتیں اختر بہن آپ تنقید کیوں نہیں لکھتیں۔ میں نے کہا کہ قرۃ العین پر لکھنے کو میرا بڑا جی چاہتا ہے مگر تنقیدی صلاحیت پڑھانے میں ہی خرچ ہو جاتی ہے اگر تدریس کا پیشہ نہ ہوتا تو شائد تنقید ضرور لکھتی مگر اب جو وقت ملتا ہے وہ تخلیقی کاموں کے لئے بھی کم ہوتا ہے ہاں اگر کبھی فرصت ملی تو میں قرۃ العین پر محنت سے کچھ لکھونگی۔ مجھے قرۃ العین کے واپس جانے کا شدید ملال تھا میں ان سے کہتی کہ اس کا جتنا بڑا درجہ اور مقام تھا یہاں اسے وہ نہ دیا گیا اسے تنگ دلی اور دل آزاری ملی اور اسی لئے وہ چلی گئی۔ وہ کہتیں "آپ سچ کہتی ہیں یہاں تنگ دلی اور دل آزاری کے علاوہ کیا ہے ہم خوش قسمت ہیں جو ہمیں شوہر ایسے ملے ہیں جنہوں نے ذہنی رفاقت بھی دی ہے ورنہ ہم کیا کرتے؟"

میں ان سے کہتی "اگر اس کی شادی ہو جاتی تو شائد وہ بھی پھر نہ جاتی۔ رہ پڑتی۔ مگر اس کا تو بچپن، جوانی اور بڑھاپا سب ادب ہے آزاد تھی۔ چلی گئی!"

وہ مجھے قرۃ العین سے اپنی چند ملاقاتوں کا حال سناتیں۔ پھر جب میں ہندوستان سے واپس آئی تو قرۃ العین سے مل کر آئی وہ مجھ سے قرۃ العین اور عصمت آپا اور سب ادیبوں کا حال پوچھا کرتیں میں انہیں سناتی انہیں ادیبوں کی سب برادری سے محبت تھی کبھی کسی کی بھی برائی ان کی زبان سے نہیں سنی۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے ان کی دل آزاری کی تھی ان کی بھی وہ تعریف ہی کرتی تھیں مگر دل ہی تھا پتھر تو نہیں تھا

کبھی کبھی چوٹ درد اور کسک بھی محسوس کرتی تھیں مگر وہ تو اس
درد اور چوٹ کا اظہار ہنس کر کرتی تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں مہینوں
ان کے گھر نہ جایا کرتی اور وہ ہفتے میں کئی بار آجاتیں اگر میری کوئی
کہانی کسی رسالہ میں پڑھتیں تو اسی روز رسالہ لئے آجاتیں کہانی کی اتنی
تعریف کرتیں کہ میرا جی چاہتا اب اس سے بھی اچھی کہانی لکھ کر دکھاؤں
پھر رسالہ مجھے دے جاتیں اور کہتیں "آپ کے پاس دو کاپیاں ہو جائیں گی"

جن دنوں میری کتاب چھپ رہی تھی طفیل بھائی نے کہا کہ کسی
نقاد کے چند جملے بھیج دیں جو لیف کور پر چھاپ دیئے جائیں بطور تعارف
کے مگر کسی نقاد کا کوئی جملہ مجھے نہ ملا۔ نقوش کے افسانہ نمبر میں جو سمپوزیم
افسانہ پر ہوا تھا اس پر طفیل بھائی نے ہی میری کہانیوں پر کچھ کہا تھا میں نے
ان سے کہا کہ "آپ ہی لیف کور پر کچھ لکھ بھیجئے مگر بہن کر کے نہیں سچی بات
لکھیئے گا میں بالکل برا نہیں مانوں گی۔

احسن نے کہا کہ تم ممتاز شیریں سے لکھوالو وہ ضرور لکھ دیں گی"
میں نے کہا وہ تو ضرور لکھ دیں گی مگر مجھے خود کہتے ہوئے شرم سی آتی ہے
انہوں نے میری نئی کہانیاں تو پڑھی ہیں مگر اس کتاب میں جو شامل کی ہیں
وہ انہوں نے پڑھی بھی نہیں ہیں۔ اب کچھ اچھا نہیں لگتا کہ زبردستی مسودہ
پڑھوایا جائے اور کچھ لکھوایا جائے"۔ ممتاز شیریں نے مجھ سے کئی بار کہا تھا کہ
وہ اتنے عرصہ ملک سے باہر رہی ہیں اس لئے انہوں نے نئے لکھنے والوں
کو بالکل نہیں پڑھا ہے میرے لئے دیباچہ لکھوانا ایک اچھا خاصہ مسئلہ بن
گیا تھا کس سے کہوں؟ کیسے کہوں آخر میں نے تنگ آکر خود ہی دیباچہ لکھ
ڈالا۔ پھر جب کتاب چھپ کر آئی اور ممتاز شیریں کو دی تو وہ اتنی خوش
ہوئیں کہ میں سوچنے لگی کہ میں نے ہی تکلف کیا اگر میں ان سے کہتی تو
وہ بڑی خوشی سے لکھ دیتیں۔ انہوں نے اتنے حوصلہ افزائی کے جملے کہے کہ
میں حیران رہ گئی۔

میں ان کی محبت بھری باتیں کہاں تک یاد کروں۔ انہیں میری
کون سی چیز پسند نہیں تھی ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کی تعریف کرتیں
تو جی چاہتا کہ بس سارے کام چھوڑ کر کھانا ہی پکایا کریں۔ کہانی کی تعریف
کرتیں تو دوڑتے بھاگتے کہانی لکھنے کو جی چاہنے لگتا اور جس بات کی تعریف
کرنے پر آتیں۔ افسانہ نگاری کا حق ادا کر دیتیں۔ وہ ان لوگوں میں سے
تھیں جن کی نظروں میں اتنا حسن ہوتا کہ وہ دوسروں کی شخصیت میں
وہ سارا حسن دیکھنے لگتے ہیں اور ان کا مخاطب حیران ہو کر سوچتا ہے کہ
ساری زندگی ٹیڑھے بھینگے اور گرد آلود آئینوں میں اپنی شکل دیکھ کر
بیکار کڑھتے اور جلتے رہے کاش اس آئینہ میں پہلے اپنی صورت دیکھی
ہوتی! احسن اکثر شاہین بھائی سے گپ لڑانے اکیلے ہی نکل جاتے اور
پھر ممتاز شیریں جب آتیں تو میں صفائی پیش کرتی "دیکھئے مجھے بتا کر
آپ کے ہاں نہیں جاتے ورنہ میں ضرور آتی یا پھر میں جب بہت
دنوں تک نہ جا پاتی تو میں ان سے کہتی کہ میں آ رہی تھی مگر یہ ہوا وہ ہوا"

ایک دن پیار سے بولیں "دیکھئے آپ نہ آنے کی معذرت نہ
پیش کیا کیجئے ہمیں آپ کی مصروفیتوں کا علم ہے۔ آپ کے لئے گھر سے
نکلنا واقعی مشکل ہوتا ہے ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے اس
لئے آپ آئیں یا نہ آئیں ہم چلے آتے ہیں"

شرمندگی کا احساس بہرحال مجھے اکثر یہ بات کہنے پر مجبور کرتا کہ
میں آنا چاہتی تھی یا آنے والی تھی مگر وہ بات کاٹ کر کہتیں "ارے اختر بہن
ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے ہم تو دن بھر گھر میں بیٹھے بیٹھے
پڑھتے پڑھتے تھک جاتے ہیں تھوڑا بہت گھر کا کام ہوتا ہے شام کو
جب شاہین آتے ہیں تو ہم بڑی آسانی سے نکل آتے ہیں" پھر وہ پیار
سے کہتیں "ہمیں آپ کے پاس آنا۔ آپ کی باتیں سننا اور آپ کے
ساتھ ٹی وی دیکھنا اچھا لگتا ہے آپ نہ آسکیں تو کوئی بات نہیں"۔ اتنے
پیار کے جملے سن کر تو میں اترا جاتی اور پھر میں نے واقعی معذرت پیش کرنی
بھی چھوڑ دی اور میں آنا ان کا ہی فرض سمجھنے لگی۔ اگر وہ دو چار دن نہ آتیں
تو مجھے فکر ہونے لگتی کیا بات ہے کیوں نہیں آئیں۔ میری پریشانی دیکھ کر
احسن دفتر سے سیدھے ان کے گھر چلے جاتے پھر آکر بتاتے کہ "موسم خراب تھا اس
لئے نہیں آئیں" پھر میں ہنس پڑتی اور سوچتی کہ میں بھی تو زیادتی کرتی ہوں انہیں
خراب موسم کا بھی خیال نہیں آیا۔ مجھے شاید خراب موسم میں بھی ان کا انتظار
رہنے لگا تھا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہوتی وہ کوٹ وغیرہ پہنے آجاتیں
ان سے کسی طرح کا تکلف تو تھا نہیں بیڈروم میں آرام کرسی پر دو کشن رکھ
کر دراز ہو جاتیں اپنا کوٹ ٹانگوں پر ۔۔۔ پھیلا لیتیں۔ شاہین صاحب

اور احسن کبھی ڈرائنگ روم میں گپ لگاتے کبھی سب ہی ٹی وی کے پاس جمع ہو جاتے۔

شاہین بھائی جب بولتے ہیں تو یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے بس سنا کریں مگر میں اور طارق کچھ نہ کچھ بول ہی لیتے تھے جہاں نقطۂ نظر کا فرق ہو وہاں سچی بات کہے بغیر مجھ سے رہا ہی نہیں جاتا۔ پھر باقاعدہ بحث شروع ہو جاتی۔ ممتاز شیریں زیادہ تر خاموشی سے سنا کرتیں۔ کبھی ایک آدھ بات وہ بیچ میں بول پڑتیں۔ یا شاہین صاحب کو کوئی بھولی ہوئی بات یاد دلا دیتیں یا کسی غلطی کی نشاندہی کر دیتیں کہ یہ بات یوں نہیں یوں تھی۔ طارق شاہین بھائی کو قائل کرنے پر جب تل جاتا تو اس منظر سے ممتاز شیریں بہت لطف لیتیں۔ خوش ہوتیں اور کہتیں" بھئی اس ٹی وی سے زیادہ مزا تو باتیں سننے میں آ رہا ہے اسے خاموش کر دیں" ٹی وی کے زیادہ تر بور پروگراموں کا منہ بند کر کے دیکھے جاتے تھے۔

گذشتہ چند سالوں میں ٹیلیویژن کے سب ہی اچھے پروگرام ہم نے ساتھ دیکھے تھے۔ اب ان کے بغیر ٹی وی کا کوئی پروگرام اچھا نہیں لگتا اتنے چھوٹے چھوٹے دلچسپ فقرے اور جملے وہ تبصرے کے طور پر کہتیں کہ لطف آ جاتا۔ منٹو کی زیادہ تر کہانیاں ہم نے اکٹھی دیکھیں۔ جہاں کہیں منٹو کے ساتھ زیادتی ہوتی وہ بے چین ہو جاتیں اور جس کہانی کو خوبصورتی سے پیش کیا جاتا وہ اس کی جی بھر کے تعریف کرتیں۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگیں کہ منٹو کا ڈرامہ اس منجدھار میں" ٹیلیویژن پر میں نے نثار عزیز کے ہاں دیکھا تھا اس ڈرامے کو پہلے بھی پڑھا تھا ریڈیو سے بھی سنا تھا مگر اب کے جانے کیوں اس اپاہج آدمی کا نقش ذہن پر جم کر رہ گیا ہے۔!

کئی بار ملیں تو وہی بات کی کہ اس ڈرامہ کا کچھ زیادہ ہی اثر میں نے قبول کیا اختر بہن میری کمر میں اتنا شدید درد ہے مجھ سے آج کل چلا نہیں جاتا مجھے ڈر لگتا ہے کہیں میں بھی ۔؟ ارے آپ نے تو اس کردار کو اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے اب آپ کوئی دوسری اچھی سی چیزیں پڑھئے۔!"

اکثر جب ہم دونوں ان کے گھر جاتے تو احسن اور شاہین بھائی باہر لان میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے اور میں اور ممتاز شیریں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ریکارڈ سنتے یا پھر باتیں کرتے۔ اکثر سیاست ہمیں بہت تھکا دیتی تو ہم فیصلہ کرتے کہ مردوں کو باہر بیٹھ کر باتیں کرنے دیں اور ہم ریکارڈ سنیں۔

جن دنوں الیکشن ہونے والے تھے ان دنوں رات کے بارہ ایک بجے تک بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ پھر الیکشن کے بعد جو خونی ڈرامہ شروع ہوا تو سب کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ کبھی فارن پریس ڈائجسٹ نکالے جاتے وہ سب خبریں جو اپنے ملک کے اخباروں میں نظر نہیں آتیں وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھی جاتیں موت سے پہلے کا سناٹا سب محسوس کر رہے تھے اور پھر قتل و غارت نے اعصاب تباہ کر دیئے۔ میں ان دنوں بہت بیمار ہو گئی شدید اعصابی درد گردن میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ملنا جلنا اور کام کرنا مشکل بن گیا۔ ممتاز شیریں ان دنوں بہت پیار سے سمجھاتیں" دوسروں کا غم کھانا اچھا ہے مگر دوسروں کا غم بالکل اوڑھ لینا اچھی بات نہیں ہے" مگر تنگ دلی تعصب اور نفرت کا وہ تماشا مجھے اپنے بہت ہی قریب بھی نظر آ رہا تھا۔ میں ان کے سامنے اپنا سارا بوجھ اتار کر رکھ دیتی۔ ان سے کہتی کہ کام میرے لئے سدا رُوحانی سکون کا ذریعہ رہا ہے اب وہ بھی روحانی عذاب بن گیا ہے" وہ مجھے بار بار سمجھاتیں کہ آپ پنڈی کالج چلی جایئے آپ وہاں اتنی خوش تھیں ناحق یہاں آ گئیں۔ انسان کو ہمیشہ ان لوگوں میں رہنا چاہیئے جو اس کی طرح سوچتے ہوں محسوس کرتے ہوں اس کے برابر کے ہوں تاکہ اسے سمجھ سکیں" پھر میں ان سے کہتی کہ آپ ہی تو کہا کرتی تھیں کہ جسم کو بھی تھوڑا سا آرام کرنے کا حق ہے۔ اب میں جسم کو آرام کروا رہی ہوں وہ کہتیں "مگر یہ آرام آپ کو بہت مہنگا پڑ رہا ہے۔ اس آرام کی قیمت ذہنی اذیت تو نہیں ہونا چاہیئے۔"

میری بیماری بڑھتی گئی میں نے PHYSIO THERAPY شروع کرائی مگر معلوم ہوتا تھا کہ نس نس میں تیرتا ہوا درد مجھے ہلاک کر کے چھوڑے گا۔ ایک دن جب مجھے وہ پھر پنڈی کالج واپس جانے کا مشورہ دے رہی تھیں میں نے ان سے کہا میں ساری دنیا کی تنگ دلی۔ تنگ نظری اور نفرت کے خلاف اکیلی ہی لڑوں گی۔ میں بھاگوں گی نہیں انقلابی لوگوں کو فرار زیب نہیں دیتا ہم جہاں بھی ہوں حالات کا جم کر مقابلہ کرنا چاہیئے اور سچ بولنا چاہیئے چاہے کتنی ہی اذیت برداشت کرنی پڑے۔ یہ بات کہتے ہوئے مجھے چے گویرا کے الفاظ یاد آئے۔ ممتاز شیریں ہنس پڑیں پھر بولیں" انقلابی لوگ ایسے مقابلہ کرتے ہیں آنکھوں میں اتنے موٹے موٹے آنسو بھر کر گردن پکڑ کر۔ درد اور اذیت

جھیل کر۔ ارے انقلابی لوگ تو لڑتے جھگڑتے ہیں آپ بھی تلوار اٹھائیے"
میں نے کہا "میں نے تو ساری زندگی قلم کو ہی اپنا ہتھیار سمجھا ہے اچھا
اب لکھنا شروع کروں گی"

پھر میں نے ان دنوں بنگلہ دیش کے حالات سے متعلق چند کہانیاں
لکھیں۔ اور پھر نس نس میں تیرتا ہوا وہ سارا درد جیسے قلم نے باہر کھینچ لیا
اگر ممتاز شیریں مجھے نہ سمجھاتیں تو خدا جانے میں کتنے دن اور گردن پکڑے
رہتی۔ وہ مجھے سمجھاتیں کہ زیادہ اخبار بھی نہ پڑھا کیجئے اور چیزیں پڑھا
کیجئے۔ پھر میں نے ادھر ادھر کے ڈھیروں اخبارات پڑھنے کم کئے اور
دوسری چیزوں میں دل لگانے کی کوشش کی۔ سوچا کہ فارسی شاعری
نہیں پڑھی فارسی شعرا کو پڑھنا چاہیے حافظ کو پڑھنا شروع کیا انہی
دنوں میں نے "صلیبیں میرے دریچے میں" پڑھی۔ ان خطوط کو پڑھ کر یہ
محسوس ہوا کہ قید خانے میں ایک مجبور اور اسیر شوہر نے ساری امید
ڈھارس حوصلہ اور روشنی لفظوں کی وساطت سے اپنی تنہا، مجبور
اور پریشان بیوی کو دی ہے۔ میں نے سوچا آنے والی نسلیں جتنی محبت
فیض سے کریں گی ان خطوں کو پڑھنے کے بعد اتنی ہی محبت انہیں ایلس
سے بھی ہوگی۔ میں نے ممتاز شیریں سے بھی وہ خط پڑھنے کو کہا انہوں
نے کہا کہ وہ ضرور پڑھیں گی۔ پھر حافظ۔ غالب اور "صلیبیں میرے دریچے میں"
سب چیزوں نے مل کر مجھے سنبھال لیا۔ میں خوش رہنے لگی مگر میری
تندرستی میں ممتاز شیریں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔

افسوس کہ جب ممتاز شیریں بیمار پڑیں تو میں ان کے لئے کچھ نہ کر
سکی ان کی بیماری کوئی نہ بانٹ سکا۔ انہیں کوئی نہ روک سکا۔ نہ ان
کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آئے نہ انہوں نے درد سے بیقرار ہو کر
گردن پکڑی وہ تو ہنستی مسکراتی پولی کلینک میں داخل ہوئیں اور
اسی طرح ہنستی مسکراتی پُرسکون جا سوئیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ ٹی وی
دیکھتے دیکھتے کبھی کبھی آرام کرسی پر سو جایا کرتی تھیں۔

انہیں میری شنیل کی لال رضائی پسند تھی میں کبھی ان سے کہتی
کہ آپ آرام سے بستر میں لیٹ جائیے اور رضائی اوڑھ لیجئے تو کہتیں "نہیں
بھئی اگر ایک بار لیٹ گئے تو پھر سردی میں اُٹھ کر باہر جانے کو جی نہیں
چاہے گا" اور جب وہ ہسپتال میں ایک بار جا کر لیٹ گئیں تو ان کا گھر
جانے کو بہت جی چاہتا تھا مگر وہ اُٹھ کر سردی میں گھر نہ جا سکیں ان کا جسم
تو سب لے گئے مگر روح روشنی کے اس سفر پر جا چکی تھی جس کی سرحدیں
وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے دیکھ کر مسکرایا کرتی تھیں۔

ممتاز شیریں کی باتیں کہاں تک یاد کروں۔ عید کے دن باورچی
خانے میں ہوتی کہ آواز آتی "ارے بھئی کہاں ہیں" میں دوڑ کر آتی "ارے
ابھی تک آپ نے کپڑے نہیں بدلے"

پھر میں جلدی سے کوئی ساڑھی لپیٹ کر آتی۔ ممتاز شیریں ہنس کر
کہتیں "ارے اسلام آباد کی بنگالنیں تو بنارسی ساڑھیاں باندھے گھوم
رہی ہیں۔ یہ آپ اس قدر غم کیوں کر رہی ہیں ساری دنیا کا غم کھانے
کو کیا آپ کی اکیلی جان رہ گئی ہے ارے بھئی کوئی اچھی سی ساڑھی پہنئے
ہمیشہ ہاتھ اور کان خالی رہیں یہ اچھا نہیں لگتا" میں بڑی سعادت
مندی سے ان کی بات مان لیتی ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں ڈال لیتی۔

میں ہلکے رنگ پہنتی تھی ممتاز شیریں کو شوخ رنگ پسند تھے وہ کہتیں
"ارے اتنے بھی کیا ہلکے رنگ۔ نظر بھی نہیں آتے۔" میں جواب دیتی کہ "
اس عمر میں کیا گہرے رنگ پہنوں پھر میں تو ہمیشہ سے ہلکے رنگ پہننے کی
عادی ہوں مجھے گہرے رنگ اچھے نہیں لگتے"

"ارے آپ تو ہم سے اتنی چھوٹی ہیں اگر آپ اس قدر بڑھاپا طاری
کریں گی تو پھر ہم کہاں جائیں گے پھر گویا ہمیں تو پہننے کا حق ہی نہیں رہا۔"

"بھئی اپنی اپنی پسند ہے" میں جواب دیتی

پھر ممتاز شیریں اپنے پسندیدہ رنگوں کی اس طرح تعریف کرتیں اور یقین دلاتیں
کہ وہ رنگ اگر پہنا جائے تو بہت اچھا لگے گا کہ پھر انسان اس رنگ کو
خریدنے اور پہننے پر مجبور ہو جائے۔ اس طرح وہ سارے شوخ رنگ جو
میں نہیں پہنتی تھی ممتاز شیریں نے پہنوا کر چھوڑے! آج جب الماری
کھولتی ہوں تو ان کے سب پسندیدہ رنگ مسکراتے ہیں اور میرے پسندیدہ
ہلکے رنگ۔ سرمئی رنگ۔ زرد رنگ۔ نیلا رنگ وہ خود پہننے لگیں۔
ایک نہیں کئی کئی گہرے ساریاں انہوں نے خرید لیں۔ میں نے ایک
دن کہا کہ "لیجئے آپ میرے رنگ لے رہی ہیں اور اپنے رنگ مجھے پہنوا
رہی ہیں" کہنے لگیں "آپ کو پہنے دیکھ کر ہمیں بھی یہ رنگ اچھا لگا ہمارا
بھی پہننے کو جی چاہا۔"

ممتاز شیریں کو شوخ رنگوں - زیوروں - آرائش کی چیزوں نئی اور خوبصورت چیزوں کا شوق تھا اور میری بیٹی کو ان کی یہ سب باتیں اتنی پسند تھیں کہ اس نے انہیں آئیڈیل بنا لیا وہ ہمیشہ مجھ سے کہتی "آنٹی اتنی اچھی لگتی ہیں - امی آپ بھی آنٹی کی طرح رہا کریں - اسی طرح میک اپ کیا کریں - زیور پہنا کریں۔"

میں اس سے کہتی کہ "تم بڑی ہو جاؤ پھر تم آنٹی کی طرح رہا کرنا۔"

میری بیٹی ممتاز شیریں سے میری شکایتیں بھی کرنے لگی تھی دیکھئے آنٹی ہماری امی کو لمبے ناخنوں سے گھِن آتی ہے وہ ناخن نہیں بڑھانے دیتیں میں کہتی دیکھئے بچے صاف بھی تو نہیں کر سکتے پھر اسکول میں ناخن کٹے ہی جانے چاہئیں - وہ سمجھاتیں " ہاں یہ تو ٹھیک ہے بڑی ہو جاؤ پھر بڑھانا

میری بیٹی ان سے فریاد کرتی " آنٹی میرا سوئمنگ کو اتنا جی چاہتا ہے مگر امی اور ابو کلب کے ممبر نہیں بنتے " وہ کہتیں "بھئی اسے سوئمنگ کرا دیا کیجئے" میں جواب دیتی " یہ اپنی عمر سے لمبی ہے اب سوئمنگ COSTUME پہن کر پول میں اترے کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

ممتاز شیریں ہنس کر بولیں -" ارے ابھی تو بہت چھوٹی ہے دس برس کی بچی ہے آپ اسے لمبے ہونے کی سزا کیوں دے رہی ہیں پھر کہا نظریات اور خیالات کے لحاظ سے اتنی ترقی پسند اور عمل کے لحاظ سے اتنی روایات پسند آخر یہ دونوں انتہائیں آپ کے اندر کیسے جمع ہو گئی ہیں ؟ "

میں بات پلٹ دیتی " دیکھئے ہم دونوں میں سے کلب جانے کی فرصت کسے ہے جو ممبر بنیں اور بغیر ممبر بنے سوئمنگ نہیں کرائی جا سکتی"

"ارے بھئی بچوں کی تفریح کے لئے بھی کسی نہ کسی طرح وقت نکالنا چاہئیے" اس بات پر مجھے ابو یاد آجاتے اور میں سوچتی کہ واقعی بچپن کے بعد پھر سیر و تفریح کہاں نصیب ہوتی ہے - پھر میں بیٹی سے وعدہ کرتی "اچھا اب کے گرمیوں میں ضرور ممبر بن جائیں گے پھر تم سوئمنگ کرنا۔"

ایک دفعہ ممتاز شیریں بہت خوش خوش آئیں اور بولیں اختر بہن ہم نے آپ کی ایک پچیس برس پرانی دوست ڈھونڈ نکالیں اسکول کے زمانے کی - "

میں نے حیران ہو کر کہا " اچھا - کیسے ؟"

کہنے لگیں " ایک جگہ دعوت میں ان سے تعارف ہوا انہوں نے خود ہی آپ کا ذکر کیا اور پوچھا کہ آپ انہیں جانتی ہیں تو پھر میں نے آپ کا پتہ اور فون نمبر دیدیا میں نے ان سے کہا ہے کہ آپ ہمارے گھر آئیے تو ہم ساتھ لے کر چلیں گے - شاید انہیں گھر ڈھونڈنے میں دقت ہو۔"

میں نے کہا ان کا نام کیا تھا ؟

ممتاز شیریں بولیں " مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا - مگر وہ آپ کو بہت زیادہ جانتی ہیں آپ کی پچیس برس پرانی تصویر کھینچ دی - ناگپور میں آپ کے گھر روز جاتی تھیں۔"

میں نے کہا " پھر وہ میری بہن کی دوست ہوگی - کیونکہ میری تو ایک دو سہیلیاں تھیں میں تو بچپن سے تنہائی پسند رہی ہوں ہاں میری بہن کی بہت سہیلیاں تھیں اور ہر روز اس کی سہیلیاں گھر آیا کرتی تھیں۔"

ممتاز شیریں نے اس کا حلیہ بیان کیا تو میں اسے پہچان گئی - پھر جب ممتاز شیریں سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا " وہ میری بہن کی کلاس فیلو ہی نکلی وہ گھر ڈھونڈتی دوسرے ہی دن آگئی تھی فون بھی کیا تھا بڑی محبت کرنے والی ہے مگر جانے کیوں مل کر جتنی خوشی ہوئی اتنی ہی اداسی بھی محسوس ہوئی

ممتاز شیریں نے غور سے میری طرف دیکھا اور پوچھا " وہ کیوں ؟

میں نے کہا " نئے ملنے والے ہی اچھے ہوتے ہیں پرانے ملنے والے اتنی پرانی یادیں ساتھ لے کر آتے ہیں کہ وہ ہمارے پرانے وجود کو تلاش کرتے ہیں انہیں ہمارے ذہنی وجود سے یا ذہنی سفر سے کوئی سروکار نہیں ہوتا وہ افسوس کرتی رہی کہ آپ تو پہچانی بھی نہیں جاتی ہیں آپ کتنی بدل گئی ہیں آپ کو کیا ہو گیا ہے - ! ممتاز شیریں نے کہا " ہم یہ نہیں مانتے کہ اس بات پر آپ کا جی کڑھا ہوگا - سچ بتائیے"

میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا اور سوچا کہ ان سے سچ بات چھپانا کتنا مشکل ہے - میں نے کہا " لیجئے ہمارے میاں تو یہ بات مان گئے تھے اور ہمدردی بھی کی تھی مگر آپ بہت سچ بلواتی ہیں " کہنے لگیں " ہم بھی تو سچ بولتے ہیں۔"

میں نے کہا " تو سنئے اس سے مل کر مجھے اپنی بہن اتنی یاد آئی کہ میں تڑپ اٹھی - میری بہن کی سہیلیاں بہت تھیں ہر جگہ مل جاتی ہیں اور میں ان سب میں اس کی جھلک ڈھونڈ لاتا ہوں - مگر اب میں ان دکھوں اور سرابوں سے خود کو نکال چکی ہوں - اس لئے مجھے اپنا تڑپنا پسند نہیں آیا۔"

ممتاز شیریں نے محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ بولیں
"اختر بہن ہم تو کسی کو بھی یاد نہیں کرتے۔ ہمیں تو شاہین نے اتنی محبت دی ہے کہ ہم تو سب کو بھول گئے" میں نے کہا "تو پھر یہ احسن کا قصور ہے۔ انہوں نے اتنی محبت نہیں دی کہ آپ ہم سب کو بھول جاتے۔ ابو کی سی محبت کوئی نہیں کر سکتا"
پیار سے بولیں "آپ شوہر سے باپ کی محبت آخر کیوں چاہتی ہیں"
میں نے کہا "عورت تو ماں بن کر پھر شوہر سے بھی ماں کی سی محبت کرتی ہے۔ سارے جہاں کے لوگ بیٹے لگتے ہیں"
ممتاز شیریں مسکرا کر بولیں "عورت تو ماں ہی ہوتی ہے۔ مگر سب محبتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ سب زندگی کی حقیقتیں ہیں آپ سب کو گڈمڈ کیوں کرتی ہیں" ؟
میں نے کہا "سب گڈمڈ ہو کر ایک محبت بن جاتی ہیں۔ خدا کی محبت" !
وہ مسکرانے لگیں۔ لاجواب ہو گئیں۔
میں نے شوہروں سے جس طرح سے بے پناہ محبت کرتے دو عورتوں کو دیکھا ہے اس کی مثال کم ملے گی۔ ایک صفیہ اختر اور دوسری ممتاز شیریں۔ صفیہ اختر کی محبت ایک درد بھرا شکوہ بھی تھی۔ مگر ممتاز شیریں کی محبت خوشی اور آسودگی کا اظہار تھی۔ دونوں میں یہ بات مشترک تھی کہ دونوں اپنے میاؤں کی ہر چیز، ہر انداز ہر بات پر جان دیتی تھیں۔ شوہر کی تعریف کرنا کچھ اپنی تعریف کرنا لگتا ہے اس لئے تعریف کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا مگر ان دونوں کی چاہت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ان کا محبوب موضوع اکثر ان کے شوہر ہوتے تھے۔ بیماری کے دنوں میں ممتاز شیریں شاید یہ محسوس کرتی تھیں کہ وہ اب شاہین بھائی کو چھوڑ کر جانے والی ہیں اس لئے وہ ان کی محبت اور چاہت ان کی پریشانی، ان کی دلجوئی ہر بات کا ذکر کرتیں ایک دن مجھ سے پوچھنے لگیں آپ کی کہانیوں کا کسی نے پوسٹ مارٹم بھی کیا ہے
میں نے کہا "نہیں پوسٹ مارٹم کی بات ہی کیا ہے کہانی تو بس کہانی ہوتی ہے"
ہنس پڑیں۔ کہنے لگیں۔ ہماری کہانیوں کا پوسٹ مارٹم کرنے کی تو بہت کوشش کی گئی۔ پھر ہنس کر بولیں کہ میری کہانیوں میں GREENISH GRAY EYES کا بہت ذکر ہے۔ لکھتے ہوئے یہ پتہ ہے نہ جانے کیوں شاہین کی آنکھیں ہمیشہ میرے سامنے آجاتی تھیں"

ان کی بات سن کر میں نے سوچا کہ شاہین بھائی کی آنکھوں میں ایسی تو کوئی خاص بات نہیں ہے پھر میں نے سوچا کہ جانے ممتاز شیریں نے جوانی اور لڑکپن کی کس سرحد میں وہ کہانیاں لکھی ہوں گی !
ممتاز شیریں کو اجنتا اور ایلورا کے نقش و نگار بہت پسند تھے وہ جسم قوسوں اور زاویوں والے دیوی اور دیوتا۔ وہ ان کا تذکرہ کرتیں۔ افسوس میں نے اجنتا کے وہ نقش و نگار نہیں دیکھے تھے۔ کہانیوں میں ہی پڑھے ہیں۔ میں نے ان سے ایک دن کہا "آپ جسم پر غور کرتی ہیں میں تو کبھی جسم یا لباس پر غور نہیں کرتی میں تو صرف آنکھیں دیکھتی ہوں"۔
کہنے لگیں "اچھا صرف آنکھیں دیکھتی ہیں" میں نے کہا "ہاں آنکھیں ہی تو روح کے دروازے ہیں۔ جسم میں کیا رکھا ہے"
میں نے کہا "مجھے تو جیتے جاگتے انسانوں میں بھی روحیں ہی نظر آتی ہیں"۔
کہنے لگیں "مگر روح بھی تو جسم میں ہی رہتی ہے اور اس لئے جسم کا بھی حق ہوتا ہے۔ اس کی بھی پرواہ کرنی چاہیے اور سنگھار بھی" میں نے حیران ہو کر انہیں دیکھا اور سوچا کہ تو وہ جسم کی پروا اور سنگھار بھی روح کی خاطر کرتی ہیں۔ جس زمانے میں وہ بہت بیمار تھیں اس زمانے میں بھی سنگھار ضرور کرتی تھیں اکثر کہتیں "اب شام ہونے والی ہے شاہین آتے ہوں گے میں ذرا سا ٹھیک ہو جاتی تو اچھا تھا"
میں اکثر کہتی "آپ میک اپ کے بغیر بھی زیادہ اچھی لگتی ہیں کم از کم بیماری میں میک اپ نہ کیا کیجئے"
"نہیں ذرا سا ٹھیک ہو کر انسان خود کو بھی اچھا لگتا ہے پھر یہ ہسپتال کا ماحول" پھر وہ میرے سہارے بیٹھ جاتیں میں اکثر ان کے سر میں خود برش کرتی کبھی طبیعت ٹھیک ہوتی تو خود اپنے ہاتھ سے برش کرتیں پھر میں ان کا پرس کھول کر آگے کر دیتی فیس بورڈ کی ڈبیا۔ ان کے آگے بڑھاتی وہ ہلکے ہلکے پف لگاتیں۔ پھر لپ اسٹک۔ وہ ہمیشہ بہت گہری لپ اسٹک استعمال کرتی تھیں پھر کاجل۔ ! پھر میں سب چیزیں بند کر کے رکھ دیتی وہ تکیے کے سہارے سر رکھ لیتیں اور مسکراتیں۔ پھر کبھی کبھی مجھے ایسے لگتا کہ وہ میک اپ کی تہوں میں اپنے چہرے کی زردی۔ بیماری اور اپنے دل کا درد چھپاتی ہیں تاکہ شاہین بھائی آکر انہیں صحت مند اور خوش دیکھیں۔
ایک دن گئی تو بولیں "آج داہ سے میری استاد آئی تھیں۔ کاش آپ

زرا دیر پہلے آتیں تو آپ کو ان سے ملواتی۔ انہوں نے عرصہ بعد میرے کنوارپن کا نام لے کر پکارا تھا "جیسے میں کوئی لڑکی ہوں اور آپ کی طرح وہ بھی یہی کہتی ہیں کہ تم میک اپ کے بغیر بھی اچھی لگتی ہو۔" وہ بنگلور کی باتیں یاد کرتی رہیں۔ کالج کا زمانہ۔ بنگلور کی اتنی خوبصورت یادیں۔ منظر۔! انہیں اس روز ماضی کا وہ دور بہت تڑپ کر یاد آرہا تھا۔ میں نے کہا قدرتی مناظر بھوپال کے بھی بہت خوبصورت تھے۔ کاش آپ نے ہمارا بھوپال دیکھا ہوتا۔!

وہ بہت محبت سے بولیں "بھوپال تو نہیں دیکھا مگر خدا کا شکر ہے بھوپال والے دیکھ لئے۔" پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولیں احسن صاحب کے ترکی جانے کا کیا ہوا" میں نے کہا اب تو کوئی اور جا رہا ہے۔"

کہنے لگیں "ہمیں تو توقع تھی کہ آپ ضرور جائیں گی۔"

"خیر پھر کبھی سہی۔۔!"

ایک زمانے میں جب احسن کے ترکی جانے کی کچھ توقع ہوئی تو وہ مجھے ترکی کی بہت باتیں سنایا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ آپ وہ سب جگہ جگہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔ مجھے بھی ترکی سے بچپن سے جذباتی سا لگاؤ رہا ہے۔ میں ان سے وہاں کی باتیں سن کر خوش ہوتی تھی۔ لڑکوں کو وہ بہت ہی محبت اور عزت سے یاد کرتی تھیں اور ان کے کردار کی خاص طور مداح تھیں۔ "جتنے سیدھے اور سچے مسلمان وہاں ہیں اور جگہ شائد کم ہوں گے۔" بیماری کے دنوں میں وہ بستر پر لیٹے لیٹے ان سب خوبصورت جگہوں کو یاد کیا کرتی تھیں جہاں جہاں وہ گئی تھیں۔ یورپ کی سیر کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے انہیں بہت یاد آتے بتاتیں کہ کون کون سی جگہیں ہم نے اکٹھی دیکھی تھیں یونان کی اس پہاڑی کا تذکرہ کرتیں جہاں ہومر نظمیں گاتا تھا۔!

ایک دن وہ مجھے اور طارق کو اپنے بیٹوں کے خطوط کے کچھ خوبصورت جملے سناتی رہیں۔ جس طرح حافظ کی کتاب پر پسند کے شعر لکھے جاتے ہیں ایسے ہی ان کے حافظے کی کتاب پر بیٹوں کے خطوط کے سب خوبصورت جملے لکھے ہوئے تھے۔ لیٹے لیٹے وہ سب پڑھتی رہتی ہوں گی۔۔!

وہ خط خاص طور پر یاد کرتی تھیں جو انہیں ان کے بیٹوں نے اس زمانے میں لکھے تھے۔ جب وہ بنکاک کے اسپتال میں تھیں اور ایک ننھی سی جان دنیا میں آتے آتے رہ گئی تھی۔ ان دنوں کی یاد ان کی کہانی "کفارہ" ہے۔

میں جب انہیں یقین دلاتی کہ آپ کے بیٹے آپ کو بالکل صحت مند دیکھیں گے۔ انشاء اللہ آپ بہت جلدی اچھی ہو جائیں گی تو بے یقینی سے مسکرا کر کہتیں "اچھا۔ آپ ایسا سوچتی ہیں" انہوں نے کئی بار یہ بات کی کہ اپنی بیماری سے زیادہ تکلیف انہیں اس بات کی ہے کہ بیٹا آکر اس حالت میں دیکھے گا تو اسے کتنا رنج ہوگا۔" میں اپنے بیٹوں کو تو بالکل صحت مند اور تندرست یاد ہوں۔ جب دوڑ کر ان کے ساتھ پہاڑیاں چڑھتی تھی مجھے یہ خیال ہی پریشان کرتا ہے کہ وہ مجھے اس حالت میں دیکھیں۔ اتنا بیمار۔ معذور۔ وہ تو میرا اس حال میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔

انھوں نے ہسپتال جانے سے پہلے خوش ہو کر مجھے اخروٹ کی مہریات دکھائی تھیں۔ جو اپنے بیٹوں کے لئے بنوائی تھیں۔ پلنگ پوش دکھائے تھے یہ میرے بیٹے اور بہو کے لئے ہیں۔ میں نے کہا "آپ کہتی ہیں قد لمبے ہیں اس لحاظ سے ذرا اور بڑے ہوتے تو اچھا تھا۔"

کہنے لگیں "میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی کہ چھوٹے بنے ہیں ذرا اور بڑے ہوتے مگر اب تو بن گئے۔"

ان کی آنکھوں میں بلا کا درد اور انتظار تھا۔ کاش وہ بیٹوں کو دیکھ لیتیں۔ شاہین بھائی لڑکوں کو بیماری کی اطلاع دے چکے تھے۔ مگر سرحدوں کے فاصلے میں انسان کتنا بے بس ہوتا ہے وہ بے بسی سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ہر طرح ان کو خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر بیچارے کا کوئی بس نہ چلتا تھا جب میں ہسپتال جاتی تو وہ خوش ہو کر نئی قمیض دکھاتیں۔" کتنا خوبصورت کام ہے۔ شاہین ہر روز ایک نئی قمیض لے آتے ہیں حالانکہ تو کپڑوں میں ڈھونڈیں تو پرانی مل جاتے۔ مگر ان کے پاس ڈھونڈنے کا وقت بھی کہاں ہے۔ نئی خریدنا زیادہ آسان ہے انہوں نے تین نئی قمیضیں دکھائیں۔ جو شاہین بھائی نے ان کے لئے خریدی تھیں۔

میں نے کہا بیماری کے زمانے میں یہی لباس زیادہ آرام دہ ہے ساڑھی پہننا مشکل بھی ہے اور آرام بھی نہیں ملے گا۔"

کہنے لگیں "ہاں اسی لئے اب کرتے اور پاجامے پہن رہی ہوں" اپنی بیماری کے زمانے میں انہیں شاہین بھائی کی تکلیف کا بھی بہت زیادہ خیال رہتا تھا وہ اکثر کڑھتیں کہ شاہین کو آرام نہیں ملتا ہے دفتر سے تھکے ہوئے آتے ہیں۔ پھر اتنا کام ہوتا ہے۔ میری بھاگ دوڑ الگ۔" وہ ان کی صحت

کے بارے میں فکرمند ہو جاتی تھیں۔ اکثر کہتیں شاہین کو آج کل کام بھی زیادہ ہے اس لئے رات کو وہ دیکھنے بھی دیر سے آتے ہیں۔"

میں نے ایک دن کہا کہ مجھے اس بات کا بہت احساس ہوتا ہے کہ آپ صبح کو بالکل تنہا ہوتی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ چھٹی لے لوں اور صبح سے آپ کے پاس آجایا کروں۔" وہ پیار سے سمجھاتیں "نہیں آپ پریشان نہ ہوا کریں ہسپتال کے سب لوگ بہت اچھے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں اپنے ساتھ والی مریضہ کا ذکر کرتیں کہ وہ بھی بہت اچھی ہیں۔ جی بہلا رہتا ہے ان کی بیٹی آپا کو بلا دیتی ہے کوئی چیز اٹھوانی ہو تو اسے آواز دے لیتی ہوں یا اشارے بلا لیتی ہوں" وہ اتنی ڈھارس دیتیں کہ مجھے اطمینان ہو جاتا کبھی کبھی تڑپ کر کہتیں "کاش ڈاکٹر سرفراز دو گھنٹے کے لئے گھر جانے دیں۔ میرا گھر جانے کو بہت جی چاہتا ہے۔"

وہ ڈاکٹر سرفراز کی بھی بہت تعریف کرتی تھیں کہ بہت توجہ اور محنت سے علاج کر رہے ہیں۔ شاہین کے شاگرد تھے پرانے تعلقات کا بھی خیال کرتے ہیں۔ کبھی کبھی رات کے بارہ بجے کو دیکھنے آجاتے ہیں۔ جب شاہین بلاتے ہیں چلے آتے ہیں۔ ایک دن تو کہنے لگیں کل تو شاہین اور ڈاکٹر سرفراز رات کے بارہ بجے تک باتیں کرتے رہے اور مجھے آپ بھی بہت یاد آئیں۔ اس لئے کہ تاریخی باتوں سے آپ کو بہت دلچسپی ہے۔ پھر مختصر طور پر ان کی گفتگو سنائی اور بتایا کہ ڈاکٹر سرفراز کے بزرگ میرٹھ کی بغاوت میں شامل تھے ان کے خاندان کے خطوط اور دستاویزات بھی ہیں۔ پھر مجھ سے کہنے لگیں آپ نے کہا تھا آپ ہندوستان کی آزادی کی تحریکوں کے پس منظر میں ناول لکھ رہی ہیں؟"

میں نے کہا "ہاں شروع تو کیا تھا مگر آگے ہی نہ بڑھ سکا۔ اس کے لئے بہت مواد چاہیئے۔ میں اس زمانے کے انقلابیوں کے حالات جمع کر رہی ہوں پھر میں نے کہا کہ بخت خان جہاں پہاڑیوں میں گم ہو جاتا ہے میں اپنے ناول میں اسے وہاں سے لانا چاہتی ہوں۔ مگر تاریخ خاموش ہے۔"

ممتاز شیریں نے کہا "اچھا میری طبیعت ٹھیک ہو جائے پھر ہم سب مل ڈاکٹر سرفراز کے گھر چلیں گے اور ان کے خاندانی خطوط اور دستاویزات دیکھیں گے۔ شاید ان میں آپ کو بخت خان کا سراغ مل سکے کہ پھر آگے کیا ہوا۔"
علاج کے دوران ابتدا میں ان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی وہ بہت خوش رہنے لگی تھیں اور انہیں امید ہو چکی تھی کہ وہ جلد ہی چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گی۔ اکثر پوچھتیں "آپ کا کیا خیال ہے۔ مجھے یہاں کتنے دن لگیں گے۔" میں کہتی "آپ فروری کا مہینہ یہاں گذار لیں۔ ہسپتال کا کمرہ گرم بھی ہے آپ کے گھر کے کمرے بہت زیادہ سرد ہیں۔ پھر یہاں آپ کو ہر وقت ڈاکٹر کو بلانے اور دکھانے کی آسانی ہے۔ سب کام آسانی سے ہو جاتے ہیں۔ انشاء اللہ آپ اپنے بیٹے کے آنے سے پہلے گھر آجائیں گی۔"

وہ یہ سن کر کہتیں "ہاں اسی لئے تو میں بھی گھر جانے کی ضد نہیں کرتی واقعی یہاں کمرہ بہت گرم ہے آرام دہ ہے اور پھر دوسری آسانیاں بھی ہیں پھر پوچھتیں اختر بہن آپ کو کیا لگتا ہے میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔

کب تک گھر جاؤں گی۔" میں اطمینان دلاتی انشاءاللہ مارچ کے پہلے دوسرے ہفتے تک آپ ضرور گھر آجائیں گی۔ اس زمانے میں یہ سوچا بھی نہ جا سکتا تھا کہ وہ ہسپتال سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو کر گھر آئیں گی۔ یہی لگتا تھا کہ شاید کچھ عرصہ انہیں چلنے پھرنے میں دقت ہوگی پھر چلنے پھرنے لگیں گی۔

وہ بہت صابر تھیں۔ سب تنگ دلیوں اور دل آزاریوں کو مسکرا کر پی جانے والی مگر کبھی کبھی کسی بات کو یاد کر کے ان کا جی بہت اداس بھی ہو جاتا تھا ایک دوپہر کو کہنے لگیں "اختر بہن آج کسی نے مجھے یہ بات سنائی ہے کہ میں نے ایک مضمون لکھا تھا اس میں کسی کو شکایت ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔" جن کا نام لیا میں نے ان کا نام سن کر کہا "نہیں۔ نہیں یہ بات کسی نے آپ سے ایسے ہی کہہ دی مجھ سے تو انہوں نے آپ کے متعلق کبھی ایسی بات نہیں کہی کہ آپ نے ان سے انصاف نہیں کیا۔" کہنے لگیں "شاید آپ سے نہ کہا ہو مگر جس سے کہا تھا اس نے مجھے سنایا ہے" میں انہیں سمجھانے لگی ان باتوں کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔

کہنے لگیں "۔ اختر بہن ہم نے اتنے کھلے دل سے ان لوگوں کی تعریف کی اس لئے قدرتی طور پر ان کی باتوں سے دکھ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "دیکھئے ہمارے بارے میں یہی باتیں تو وہ لوگ کہیں گے جو ہمیں جانتے نہ ہوں گے۔ دیکھا بھی نہ ہوگا۔ جو بعد میں آئیں گے جو گروہ بندیوں تعصبوں اور زمان و مکان کی قید سے بھی آزاد ہوں گے۔ جن سے صرف روحانی رشتہ ہوگا۔ ہمیں ان کے لئے ہی لکھنا چاہیئے۔ وہ انصاف کریں گے آپ تو اب اچھی ہو جائیں تو پھر کہانیاں لکھنا شروع کیجئے۔ لکھنے سے سارا بوجھ اتر جاتا ہے۔

آپ تنقید چھوڑ کر تخلیق کی طرف آئیے۔"

کہنے لگیں "اختر بہن آپ مجھے لکھنے پر اتنا اکساتی ہیں کہ مجھے کبھی کبھی یہ لگتا ہے کہ اب میں دوبارہ کہانیاں لکھنے کا موڈ بنا لوں گی۔ مگر اتنا عرصہ ہو گیا چھوڑے۔ جانے اب لکھ بھی سکوں گی یا نہیں۔؟"

"آپ ایک بار قلم اٹھائیے پھر آپ کو یہ محسوس ہو گا کہ کبھی قلم چھوڑا ہی نہ تھا۔"

"اچھا اب ضرور لکھوں گی۔ کہانی لکھوں گی۔"

پھر مجھ سے پوچھا آپ نے کوئی کہانی لکھی۔ میں نے کہا اب تو نہیں وقت ملتا مگر گذشتہ گرمیوں کی چھٹیوں میں میں نے بہت کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ سب بڑی ہیں ایک دو چھپوائی بھی ہیں۔ پوچھا ان میں سے کون سی چھپ کر آگئی ہے میں نے عنوان بتایا "کاغذی ہے پیرہن"

انہوں نے کہا "بہت خوبصورت عنوان ہے مجھے ضرور پڑھوائیے"

میں یہ سوچ کر رسالہ نہیں لے گئی کہ اس کمزوری اور بیماری میں کیا پڑھا جائے گا۔ میں نے سوچا اچھی ہو جائیں پھر دکھاؤں گی۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اسے اپنی کہانی کا عنوان بنا لیں گی اور پلاٹ کی تلاش میں اتنی دور نکل جائیں گی! ایک دن ممتاز شیریں نے بہت اداس ہو کر پوچھا۔

"اختر بہن ایک بات بتائیے۔"

"کیا۔"

اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر دکھائے "یہ داغ دھبے دور ہو سکیں گے مجھے تو یہ لگتا ہے اب یہ کبھی نہیں جائیں گے!" الرجی اور خارش کے یہ داغ ایک عرصہ سے ان کے بدن کا حصہ بن گئے تھے اور انہیں ان کا بہت احساس رہتا تھا۔ میں نے کہا جب آپ کی صحت اچھی ہو جائے گی تو یہ داغ چلے جائیں گے۔"

کہنے لگیں۔ آخر کیسے چلے جائیں گے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ کبھی نہیں جائیں گے" میں نے کہا "سنا ہے ابٹن لگانے سے داغ دھبے دور ہو جاتے ہیں۔ کہاں سے ملے گا ابٹن — اور ابٹن تو دلہنوں کے لگایا جاتا ہے" میں نے کہا "میں کہیں سے آپ کے لئے ابٹن ڈھونڈ کر لاؤں گی"

بہت خوش ہوئیں "اچھا آپ میرے لئے ابٹن ڈھونڈ کر لائیں گی"

"ہاں آپ اچھی ہو کر گھر آجائیں گی پھر میں خود آپ کے ابٹن لگاؤں گی"

وہ مسکرا کر بولیں "اچھا آپ میرے ابٹن لگائیں گی — !" مسکراتی رہیں۔ ان کی نظروں میں پیار ہی پیار تھا۔

ممتاز شیریں کو ایک عرصہ سے الرجی کی وجہ سے خارش تھی اس بیماری میں یہ تکلیف بھی بہت بڑھ گئی تھی وہ کبھی کبھی اپنے آپ کو زخمی کر لیتی تھیں۔ کبھی کبھی اپنے جسم پر پوڈر چھڑکوائیں۔ جگہ جگہ سے جلد لہولہان ہو رہی ہوتی۔ میں نے ایک دن کہا "آپ یہ ناخن کٹوا لیجئے" مگر وہ تیار نہ ہوئیں۔ کہنے لگیں پھر انگلیاں بری لگیں گی"

انتقال سے دو دن پہلے انہوں نے خاموشی سے اپنے ہاتھ شاہین بھائی کے آگے کر دیئے تھے اور ناخن کٹوائے تھے۔

ایک دن سرہانے رکھی ہوئی کتاب دکھائی اور کہا کہ بیماری میں انگریزی کے باریک حروف نہیں پڑھے جاتے۔ ایسی حالت میں اردو پڑھنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ میں نے کہا "آپ تو آرام کیا کیجئے کچھ بھی نہ پڑھیئے۔ کہنے لگیں آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟" میں نے جواب دیا کہ آج کل شبلی کی سوانح مولانا روم اور خلیفہ عبدالحکیم کی تشبیہات رومی پڑھ رہی ہوں۔ میں نے کہا آج کل میں رومی میں غرق ہوں"

کہنے لگیں "اچھا آپ رومی پڑھ رہی ہیں" میں نے کہا "ہاں رومی نے پناہ دیدی ہے حقیقت سمجھا دی ہے سب چیزوں کے مطلب اور معنی سمجھ میں آنے لگے ہیں۔ اقبال نے سچ کہا ہے ہم سب کی پناہ بس رومی کے پاس ہے وہ کہنے لگیں "اچھا پھر آپ رومی پر کچھ مجھے بھی لا کر دیجئے۔ پھر رومی کے ذکر پر ترکی کا ذکر نکل آیا اور رومی کے مزار کے متعلق سنانے لگیں۔

ایک دوپہر کو میں اور طارق ان کے پاس بیٹھے تھے۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی ممتاز شیریں غنودگی کے عالم میں لیٹی تھیں طارق خاموش بیٹھا تھا۔ ممتاز شیریں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا پھر پوچھا کہ باہر کیا دیکھ رہی ہیں؟"

میں نے کہا "میں یہ سوچ رہی ہوں کہ جب اپنی بیٹی کے ساتھ ہسپتال رہی تھی تو میری بیٹی سارے دن تصویریں بناتی تھی اور ان دنوں بہار کا موسم تھا اور یہ نظارہ بہت خوبصورت لگتا تھا مگر اب بھی اچھا لگ رہا ہے بہار کی طرح خزاں بھی خوبصورت ہوتی ہے۔"

"اچھا۔ پھر میں بھی دیکھوں گی" طارق نے انہیں سہارا دیکر بٹھایا

وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہیں پھر بولیں آپ نے کتنی اچھی بات کہی تھی کہ "خزاں بھی خوبصورت ہوتی ہے۔"

پھر کہا "اچھا اب لٹا دیجئے۔" میں نے ان کا سر تکیہ پر رکھ دیا وہ مسکراتی رہیں۔ ! پھر کہا "اختر بہن باتیں کیجئے۔" میں دیر تک باتیں کرتی رہی وہ سنتی رہی اکثر ان کے کہنے پر میں بے مقصد ہی باتیں شروع کر دیتی وہ خوش ہو کر سنا کرتیں۔ اشارے سے کبھی کبھار کہہ دیتیں کہ وہ سن رہی ہیں میں بولتی رہوں۔ ! کبھی کبھی تو وہ بہت اچھی طرح باتیں کرتی تھیں اور کبھی خاموش ہو جاتی تھیں۔ میں ان پر چھوٹی بہن کی طرح حق بھی جتاتی تھی اور ضد بھی کرتی تھی زبردستی کھانا کھلاتی۔ میری ضد پر وہ ہارلیکس پی لیتیں۔ کھانا کھا لیتیں۔ ننھے ننھے نوالے بچوں کی طرح کے بنا کر دیتی وہ بھی ان کے لئے نگلنے مشکل ہو جاتے۔ سوپ پی لیتیں۔ کھانا تقریباً چھوٹ ہی گیا تھا۔" کہتیں "شاہین آتے ہیں تو میں انہیں بتاتی ہوں کہ اختر بہن نے کھانا کھلایا تھا تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔" کبھی میں کھانا آنے سے پہلے آجاتی تو پھر شاہین بھائی ہی کھانا کھلاتے ہیں ان سے کہتی کہ کھانا چھوڑنے سے آپ کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔"

وہ مجبوری ظاہر کرتیں "اختر بہن بالکل نہیں نگلا جاتا۔ شاہین بھی بہت زبردستی کھلانے کی کوشش کرتے ہیں مگر میں کیا کروں نہیں کھایا جاتا۔" ایک بار کھچڑی پکوا کر شاہین بھائی نے گھر سے بھجوائی وہ سارے دن رکھی رہی بڑی مشکل سے انہوں نے دو تین نوالے لئے۔ ان کے گھر سے سوپ جو آتا تھا وہ خوش ہو کر پی لیا کرتی تھیں۔ یا پھر کینو اور مالٹے وغیرہ خوشی سے کھا لیتی تھیں آخر عمر میں کھانا بالکل ہی چھوٹ گیا تھا۔ برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ کہتیں "کچھ نگلا نہیں جاتا۔" دوا بھی مشکل سے نگلی جاتی تھی ہر ایک گولی حلق سے اتارنے کے لئے انہیں محنت کرنی پڑتی تھی بار بار مشکل سے پانی کے گھونٹ لیتیں۔ اس حالت میں انہیں دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ شاہین بھائی کا حال اور بے بسی بھی نہیں دیکھی جاتی تھی۔ ان کی ساری دوڑ بھاگ اور تیمارداری کوئی چیز بھی کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی یہ لگتا تھا کہ بیماری کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ بس ان کی یہی کوشش رہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ ممتاز شیریں کو خوشی دی جا سکے انہوں نے کوئی کسر بھی نہ اٹھا رکھی تھی۔ ! اور ممتاز شیریں کو اپنے شوہر کی جانثاری اور محبت کے اعتماد نے ایک عجیب قوت دیدی تھی۔ ! اس قوت کے بل

پر وہ مسکرا کر سب تکلیفیں جھیل سکتی تھیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر دل بہت بوجھل ہو جاتا تھا۔ خیال آتا تھا کہ گھنٹے یا دو گھنٹے پاس بیٹھ کر بھی ان کی کوئی تکلیف اور دکھ بانٹا نہیں جا سکتا۔ بس جاتے وقت ایک عجیب سی خلش ساتھ جاتی تھی کہ کاش کسی طرح ان کی بیماری کو بڑھنے سے روک دیا جائے۔ ! اکثر وہ اس طرح سنبھالا لیتیں کہ لگتا بس اب اچھی ہونے والی ہیں۔

ایک دن کہنے لگیں "اختر بہن آپ کے آنے سے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ اب تو کتاب بالکل نہیں پڑھی جاتی۔ اور خالی وقت میں ہسپتال کے اس ماحول میں اب جی گھبرانے لگا ہے۔ کبھی کبھی نثار عزیز دیکھنے آجاتی ہیں۔ نظیر صدیقی بھی اکثر آتے ہیں اور بہت سے ملنے والوں کے نام بتائے کہ یہ سب لوگ آتے رہتے ہیں تو میرا جی بہل جاتا ہے۔" اس روز انہوں نے بہت ہی محبت سے ہاتھ پکڑا، اور پھر اپنے پاس پلنگ پر بیٹھنے کو کہا میں ان کی پائتی بیٹھ گئی۔ مجھے جانے کیوں اس روز یہ احساس ہوا کہ وہ اب اپنی بیماری سے مایوس ہو چلی ہیں میں انہیں سمجھانے لگی کہ آپ بہت جلدی اچھی ہو جائیں گی وہ مسکرانے لگیں شائد انہیں احساس ہو چلا تھا کہ وہ بہت جلد سب کو چھوڑ کر جانے والی ہیں۔ انہوں نے میرے بیٹے سے اس کے امتحان کا بھی پوچھا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں وہ جب طارق کی شکل دیکھتی تھیں ان کی نظروں میں ممتا امنڈ آتی تھی اور اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوتا تھا کہ انہیں اپنے بیٹے بہت یاد آتے ہیں۔ ایک دن کہا "اختر بہن آپ نے کوئی بالکل سچی کہانی بھی لکھی ہے۔" میں نے کہا کہانی تو جھوٹ سچ کی آمیزش سے بنتی ہے۔ حقیقت اور مجاز مگر ایک دن یہ دریافت ہوتا ہے کہ حقیقت اور مجاز ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ان میں کوئی بھی فرق نہیں ہے۔ لیکن سچی کہانی اگر لکھی جائے تو وہ خاکہ بن جائے۔"

پوچھا "آپ نے کوئی خاکہ لکھا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں صفیہ آپا اور کرشن جی کے خاکے لکھے ہیں۔ ایک تو چھپ گیا دوسرا کرشن چندر نمبر کے لئے لکھا تھا مگر پھر ۱۹۶۵ء میں جنگ چھڑ گئی تو وہ چھپ نہ سکی یونہی رکھا ہے۔"

پھر اور کوئی خاکہ نہیں لکھا" میں نے کہا صفیہ آپا استاد تھیں انہیں

قریب سے دیکھا تھا اور جب فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی کرشن جی کے راکھی باندھی تھی انہیں بھی قریب سے دیکھنے کے بہت موقعے ملے خاکے انہیں کے لکھے جاتے ہیں۔ جنہیں قریب سے دیکھا ہو۔ اب اپنی دوسری کتاب میں یہ خاکے شامل کروں گی۔ کہنے لگیں آپ نے پہلی کتاب تو اب چھپوائی ہے دوسری جانے کب چھپے گی؟ پھر بتانے لگیں کہ ان کی بھی بہت چیزیں چھپنے کے لئے رکھی ہیں۔ خاص کر انگریزی ترجمہ جو انہوں نے اپنی کہانیوں کا خود کیا تھا۔ اسے چھپوانے کی آرزو مند تھیں۔ میں نے وہ ترجمہ بھی پڑھا تھا۔ ممتاز شیریں انگریزی نثر بھی بہت خوبصورت لکھتی تھیں اور پھر کیونکہ خود ان کا کیا ہوا ترجمہ ہے اس لئے ترجمہ نہیں تخلیق ہی معلوم ہوتا ہے کاش وہ سب چیزیں جو وہ شائع کرانا چاہتی تھیں اب چھپ جائیں۔

ایک شام کوئی تو کہنے لگیں "آج نثار عزیز کا سہارا لے کر چلی تھی۔ نثار آئی تھیں۔"

میں نے کہا "آپ کا چلنے کو جی چاہتا ہے تو آپ میرے سہارے چل لیا کیجئے۔" کہنے لگیں۔ "بہن آپ کا سہارا لیتے ہوئے یہ ڈر لگتا ہے کہ آپ کو گرا نہ دوں ۔۔! آپ تو خود ہی کمزور ہیں۔"

میں نے کہا "ارے بہن ایسی کمزور تو ہوں نہیں کہ گر پڑوں گی۔" اس تمام مدت میں وہ ذرا سا ایک دن ہی چلی تھیں۔ پھر ڈاکٹر نے منع کر دیا کیونکہ کمزوری کی وجہ سے گرنے کا ڈر رہتا تھا۔ دوپہر کو اکثر غافل سو رہی ہوتیں میں جاتی تو خاموش بیٹھی رہتی۔ جب ان کی آنکھ کھلتی اور مجھے بیٹھا ہوا دیکھتیں تو بہت خوش ہو جاتیں "ارے آپ بیٹھی ہیں۔ کب آئیں مجھے جگا لیا ہوتا۔"

اکثر انہیں خاموش دیکھ کر میں خود خاموش ہو جاتی تو اشارہ کرتیں کہ میں باتیں کروں۔ میں جانے کیا کیا بولتی رہتی وہ خوشی سے سنتی رہتیں مسکراتی رہتیں ایسا لگتا ایک ایک لفظ بہت غور سے سن رہی ہیں۔ کبھی کبھی میرا دل درد سے بھر جاتا ان کی آنکھوں میں اتنا درد اور انتظار ہوتا تھا میں دعا کرتی کہ ان کا بیٹا خیریت سے آجائے۔ وہ دیکھ لیں۔! کاش دونوں بیٹے کسی طرح آسکتے! کبھی میں اٹھ کر آنے کا ارادہ کرتی تو اشارہ کرتیں کہ تھوڑی دیر اور بیٹھئے۔ پھر میں بیٹھ جاتی اور شاہین بھائی کے آنے تک ان کے پاس بیٹھی رہتی۔

ہر دیکھنے اور ملنے والے کا بہت پیار سے شکریہ ادا کرتیں۔ کچھ لوگ میرے سامنے بھی آتے۔ ان کے پرانے ملنے والے عزیز و اقارب ایک بار خوش ہو کر بتایا میں نے اپنی پسند سے وہ لڑکی اپنے بھتیجے کے لئے چنی تھی۔ ایک ملنے والی کے متعلق بتایا اختر بہن یہ میری کالج کے زمانے کی ساتھی ہیں۔ پھر ان کے جانے کے بعد بھی بڑے پیار سے ان کا ذکر کرتی رہیں۔! ان کے پاس سب کے لئے پیار ہی پیار تھا۔ اپنے شوہر اور بچوں سے پھر انہیں کتنی محبت ہوگی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ایک دن اپنے بیٹوں کی منگنی کا تذکرہ کرتی رہیں۔ ہسپتال آنے سے پہلے بھی انہوں نے مجھے کئی بار اپنے بیٹوں کی منگیتروں کے بارے میں بتایا تھا ایک کے تو بالکل یونانی نقش ہیں۔ دوسری بھی بہت اچھی ہے پڑھی لکھی لڑکیاں ہیں اچھے خاندان کی ہیں پھر ہنس کر بولیں میں اکثر یہ سوچا کرتی تھی کہ ان کے لئے لڑکیاں تلاش کرنی پڑیں گی۔ بڑی بتانا ہوگی یہ سب چیزیں بہت مشکل لگتی تھیں ان لوگوں نے میرا کام آسان کر دیا۔ اب مجھے کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔!

ان کی آواز میں درد کی ہلکی سی کسک بھی تھی اور خوشی بھی تھی انہیں اس بات کی بہت مسرت تھی کہ دونوں بیٹوں نے اپنی اپنی پسند سے اپنا شریک زندگی کا انتخاب کیا ہے۔ مگر ان کا یہ بھی جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ان کی شادیاں کریں اور وہ ہسپتال میں لیٹے لیٹے اکثر ان سب باتوں کے متعلق سوچا کرتی تھیں وہ بیٹوں کو اس قدر تڑپ کر یاد کرتیں کہ ان کے پاس سے آنے کے بعد مجھے بھی اکثر ان کے بیٹوں کا خیال آتا میں سوچتی شاہین بھائی کو سب کچھ لکھ دینا چاہئے۔ اتنی محبت کرنے والی ماں کے بیٹے بھی اس سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں۔ پھر انہیں ہمیشہ ماں کی خدمت نہ کر سکنے اور اس کے پاس نہ رہ سکنے کا غم رہے گا۔ ایک شام شاہین بھائی آئے اور ہم دونوں سے پوچھا کہ بیٹے کو یہ سب لکھ دینا مناسب ہے یا نہیں ہم نے کہا اب تو کچھ نہیں چھپانا چاہئے سب کچھ لکھ دینا چاہئے جو کچھ بھی ہے انہیں جان لینا چاہئے۔ افسوس کہ یہ سب اطلاع وہاں پہنچتے پہنچتے بھی بہت دیر ہو گئی۔ یہ بات چھپاتی تھیں کہ انہیں بیٹے اس قدر یاد آتے ہیں۔ کہتیں اگر شاہین کے سامنے بچوں کا ذکر کروں گی تو وہ بھی اور زیادہ اداس ہوں گے وہ اب اتنے پریشان اور غمگین ہیں میں ان سے یہ باتیں

کر کے انہیں اور دُکھ دینا نہیں چاہتی وہ بیچارے کیا کر سکتے ہیں اتنی دُور سے وہ اتنی جلدی آ بھی تو نہیں سکتے ۔ ! میں انہیں ہر بار یقین دلاتی کہ وہ انہیں جلد دیکھ سکیں گے اور اچھی ہو جائیں گی میری بات پر وہ مسکرا دیتیں ۔ شائد انہیں اب معلوم ہو چکا تھا کہ وہ خود سفر شروع کرنے والی ہیں ۔

ہسپتال میں جب سے دوسرا بیڈ خالی ہو گیا تھا شاہین بھائی وہیں رہنے لگے تھے ۔ شاہین بھائی دن رات ان کی تیمارداری میں مصروف رہتے تھے بے بسی اور غم کا احساس بھلا کر وہ خوش رکھنے کی ہر کوشش کر رہے تھے ۔ مگر ان کی ہنسی مصنوعی سی لگتی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ شاہین بھائی بھی اب کچھ چھپا رہے ہیں جانے ڈاکٹر نے انہیں کیا بتا دیا ہے جو وہ دوسروں کو نہیں بتاتے ۔

آخری دن جب گئی تو وہ بہت غافل تھیں ۔ گلوکوز چڑھا ہوا تھا بار بار سو جاتی تھیں ۔ شاہین بھائی اداس اور پریشان ایک طرف بیٹھے تھے مجھے دیکھ کر پھیکی سی مسکراہٹ لانے کی کوشش کی " آیئے اختر بہن " مگر اس روز انہیں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب شائد وہ ہمت ہار چکے ہیں ۔ ! شاہین بھائی جب سے ہسپتال میں رہ رہے تھے ۔ ایک طرح کا اطمینان ہو گیا تھا ۔ مگر اس روز میرا بہت ہی جی گھبرایا ۔ !

شاہین بھائی نے کمرے سے باہر آ کر مجھے بتایا کہ دو دن میں بہت سے ٹیسٹ ہوئے ہیں ۔ کل سب کا رزلٹ آ جائے گا تو پھر پتہ چلے گا ۔ مگر صاف لگ رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں ۔ شائد اپنی پریشانی چھپا رہے تھے ۔ مجھے پریشان کرنا نہیں چاہتے تھے ۔ کہنے لگے ۔

" اختر بہن یہ بار بار سو جاتی ہیں ۔ بس سوئی رہتی ہیں "

میں نے امید اور ڈھارس کے لفظ ڈھونڈنے چاہے مگر اس روز میری زبان خاموش سی ہو گئی ۔ میں دوبارہ اندر آ کر ممتاز شیریں کے پاس بیٹھ گئی ۔ پھر ممتاز شیریں نے سوتے سوتے اپنی آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھا ایک ہاتھ میں ڈرپ تھی دوسرا ہاتھ اٹھایا میں ان کا ہاتھ پکڑ کر خاموش کھڑی رہی جانے کیوں میرا ان سے لپٹ کر رونے کو جی چاہا مگر پھر بھی مسکرانے لگی !

بہت اٹک اٹک کر مشکل سے انہوں نے کہا " شکریہ ۔ شکریہ ۔ آنے کا ۔۔ آنے کا " ان کی آنکھیں دکھ اور تکلیف میں بھی مسکرانے کی کوشش کرنے لگیں مگر ان آنکھوں میں بلا کا درد تھا ۔ خاموش انتظار جو سوہان رُوح بنتا جا رہا تھا ۔ !

میں نے ان سے کہا " کل میری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اس لئے میں نہ آ سکی "

کہنے لگیں " آپ کی طبیعت تو کافی دن سے خراب ہے ۔ آپ کو بارش میں آج بھی نہیں آنا چاہیئے تھا "

میں نے شاہین بھائی سے کہا کہ اگر میں نہ آ سکوں تو پھر میرا جی بہت گھبراتا ہے ۔ ؟ " پھر میں نے پوچھا آپ نے کچھ کھایا ہے ۔ کھانے کی ٹرے ایک طرف اسی طرح رکھی تھی ۔

کہنے لگیں " بالکل نہیں کھایا جاتا " ۔ شاہین بھائی نے کہا بس گلوکوز کے ذریعہ ہی طاقت پہنچائی جا رہی ہے نگل نہیں سکتی ہیں کبھی کبھی تو بہت روانی سے بول لیا کرتی تھیں اور کبھی زبان بہت رکتی تھی اور بولنے میں بھی جیسے تکلیف ہوتی تھی اس روز بہت مشکل سے بول رہی تھیں ۔ پھر مجھ سے کہا کہ ذرا آپا کو بلا دوں " میں نے باہر آپاؤں کو بلایا ۔ آپا ٹہلتے کر آ گئیں میں کمرے سے باہر نکل آئی اس روز انہیں دیکھ کر جی بہت ہی اداس ہو گیا تھا ۔ شاہین بھائی بھی پریشانی بھلا کر مجھے ڈھارس دیا کرتے تھے مگر اس روز وہ بھی بالکل خاموش تھے ۔ سیڑھیوں تک میرے اور طارق کے ساتھ آئے تو پھر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا میں نے کہا " یہ سب کیا ہو رہا ہے ۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا "

پھر میں نے اپنا چہرہ موڑ لیا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اتر آئی میرے بیٹے نے میرا ہاتھ پکڑ لیا آہستہ سے بولا " امی آپ روز شاہین صاحب سے اچھے اچھے جملے کہتی تھیں مگر آج آپ نے انہیں پریشان کر دیا اب اس طرح بات کی تو میں آپ کو ہسپتال نہیں لایا کروں گا " میں نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا کیا کروں میری ہمت آج جواب دے گئی ہے میں ان سے کیا کہتی ۔ !

دوسرے دن مجھے شدید زکام اور بخار ہو گیا احسن نے کہا اس حالت میں بارش میں بھیگی جاؤ گی ٹیکسی نہ ملی تو بخار بڑھ جائے گا "

میں نے کہا کوٹ پہن کر چلی جاتی ہوں "

احسن نے کہا تمہارے جانے سے فائدہ کیا ہو سکتا ہے شاہین صاحب

اب وہاں موجود ہیں کوئی بھی کیا کر سکتا ہے۔ آج مت جاؤ۔ طارق نے کہا آپ کو اتنا زکام ہے آپ انہیں زکام لگا دیں گی وہ ویسے ہی کمزور ہیں" طارق کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں نے کہا ہاں زکام کے جراثیم لے کر جانا مناسب نہیں ہے۔ زکام لگ گیا تو اور مشکل ہو گی"

اس روز میں نہیں گئی۔ میرا بہت جی تڑپا مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ممتاز شیریں روٹھ جائیں گی۔ میں نے احسن سے کہا آپ فون پر ہی خیریت معلوم کریں۔ انہوں نے دوبارہ فون کیا۔ مگر بجلی کی خرابی سے لائن کٹ گئی۔ ممتاز شیریں کی خیریت ٹھیک سے معلوم نہ ہو سکی۔

اس روز میرا جی بہت پریشان رہا۔ حسب معمول رات کو بارہ بجے تک ریڈیو پر موسیقی سنتی رہی کان تو آواز سن رہے تھے مگر ذہن بہت دور تھا۔!

میں لیٹے لیٹے دعائیں مانگنے لگی کہ ممتاز شیریں کا بیٹا خیریت سے جلدی آ جائے وہ ایک بیٹے کو ہی دیکھ لیں ان کی آنکھوں کا درد اور انتظار میرے دل پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر یہ انتظار ان کے ساتھ گیا تو۔! اور پھر ممتاز شیریں کے بارے میں سوچتے سوچتے مجھے اپنی ماں کا خیال آ گیا میں ایک ماہ سے ان کی بیماری میں اپنی ماں کو بھی بھول سی گئی تھی۔ میرا خیال دور اس سمندر تک چلا گیا جہاں جو ہو کے ایک گھر میں میری بوڑھی ماں لیٹی ہے جو سالہا سال سے بیمار ہے میں نے سوچا ان کی آنکھوں میں بھی ایسا ہی انتظار ہو گا۔

پھر میں نے سوچا ....

نہیں میرے بھائی اور بہنیں اتنی اچھی ہیں وہ سب اسے گھیرے رہتے ہوں گے خوش رکھتے ہوں گے۔ اسے اکیلا نہ چھوڑتے ہوں گے اس روز مجھے احساس ہوا کہ میں ممتاز شیریں میں بڑی بہن کا ہی نہیں اپنی ماں کا وجود بھی ڈھونڈنے لگی تھی۔ مجھے ان کے پاس جا کر قرار آ جاتا تھا۔ میں ماں سے مل آتی تھی۔

احسن نے کہا" ارے تم اب تک جاگ رہی ہو۔ سونے کی کوشش کرو" میں نے کہا میں کیا کروں مجھے مستقل ممتاز شیریں کا ہی خیال آئے جا رہا ہے جانے وہ کیسی ہیں کاش آپ نے فون کر لیا ہوتا"

احسن نے کہا کل اتوار ہے کل میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ کل دیکھ آنا" میں نے کہا" ہاں کل تو بخار ہو یا زکام میں صبح سے جاؤں گی اور شام تک وہیں رہوں گی۔ اتوار بھی ہے"

دوسرے دن صبح صبح ادا بہن اور جعفری بھائی آئے تو میں کچھ حیران سی ہوئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں صبح سے ہسپتال جانے کا سوچ رہی تھی۔

جعفری بھائی نے کہا" آپ کے ہاں کوئی فون نہیں اٹھاتا میں نے کئی بار رنگ کیا"

میں نے کہا" ہم تو یہیں ہیں۔ گھنٹی ہی نہیں بجی شاید آپ نے غلط نمبر ملایا ہو" پھر پتہ چلا کہ وہ غلط نمبر ہی لگاتے رہے۔ کہنے لگے اچھا ہم یہ خبر دینے آئے تھے کہ آج صبح ممتاز شیریں۔۔۔۔۔ پورا جملہ نہ سنا گیا۔

پھر شاہین بھائی کا فون آ گیا" آپ ہسپتال اب نہ آیئے گا ہم انہیں گھر لا رہے ہیں"

ممتاز شیریں اخروٹ کی مسہری پر گہری اور میٹھی نیند سو رہی تھیں ان کے وجود کی مہک اگربتی کی خوشبو بن کر ماحول پر چھا رہی تھی۔

ان کی کانچ کی چوڑیاں اتار لی گئیں۔ مگر سونے کی چوڑیاں کسی نے کہا کہ اتاری نہیں جا رہی ہیں تنگ ہیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا تو ایسا لگا جیسے خود ہاتھ بڑھا رہی ہیں۔ نرم ٹھنڈا سا ہاتھ میں نے دو چوڑیاں آسانی سے اتار لیں اور ان کی ایک رشتہ دار کے ہاتھ میں دے کر کہا" یہ تو بڑی آسانی سے اتر گئیں" انہوں نے کہا نہیں کاٹ کر نکالی جائیں گی۔ مردہ کے جسم کو تکلیف ہوتی ہے"

میں نے سوچا دوست کے ہاتھ سے دوست کو تکلیف کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر خیال آیا شائد یہ کاٹ کر اتارنے کی کوئی رسم ہو گی۔ میں تو رسمیں نہ جانتی ہوں نہ مانتی ہوں۔ میں نے ان سے کہا" اچھا تو پھر آپ کاٹ کر اتار لیجئے گا"

پھر جب اخروٹ کی مسہری پر سے انہیں اٹھوا کر لکڑی کے تختے پر لٹانے کے لئے سہارا دینے لگی تو میں نے سوچا کہ وہ دلہن تو بنی رہی ہیں ڈولی بھی آ گئی ہے اور پھول بھی ہیں مگر افسوس میں ان کے ابٹن نہ لگا سکی۔ پھر جب جھک کر ان کا چہرہ دیکھا تو وہاں اتنا آرام اتنی آسودگی اتنی گہری اور میٹھی نیند تھی کہ ان کے چہرے کو ابٹن کی ضرورت بھی

ممتاز شیریں کے

آخری لمحات

نثار عزیز بٹ

اسے خوش قسمتی کہئے یا بد قسمتی - ہر فنکار اور ہر لکھنے والا اپنی ذات کے گرد طرح طرح کے حصار تعمیر کر کے اپنے آپ کو دوسروں سے اور بعض اوقات اپنی نظروں سے بھی او جھل کر لیتا ہے - اور یوں آپ اسے جانتے بھی ہیں اور بالکل نہیں جانتے - یہی عمل بڑے عرصے تک میرے اور ممتاز شیریں کے درمیان ہوتا رہا -

ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۵ء میں منٹو کی یاد میں ایک جلسے کے ذریعے کراچی میں ہوئی - مجھے یہ واقعہ یاد نہ تھا - کیونکہ کراچی کے ادبی حلقوں میں نو وارد ہونے کی وجہ سے ان دنوں میں بہت سے لوگوں سے پہلی مرتبہ ملی تھی - انہوں نے خود ہسپتال میں اپنے آخری دنوں کے دوران ہماری پہلی ملاقات کا ذکر کیا - اور پھر مجھے یاد آ گیا کہ بڑی بشاشت اور دلچسپی سے انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا "آپ کا تعلق ایران سے ہے ؟" اور میں نے کہا تھا "نہیں لیکن ہمارے گھر میں فارسی بولی جاتی ہے" اس کے بعد "وقتاً فوقتاً" ملاقات ہوتی رہی - کسی محفل میں یا ادیبوں کے کسی اجتماع میں - لیکن جو دس سال ہم نے کراچی میں گزارے اس کا بیشتر حصہ ممتاز شیریں نے بنکاک اور ترکی میں گزارا - اور اس طرح یہ ملاقاتیں بڑے وقفے سے ہوتی رہیں -

۱۹۶۷ء میں ہم راولپنڈی آ گئے - تو معلوم ہوا کہ ممد شاہین اور ممتاز شیریں اسلام آباد میں ہیں - پنڈی اسلام آباد کی غیر علمی - غیر ادبی فضا میں ان کا اور چند دوسرے رفقاء کا دم غنیمت نظر آیا - لیکن بچپن اور نوجوانی میں جس تیزی اور بے ساختگی سے دوستیاں لگ جاتی ہیں - وہ بعد میں ممکن نہیں رہتا - مہینے دو مہینے میں ایک آدھ بار ملاقات ہو جاتی - کبھی ہم چلے جاتے - کبھی وہ آ جاتے - دوستی کے سلسلے میں، میں خاص طور سے آہستہ رو ہوں - اور سمجھتی ہوں کہ دوستیاں پائیدار نہیں ہوتیں - اگر ان میں قریب آنے کی خواہش بے ساختہ اور جذباتی نہ ہو - چنانچہ دو ایک بار مجھے خیال آیا بھی - کہ ممتاز شیریں سے ذاتی سطح پر ملاقات ہونی چاہیئے اور میں نے ان سے یہ تجویز بھی پیش کی - کہ وہ کسی روز پورا دن میرے پاس آ کر گزاریں - لیکن جب وہ فارغ ہوتیں میں شہر سے باہر ہوتی - جب میں فارغ ہوتی - تو وہ مصروف ہوتیں - اور اس طرح یہ تجویز عمل میں نہ آ سکی - اس کے باوجود ہم چاروں غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے کے قریب آنے لگے - تنقیدی یا عقلی عمل کی وجہ سے نہیں وجدانی طور پر انسانی سطح پر -

ادبی رسالوں، ادبی تحریکوں اور اردو ادب کے عروج کے دور کی

ممتاز شیریں کیسی تھیں۔ یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔ کہ اس دور میں
میں ان کو نہیں جانتی تھی۔ دور دور سے میں نے ان کے مضامین پڑھے
تھے۔ اور ان کا شہرہ سنا تھا۔ بحیثیت قاری ان کی کہانیوں سے مجھے
ایک نیم شعوری شکایت یہ تھی۔ کہ ان کی زیادہ تر کہانیوں میں ایک
قدرے خام خود ستائی جھلکتی۔ ان کے تنقیدی مضامین مجھے زیادہ
پسند تھے۔ لیکن جہاں وہ اپنے بارے میں لکھتیں پھر خود ستائی
کا تاثر غالب نظر آتا۔ یوں تو خود پسندی اور خود ستائی فنکاروں
کا خاصہ ہے۔ غالب میر اور ڈاستائی جیسے فنکاروں نے بلا تامل اپنی
عظمت کا اعلان کیا ہے۔ لیکن زیادہ تر فنکار اپنی انا کو بالمقابل
کی نظروں سے اوجھل رکھتے ہیں۔ تا کہ رابطے کے عمل میں خلل نہ پڑے
ہاں کسی فنکار کی شخصیت اتنی وسیع اور گمبھیر ہو۔ کہ انانیت
کا جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ اور بالمقابل خود ہی ہتھیار ڈال اس کی
چھاؤں میں حفاظت محسوس کرنے اور سستانے بیٹھ جائے۔ تو وہ
اور بات ہے۔ بہر صورت ممتاز شیریں کے ہاں خود ستائی کا انداز
مجھے ذاتی طور پر کھلتا تھا۔ جب ہماری ملاقاتیں بڑھیں۔ تو بڑے
تعجب سے میں نے دیکھا۔ کہ ذاتی میل جول میں ان میں انانیت کا دُور
دور پتہ نہ ملتا تھا۔ گفتگو کے دوران وہ اکثر خاموشی سے مسکراتی رہتیں
بحث زیادہ گرم ہو جاتی۔ اور صمد شاہین ان سے کسی واقعے یا کسی
تفصیل کے سلسلے میں کوئی سوال پوچھتے۔ تو وہ خندہ پیشانی اور حاضر
ذہن سے جواب دیتیں۔ لیکن کسی وقت بھی اپنی ذات اپنی رائے یا اپنی
شخصیت کو حاضرین محفل پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرتیں۔ ہاں ان
کی ساڑھیاں ہمیشہ شوخ رنگ کی ہوتیں۔ گویا رنگ کے ذریعے وہ
محفل میں اپنی موجودگی کو نمایاں کرنا چاہتی ہوں۔ شاید ان کے اسی رویے
کی بنا پر چند سال بیشتر میں نے کراچی کے ادبی حلقوں میں چند لوگوں
کو یہ کہتے سنا تھا۔ کہ ممتاز شیریں خود نہیں لکھتیں بلکہ صمد شاہین ان کے
نام سے لکھتے ہیں۔ یہ بات چونکہ ہر خاتون لکھنے والی کے لئے بلا تامل
کہی جاتی ہے اس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔ مجھے پشیمانی
اس بات کی ہے کہ میں نے ان کی کہانیوں اور ان کی ذات کے موازنے
کو بر وقت محسوس نہ کیا۔ اور یوں یہ خلش ہمیشہ کے لئے میرے
میرے دل میں رہ گئی کہ جس حصار کے پیچھے وہ اپنی ذاتی اور ادبی
شخصیتوں میں تقسیم علیحدہ علیحدہ محصور رہیں۔ وہ حصار گر
جاتا۔ تو کیا ہوتا!۔ اپنی ذاتی سطح میں وہ حلیم الطبع منکسر المزاج
اور آخری حد تک بے غرض تھیں۔ جو اوصاف وہ اپنے بعض مرکزی
کرداروں کے ذریعے اپنے آپ سے منسوب کرتی تھیں۔ اور جو مجھے
شروع میں گراں گذرتے تھے۔ در اصل ان میں موجود تھے اور اس
حد تک موجود تھے کہ بالآخر ان کی ذاتی شخصیت نے نقاد اور
مصنف کو باہر دھکیل دیا۔ اور آخری چند سال وہ صرف اپنی ذاتی
حیثیت میں موجود رہیں۔ کہ کوئی بھی شخصیت متوازی تقسیم کی
زیادہ دیر متحمل نہیں ہو سکتی۔ یا اسے متضاد اوصاف کو یکجا کر کے
سلجھانا ہوتا ہے۔ یا پھر دونوں میں سے ایک جزو کا انتخاب کرنا
ہوتا ہے۔ "کفارہ" کے بعد ممتاز شیریں نے اپنی ادبی حیثیت
کے بدلے اپنی ذاتی حیثیت کو چن لیا۔ اور اس راہ پر چل نکلیں
جو بالآخر مکمل خاموشی پر ختم ہوئی۔ پہلے ادبی اور پھر ابدی!۔

کوئی چار پانچ ماہ اُدھر میں نے محسوس کیا کہ کوئی بہت ہی
گمبھیر اور خاموش کشمکش ممتاز شیریں کے اندر جاری ہے اس
خاموش کشمکش میں اتنا زور تھا کہ انہوں نے ایک لفظ بھی
مجھ سے نہیں کہا لیکن ایک اندرونی اصرار اور بے چینی مجھے اس
امر پر مجبور کرنے لگی کہ میں ان کے قریب پہنچوں۔ افسوس کہ اس
مرحلے پر بھی میں نے اپنی مخصوص آہستہ روی سے کام لیا۔ اور
جس تیزی سے ان کے قریب پہنچنا چاہیے تھا۔ اسے دخل در معقولات
سمجھ کر دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ کیا کروں؟

ایک صبح وہ ہماری ایک دوست اور میں دستکاری
کی ایک نمائش سے واپس آئے تو ان کے گھر میں ان سے تفصیلی
گفتگو ہوئی۔ ان کی تنقیدی صلاحیتیں محفوظ تھیں میں نے انہیں
کام کرنے پر اکسایا۔ میں چونکہ خود اپنے سلسلے میں تخلیقی عمل کی راہ
میں ذہنی رکاوٹوں کے مسئلے کا مطالعہ کر رہی تھی اس لئے میں نے
ان کی کہانیوں کا پلندہ اٹھایا۔ اور گھر آ کر انہیں اس خیال
سے پڑھنے لگی۔ شاید معلوم ہو سکے کہ وہ کیوں نہیں لکھ پا رہیں
اب میں سوچتی ہوں کہ ان کا کام "نوری نہ ناری" پر آ کر
رک جانا ایک اہم بات ہے۔ میگھ ملہار کے دیباچے میں وہ لکھتی ہیں

"میرے پہلے دور کے ہر افسانے میں انسانی فطرت کی نیکی پر زور دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے کے ترقی پسند ادب میں زندگی کے تاریک پہلوؤں، تلخ حقیقتوں اور برائیوں اور کجرویوں کے افسانے پڑھ پڑھ کر مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ میں انسانی فطرت کی اچھائیوں اور اثباتی قدروں کو پیش کروں۔ میری اس کوشش میں خلوص شامل تھا۔ اور شاید وہ پہلی معصومیت بھی جو گناہ کے وجود سے اگر منکر نہیں۔ تو خود بے خبر ضرور تھی۔ یا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا موسیو واٹیل اپیر نے کہا کہ میں انسانی سرشت میں شر کے وجود سے آگاہ ہونے کے باوجود اس شر کو چھوتے ہوئے ڈرتی تھی دیپک راگ میں، میں نے پہلی مرتبہ اس شر کو چھونے کی کی ہمت کی ہے۔"

گویا شر کو چھونے کی ہمت کا محرک ان کے عقلی تھا چنانچہ اسی مضمون میں آگے چل کر وہ کہتی ہیں۔

"بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کی رائے میں شر کے تصور کے بغیر کوئی گہرا ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ شر کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد مجھ میں سے آہستہ آہستہ نامکمل انسان کا وہ تصور گھر کرتا گیا۔ جو معصوم فطری انسان کے تصور سے بالاتر تصور ہے جس میں انسان خیر و شر کا مجموعہ ہے۔ اور اس کی فطرت کے ان دونوں پہلوؤں میں مسلسل اندرونی کشمکش جاری رہتی ہے۔ بڑے ادب میں انسان کا یہی تصور ہے۔ آگے چل کر یہی تصور منٹو پر میری کتاب "نوری ناری" کا مرکزی موضوع بنا۔"

تو گویا "نوری ناری" کے ذریعے وہ انسان کو خیر و شر کے مجموعے کے طور پر قبول کرنا چاہتی تھیں۔ یہ نامکمل مضامین میں نے نہیں پڑھے اس لئے مجھے معلوم نہیں کہ خیر و شر کے امتزاج کو انہوں نے کس رنگ میں لیا۔ بلکہ "میگھ ملہار" اور "دیپک راگ" کو بھی میں نے ان کی موت کے بعد غور سے پڑھا۔ انہیں معلوم تھا کہ "دیپک راگ" میں انہوں نے شر کو جس پہلو سے پیش کیا تھا۔ وہ شر کا سطحی سا پہلو تھا کیونکہ وہ نقاد بھی تھیں۔ عقلی طور پر کسی نظریے کو تسلیم کر لینا ایک بات ہے، روح کی گہرائیوں میں کسی حقیقت کو قبول کر کے اس کے ساتھ جینا

دوسری ابھی میں ان کے مضامین پڑھ ہی رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کس طرح انہیں دوبارہ لکھنے پر آمادہ کیا جائے کہ شومئی قسمت سے وہ بیمار ہو کر ہسپتال جا پڑیں۔ اور یوں جب وہ موت کے دروازے پر تھیں۔ میرا ان سے ذہنی قرب کا دور شروع ہوا۔

ہسپتال میں ان کے دو تین ماہ خود میرے لئے ایک روح فرسا تجربہ ہیں اور یہ تجربہ ابھی آنا ہے کہ میں اپنی آہستہ روی کے پیش نظر اس وقت اور فاصلے کے تناظر میں جا کر صحیح طور پر نہیں دیکھ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی محفل میں مجھے مضمون پڑھنے میں تامل ہو رہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک اندرونی اصرار بھی تھا۔ کہ میں اس تعزیتی محفل میں ان کی اس ذات کو خراج پیش کروں جس کے نیچے انہوں نے ادیب اور نقاد کو دفن کر دیا۔ اور اگرچہ اس مقبرے پر انہوں نے جو کچھ ایثار شخصیت تعمیر کی وہ آخری دنوں میں خود فن کی حدوں کو چھونے لگی تھی۔ لیکن اس طرح کا فن وہ خود محفوظ نہ کر سکی تھیں اس کے لئے کسی دوسرے فنکار کی ضرورت ہے۔

عقلی طور پر ممتاز شیریں نے انسان کو خیر و شر کا مجموعہ تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن اپنے اندر اور اپنے گرد و نواح میں وہ شر کے ساتھ کوئی خاطر خواہ سمجھوتہ نہ کر پائیں۔ اس ناکامی نے ان کے قلم کو بہت حد تک خاموش کر دیا۔ لیکن میں گواہ ہوں کہ اپنے آخری دنوں میں اپنی ذات کے اندر نہ صرف وہ شر پر بلکہ اپنی انا پر بھی مکمل فتح حاصل کر چکی تھیں۔ یہ ایک تنہا اور خاموش فتح تھی جس کا انہیں کوئی شعوری احساس نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اس کا کوئی صلہ طلب نہ کیا۔ نہ فن کی صورت میں۔ نہ تحسین دوستاں کی صورت میں نہ بقائے دوام کی صورت میں۔ ان کی موت سے ایک روز پہلے میں نے ان کے سفید ہوتے ہوئے چہرے سے خوفزدہ ہو کر زندگی کی طرف لوٹ آنے کی ایک آخری اور خام ترغیب دیتے ہوئے انہیں کہا "ابھی تو آپ کو صحت مند ہو کر اپنے موجودہ تجربے کے بارے میں لکھنا ہے" وہ بڑی نرمی سے مسکرا کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔ یہ بات سنتے ہی ان کی آنکھوں نے پردہ سا اوڑھ لیا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ اس لمحے وہ ہر قسم کی ہوس سے آزاد ہو چکی تھیں اس ہوس سے بھی جو لکھنے والے کو ہر اہم تجربے کا بیوپاری بنا دیتی ہے۔ چاہے وہ تجربہ اس کا اپنا ہو یا کسی اور کا۔۔۔۔

جتنا فرسودہ بیمار ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ وہ ایک بے پناہ اندرونی تنہائی کے لامحدود سناٹے میں ڈوبتی جا رہی ہیں۔ ایسے میں ان تک پہنچنے کی کوشش میں بے طرح ہاتھ پاؤں مارتی رہی۔ کبھی کبھار اتفاقی طور پر میں ان کے قریب پہنچ بھی گئی۔ لیکن وہاں مجھے اپنا آپ صحرا میں ایک دھبے کی طرح نظر آیا کہ ان کی اندرونی تنہائی اور میرے قرب کا کچھ بھی تناسب نہ بنتا تھا۔ ان کی یہ تنہائی شاید اس خلا سے ماخوذ تھی جس میں انھوں نے اپنے اندر کے فنکار کو دفن کیا تھا۔ صوفی فنافی اللہ ہونے کی سعی کرتا ہے تو اپنی ذات سے ماورا اختیار کی وسعت کا سامان کرتا ہے۔ فنکار اپنی انا کو فن میں گھولتا ہے۔ تو وہ بھی دراصل اپنی بقا کا جتن کرتا ہے کہ اسے طبیعی موت کے بعد زندگی کی ہوس ہے۔ ممتاز شیریں نے بھی اپنے مضامین میں اس نظریے پر بحث کی ہے کہ فن موت پر غلبہ پانے کی کوشش ہے چنانچہ جب انہوں نے اپنی پوری صلاحیتیں بروئے کار لانے سے پہلے اپنے فن کو تیاگا۔ تو انہیں معلوم تھا کہ وہ موت کے خلاف جدوجہد سے دست بردار ہو گئی ہیں۔ ایسا انہوں نے کیوں کیا؟ اس کا جواب ابھی اور تلاش کرتا ہے شاید شر کے انتقام سے مغلوب ہو گئیں یا اپنی کسوٹی پر پورا اترتے کو انہوں نے زندگی پر موت کو ترجیح دی۔ یا پھر شاید بے غرضی اور منکسر المزاجی نے انا پر آخری فتح حاصل کر لی۔ تو ان کا فنا سے مکمل سمجھوتہ ہو گیا۔

(حلقۂ ارباب ذوق کی تعزیتی محفل میں پڑھا گیا۔)

پہلی صف (دائیں سے بائیں) طفیل احمد جمالی۔ شان الحق حقی۔ مسرت تیموری۔ پروفیسر احمد علی۔ ہان سوئین (HAN SUYIN)
ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ ممتاز شیریں۔ سید محمد تقی

دوسری صف (دائیں سے بائیں) ڈاکٹر محمد شاہین۔ ابن انشاء۔ مظہر حسین۔ شوکت صدیقی۔ جمیل الدین عالی۔ مسٹر رضوی۔ جناب تمنائی۔ مشتاق احمد۔ سدر

۱

یادِ شیریں

عذرا مسعود

افسوس تو اس بات کا ہے کہ جب آتشِ جواں ہوا تو کارواں رخت سفر باندھے چلنے کو تیار تھا۔ یوں بھی منزل پر پہنچنے والا ایک مڑ کر پیچھے رہ جانے والوں کو دیکھتا یا رک کر ان کے انتظار کی زحمت گوارا کرتا ہے۔ دراصل یہ خوبی اور یہ کشش خود منزل کی ہوتی ہے جس کے حصار میں داخل ہو جانے کے بعد زیست کی ایسی راہیں اور منزل کے وہ در وا ہو جاتے ہیں، جن میں راہی بے اختیار و بلا ارادہ تنہا ہی داخل ہوتا ہے۔ مڑ کر دیکھنے میں پتھر بننے کا خطرہ اور رک کر ساتھی کا انتظار کرنے میں جنت کے در بند ہونے کا اندیشہ لاحق ہو تو تنہا ہی امان کی تلاش میں پل صراط کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ پل صراط پہ یاد آیا کہ ہم اتنے باریک بین کہاں کہ صراط مستقیم سے ادھل زندگی گزار کر بھی اس پل کی نشان دہی کر سکیں اور اتنے متوازن العمل بھی نہیں رہے کہ اپنا توازن برقرار رکھ کر اسے عبور کرنے کا ہی یارا ہو۔

خیر یہ تو حیات و ممات کے راز ہائے درون ہیں۔ میں تو ایک سفر کی داستان بیان کرنے چلی تھی۔ یہ سفر مختصر بھی ہے اور نا تمام بھی دم رخصت اس مسافر کے حالِ زار پہ کیا گزری کون جانے! میرے پاس آ رہا د رکھنے کو چند لمحوں کا ہی سرمایہ ہے جن میں جانے والی کی ہراہی کی یادیں کچھ اس طور مدغم ہیں کہ افقِ ذہن پر اکثر و بیشتر منڈلاتی رہتی ہیں۔

کہانیاں جنم لیتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں۔ افسانے تر
پاتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں۔ تصویریں بنتی ہیں اور بگڑ جاتی
میں نے ایک کہانی کو یوں بکھرتے ہوئے دیکھا کہ دل لخت
لخت ہو گیا۔ تصویر کے رنگوں کو یوں مدھم پڑتے دیکھا کہ
کا مٹنا دیکھا نہ گیا۔ میں سوچتی رہی یہ ناتواں جسم اور یہ سا
سی روح اپنے اندر کیسے کیسے گھمبیر جذبوں اور عمیق نظروں
سمیٹے ہوئے تھی۔

میں ان کی دوست تھی تو دوستی کے دائرے میں رہ کر ان
بارے میں لکھتی۔ عزیز ہوتی تو قرابت داری کا حق ادا کرتی۔ نقاد ہو
تو ان کی تنقید پر تنقید کرتی۔ لیکن میرے پاس تو صرف عقیدت
چند پھول ہیں جنہیں نچھاور کرنے کیلئے قلم کا سہارا لیا ہے۔

آج جب کہ ممتاز شیریں کو ہم سے جدا ہوئے کافی د
گزر چکے ہیں میرے دل نے بے اختیار ہو کر ان کی یاد دلائی کچھ یاد
بے اختیار و بلا ارادہ آپ کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ یادِ شیریں نے ا
تمام شیرینی کے ساتھ میرے قلب و ذہن کی گہرائیوں میں ڈو
کر عقیدت کے چراغ روشن کئے ہیں۔ فن کار عموماً اپنے فن

ے کر آپ پر شبخون مارتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی ذات ہی ایسی پُرفن ہوتی ہے کہ بلا سہارا اور بے کھٹکے نہاں خانۂ دل میں در آتی ہے۔ بس شیریں اور میرے درمیان یہی رشتہ استوار ہوا تھا۔ جو زمان و مکاں کی قید میں آجانے کے باوجود لافانی ہے۔

وہ شام بڑی سہانی تھی۔ اور بہت دنوں بعد مسعود کی طبیعت مائل ہوئی کہ کہیں ملاقات کے لئے چلا جائے۔ کسی ایسی جگہ جہاں لطف صحبت کی عمدگی بھی رہے اور تضیع اوقات بھی نہ ہو۔ بالآخر طے پایا کہ نورالحسن جعفری اور ان کی عزیزہ بھابی کو تلاش کریں۔ آنا ہیں اپنے شگوفوں کے حسن میں کھوئی ہوئی ملیں۔ اور جعفری صاحب پڑوس کے لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے پائے گئے۔ غالباً ان کا خیال ہے کہ زمرد بن سہرے کے تختے اور وہ بھی پڑوس کے بہر طور گھر کے شگفتہ شگوفوں سے زیادہ تراوٹ اور تازگی بخشتے ہیں۔ بات شگوفوں سے شروع ہوئی اور بڑھتے بڑھتے باد بہاری کی تھپکیوں سے کھلنے والے پھولوں تک جا پہنچی۔ بہار سوختہ ہوئی تو خزاں نے ڈیرے ڈالنے شروع کئے۔ ایسے میں ہی کہیں ممتاز شیریں کا ذکر آیا اور میرے سمند شوق پر تازیانے کا کام کر گیا۔ میری ان کی ملاقات بیحد مختصر رہی۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جو ایک جھلک دکھا کر بھی روپوش ہو جائیں تو ان نگاہوں کی حسرت عمر بھر بے چین رکھتی ہے۔ آج بھی دل نے بے اختیار ہو کر یہ چاہا کہ وہ چند ملاقاتیں یاد کروں، وہ لمحے دہراؤں جب ہم پہلی بار ملے، دوسری بار ملے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ملنے، رہنے کی تمنا دم توڑ گئی۔ میرے ان کے تعلق میں لڑکپن اور جوانی کے فاصلے حائل رہے تھے۔ پہلے پہل جب افسانے پڑھنے کا شوق چرایا تو خالق تمہارا ہی دل میں اتر جایا کرتا تھا۔ یہ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ لندن سے میری ایک بزرگ دوست نے لکھا،

میں آج کل اپنے پسندیدہ شعراء اور مصنفین کی تصویری البم ترتیب دے رہی ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر تم بھی میری مدد کرو اور چند تصاویر جن کی یافت تاحال ممکن نہیں ہو سکی بھجوا دو اس مضمون کے ہمراہ چند نام منسلک تھے۔ ان میں سے حجاب امتیاز علی، قرۃ العین حیدر اور ممتاز شیریں مجھے آج بھی یاد ہیں یہ میرا ممتاز شیریں سے پہلا غائبانہ تعارف تھا۔ تصویر تلاش کرتے ہوئے ان کا مشہور افسانہ "انگڑائی" ہاتھ لگا۔ اور یوں کچھ اپنی ہی تلاش میں میں انہیں پڑھنے لگی، ان کا ذکر کرنے لگی۔ میرا شوق دیکھ کر کسی نے مجھے "معیار" پڑھنے کے لئے دی اس کی ٹھوس علمیت اور مدلل نظریے مجھے اس وقت اپنی سمجھ اور تجربے سے کافی بالا محسوس ہوئے تاہم میں جو نفسیات کی طالبہ تھی، اپنے طور پر ان سے لطف اندوز ہوتی رہی اور انہیں سراہتی رہی۔ کچھ مدت بعد چند ماہ کے لئے مجھے بیرون ملک جانے کا اتفاق ہوا تو لندن میں اپنی پرانی دوست سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس کی البم دیکھی تاکہ پرانی یادیں تازہ کروں۔ اس نے ہر تصویر کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار بھی لکھ کر کیا تھا۔ کچھ شخصیت کے بارے میں، کچھ فن سے متعلق۔ دیکھ کر اور پڑھ کر بہت لطف آیا۔ وہ بھی ممتاز شیریں کے فن کی بیحد مداح تھی۔ اتنی کم عمری میں ایسے عمر رسیدہ نظریے اور سنجیدہ دلائل بڑی غیر معمولی سی بات ہے۔ ہماری یہ نشست بہت ہی معلوماتی اور دلچسپ رہی۔ لندن سے واپسی پر میری شادی ہو گئی اور یوں مصروفیات و مشاغل کا انتخاب وقتی طور پر کسی حد تک پابند ہو گیا۔ پھر نہ جانے غم دوراں میں یہ کہیں کھو گئیں یا میں ہی الجھ کر رہ گئی۔

برسوں بعد جب اسلام آباد کا قیام ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آیا تو یوں مجھے پہلی بار اپنے لڑکپن کی سنہری یادوں کو دہرانے کا موقع ملا۔ میں اور میری دوست ثریا محبوب حسن ایک روز خرید و فروخت کے لئے سراج بازار گئے مجھے بچوں کے بال بھی ترشوانے تھے۔ دکان میں داخل ہوئے تو وہاں یہ بیٹھی کسی رسالہ کی ورق گردانی کر رہی تھیں۔ میں تو صرف تصویر سے شناسا تھی۔ ثریا آپا البتہ ان کے ہمراہ کسی کام میں شریک رہ چکی تھیں، وہ پہچان کر بولیں "ارے یہ تو ممتاز شیریں ہیں"۔ میں چونک گئی اور اپنی یادوں کی تصویر کا عکس ان میں تلاش کرنے لگی۔ دراصل وہ کچھ بیمار سی، کھوئی کھوئی سی لگ

رہی تھیں۔ ثریا آپا نے تعارف کروایا اور کہا ہم کسی روز آپ کے ہاں آئیں گے۔

وہ غیر یقینی سے بولیں، سب ہی کہتے ہیں۔ لیکن شاید زندگی کی الجھنیں مہلت ہی نہیں دیتیں۔ آپ لوگ ضرور آئیں مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ بچے یہاں نہیں ہیں اور میاں دفتر میں ہوتے ہیں۔ صبح کے وقت بہت تنہائی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن افسوس جس اندیشے کا اظہار انہوں نے کیا تھا۔ وہی ہوا۔ ثریا آپا کو اچانک کراچی جانا پڑ گیا۔ مجھے تنہا گھومنے پھرنے کی عادت نہ تھی۔ یوں وعدہ وفا نہ ہوسکا۔

جمیلہ ہاشمی میری دوست، چند روز کے لئے اسلام آباد آرہی تھیں۔ دراصل وہ اپنے نئے موضوع تحریر کے سلسلے میں معلومات جمع کر رہی تھیں۔ کچھ لوگوں سے ملاقات، کچھ کتابوں سے التفات اور کچھ حالات سے نفاق۔ ان کے میاں اپنی عاشق بیٹی کو لے کر مری کی جانب نکل گئے۔ سوئے اتفاق کہئے کہ ہمیں بھی انہیں دنوں کسی اشد ضرورت سے لاہور کا سفر درپیش ہوا اور یوں جمیلہ کو ہمارے ہاں اپنی مہمانی خود ہی کرنا پڑی۔ واپس آکر میں نے پہلے ان کی مصروفیات و ملاقات کے قصے سنے اور معلوم ہوا کہ ممتاز شیریں اور ان کے میاں ڈاکٹر صمد شاہین بھی ہمارے ہاں آئے تھے اور بہت عمدہ محفلیں رہیں بلکہ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہا آپ کا گھر تو شعر و ادب کا ٹی ہاؤس بنا ہوا تھا۔ مجھے اپنے در و دیوار پر رشک آیا اور اپنی محرومی پر دل گرفتہ ہوئی تو جمیلہ کو لے کر انہیں ملنے گئی۔ ایک پیاری سی شام گزارنے اور ڈھیروں باتیں کرنے کے بعد ملتے رہنے کے وعدے ہوئے اور ہم جدا ہو گئے۔

ایک روز کہیں باہر سے واپس آئی تو ملازم نے ایک نمبر دیا کہ شیریں صاحبہ کا فون آیا تھا، آپ کو پوچھ رہی تھیں۔ میں نے فوراً نمبر ملایا تو ایک انتہائی شیریں آواز نے کانوں میں رس گھول دیا۔ لمحہ بھر کے لئے تو میں سوچ میں پڑ گئی کیا واقعی یہ ممتاز شیریں ہی ہیں یا کوئی اور۔ اپنی شخصیت کی طرح آواز بھی ویسی ہی دلکش، البیلی اور نکھری ہوئی پائی تھی۔ بولیں: آپ وعدہ کر کے بھی نہ آئیں۔ میں شرمندہ ہوئی تو کہنے لگیں اچھا ہم کسی وقت آئیں گے۔ بسر و چشم، میں نے خوش ہو کر جواب دیا۔ پھر مشترکہ دوست ہونے کی حیثیت سے جمیلہ کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ اس کی ناولٹ "روہی" کا پس منظر انہیں بہت پسند آیا تھا۔ پوچھنے لگیں: آپ کو تو علم ہوگا۔ کیا یہ تصوراتی اور ذہنی ہے یا پھر چولستان میں ایسا ہی صحرائی حسن ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ جن دنوں ہم بہاولپور میں تھے۔ مسعود موسم گرما میں چولستان کے دورے پر گئے اور واپس آکر انہوں نے ہماری فرمائش پر تفصیل سے وہاں کی منظر کشی کی۔ میں اور جمیلہ دونوں ہی سن کر بے حد متاثر ہوئیں اور جمیلہ بی نے کہا کہ میں کسی روز اس پر ضرور کہانی لکھوں گی۔ یوں یہ ناولٹ ان کے ذہن میں ترتیب پاتا رہا۔ ریاست میں رہنے کی وجہ سے وہاں کے رسم و رواج سے واقف تھیں، مزاج داں تھیں۔ علاوہ ازیں کہانی اور اس کا ماحول خود ان کے مزاج سے موافقت رکھتا تھا۔ اس طرح یہ ایسی عمدہ کہانی وجود میں آئی۔ ممتاز شیریں بولیں: اگر یہ سنی سنائی کا نتیجہ ہے تو پھر بے حد اچھا اور مکمل تاثر پیدا کرتا ہے۔ پھر ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام منٹو راما کا ذکر ہوا۔ کہنے لگیں، کل اس سلسلے کا ایک ڈرامہ تھا۔ لیکن اخبار میں پروگرام کی تفصیل بہت مبہم تھی۔ اگر منٹو کا نام لکھا ہوتا تو میں ضرور دیکھتی کیونکہ آج کل میں اس موضوع پر لکھ رہی ہوں۔ میں بھی نہ دیکھ پائی تھی اس لئے کچھ روشنی نہ ڈال سکی۔ تاہم ہم نے طے کیا اس کا کچھ تدارک ہونا چاہیئے۔ یعنی ذمہ دار صاحب سے گفت و شنید۔

پھر کچھ ایسا دور آیا کہ بچوں کی بیماری کے باعث مجھے ہسپتال میں ہی آتے جاتے ان سے ملاقات رہنے لگی وہ بھی کچھ بیمار تھیں۔ کوئی ایسی تکلیف جس کی تشخیص تا حال نہ ہو سکی تھی اس لئے اکثر و بیشتر علاج کے لئے آتی رہتیں۔

کبھی تنہا اور کبھی اختر جمال کے ہمراہ نظر آتیں۔ ان دنوں یوں معلوم ہوتا تھا گویا ہسپتال لیڈیز کلب بنا ہوا ہے۔ کیونکہ تمام ملاقات کی تان وہیں پر ٹوٹتی۔ آج جب وہ دن یاد کرتی ہوں تو چند زخم خوردہ احساسات سر اٹھاتے ہیں۔ ان سے ملنے میں کچھ ایسی ہی بات تھی کہ وہ دیر تک یاد آتی رہتیں۔ ایک بے نام سی حسرت احساس تنہائی کے ہالے میں اپنے وجود کا چلتا پھرتا سایہ، اپنی عظمت سے غیر آگاہی کا لبادہ اوڑھے ہوئے یا حقیقتاً ناواقف۔ ان کی آنکھوں کی سیاہی میں ڈوبی ہوئی ممتا کی کرچیں لیتی ہوئی چمکیلی حسرتیں دل میں دور تک اتر جاتیں پھر جب مجھے اس بات کا علم ہوا کہ ان کے صرف دو بیٹے ہیں۔ اور وہ دونوں ہی کافی سالوں سے سمندر پار حصول علم کے لئے ممتا کی نرم وگرم آغوش سے دور مقیم ہیں اور عزیز واقارب سب ہندوستان میں رہ گئے تو بہت سے نقاب الٹ گئے اور حقیقتیں عیاں ہوگئیں۔

کیا کیا پہلو سامنے آئے کیسے کیسے جذبوں کے!

یہ زندگی تھی اور یہ اس کے خواب پریشاں رہی تعبیر تو غم

کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

ممتاز شیریں امیدوں کی دنیا بسائے آخر کب تک منتظر رہتیں۔ انہیں دیکھ کر ہمیشہ دل میں ایک ہی خیال ابھرتا۔ کاش میں ان کے لئے کچھ کر سکتی۔ ان کی تنہائی کا کچھ تو مداوا ہوتا!۔ ایسی تنہائی جسے شریک سفر حیات دور نہیں کر سکتا۔ تنہائی جو بچوں کی معصوم محبتوں سے آباد ہوتی ہے۔ اور جسے ان کا معصوم پیار سینے سے لپٹ کر دور کرتا ہے۔ جس کے پردے چاک کرنے کے لئے اپنے پیاروں کا قرب، اور جذبات کی گرمی کسی شے کی منتظر، کسی چیز کی تمنائی اور کسی زیر لب اظہار معلوم ہوا کرتی۔ یوں لگتا وہ زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ

تنہائی کے نازک لمحوں میں کچھ تم ہی تسلی کر دو

تم نے تو وہ شب دیکھی ہوگی جس شب کی سحر ہو جاتی ہے!

بچوں کی بیماری سے فراغت پا کر بہت دنوں بعد میرے دل میں انہیں دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ اور میں ان کے ہاں جا پہنچی۔ دروازے پر تالا دیکھ کر مڑنے کو تھی۔ کہ ایک ملازم نظر آیا۔ اور پرسش پر معلوم ہوا کہ بیگم تو ہسپتال میں داخل ہیں۔ میرا دل انجانے میں دھڑک اٹھا اور میں فوراً ہسپتال پہنچی میں نے دیکھا تو شدید کمزوری کے باعث وہ غنودگی کے عالم میں تھیں۔ ذرا دیر کو آنکھ کھلی تو پیار سے مسکرائیں میں نے مزاج پرسی کی اور تکلیف کی نوعیت دریافت کی پیٹ میں درد تھا اور کچھ کھا نہیں سکتی تھیں۔ یہ تو بعد ازاں معلوم ہوا کہ کینسر کا مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ وہ اس حال میں بھی قانع تھیں۔ نگاہوں کا شکوہ البتہ نہ چھپ سکا۔ نگاہیں جن میں دل کی محرومیاں بلا ارادہ جھلک جاتی ہیں خواہ ان کے ساتھ جینے کا فن آتا ہی کیوں نہ ہو۔

مجھے ایک بار پھر ان کی تنہائی کی شدت نے دل گرفتہ کر دیا۔ میرے پوچھنے پر بولیں کوئی بھی تو ایسا نہیں جو اگر چند دن ہی گزار سکے۔ آ بھی جائے تو آخر کب تک رہ سکتا ہے۔ در اصل پاس رہنے والے بہت دور رہ گئے ہیں۔ صمد بیچارے کیا کریں دفتر سنبھالنا، پھر مجھے دیکھنا۔ میں جانتی ہوں تھک گئے ہیں۔ لیکن میری خاطر ہشاش بشاش نظر آنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے قمیض کسی کھردرے کپڑے کی پہن رکھی تھی۔ میں نے کہا لائیے بدلوا دوں، تو بولیں: اس وقت تو اور کوئی نہیں ہے۔ میاں کو جو ملتا ہے لے آتے ہیں۔ اب کہاں معلوم تھا طبیعت یوں بگڑ جائیگی ورنہ خود ہی کچھ کپڑے لے آتی۔ میں نے تسلی دی اور کچھ دیر بیٹھ کر آتے رہنے کا وعدہ کر کے آ گئی۔ دوسرے روز دوپہر میں تھوڑی سی کھچڑی بنا کر لے گئی اور اپنے ہاتھ سے دو تین چمچ کھلائے۔ بہت مسرور و ممنون ہوئیں اور میرے دونوں ہاتھ تھام کر بے حد پیار سے بولیں آپ بہت ہمدرد ہیں۔ میں آپ کی محبت کبھی نہ بھولونگی۔

رات کو ایک جگہ دعوت تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑا۔ وہاں نور الحسن جعفری تنہا نظر آئے اور آپا بہن کا پوچھا

تو بولے آپ کو نہیں معلوم ممتاز شیریں وفات پاگئیں۔ عزیز وہیں گئی ہیں۔ گھبراہٹ میں آپ کو اطلاع ہی نہ دے سکے میں بھی ابھی واپس آیا ہوں۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں کے سامنے دھندسی چھاگئی جس کے پار ممتاز شیریں کا نفیس ہیولا جھلملایا اور گوش ہوش میں وہ نرم وگرم، رسیلی آواز گونجی کہ آپ بہت ہمدرد ہیں۔ میں آپ کی محبت کبھی نہ بھولوں گی۔

میری محبت کو کبھی نہ بھولنے والی دعویٰ کرتے والی اس قدر جلد بھول کر انجانے دلیس کی پر اسرار ---------- وادیوں میں گم ہوگئی۔ یا پھر اس کی روح کے لئے کرب کے اس سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب ڈوب کر ابھرتے رہنے کی قوت باقی نہ رہی تھی کہ اس نے قفس کی تیلیاں توڑتے توڑتے دم ہی توڑ دیا۔

غنچہ گل جس شاخ پر چٹکا، آج وہ شاخ تہی ہے یہاں
پل بھر میں وہ چاند سی صورت، صورت وہم وگماں بھی نہ تھی

اپنی محرومی کا مجھے احساس ہے لیکن اس کی آزادی کا احساس فزوں تر ہے۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے آزاد ہو کر سمندروں کے پار اپنی بیقراری کو قرار دے رہی ہوگی۔ سرحدوں کو عبور کرکے اپنے پیاروں پر منڈلا رہی ہوگی۔ منزل پر پہنچ کر سفر کی تمام کلفتیں بھول چکی ہوگی اور احساسِ تنہائی سے دور وہ اب اپنی ذات میں انجمن ہوگی۔ اب تو ان آنکھوں کی سیاہی میں روشنی کا نور، قلب کا سکون اور ممتا کا غرور نہ جھلکتا ہوگا۔

یادِ ایام میں گزرتی ہوئی ایک ایسی ہی شام تھی جب میں نے ڈاکٹر صمد شاہین کو زحمت دینے کا ارادہ کیا تاکہ کچھ پرانی حکایتیں اور بیتے فسانے سن کر اپنی یادوں میں رنگ بھر دوں وہ بہ کمال مہربانی اپنی بھانجی کی ننھی بچی کو جو انہیں ابا کہتی ہے ہمراہ لئے تشریف لائے اور یوں ہم نے اپنی بچھڑی ہوئی یاد کے ساتھ ایک شام منائی۔

شام کے سائے ڈھل گئے اور اداس چاندنی چاروں طرف پھیلے ہوئے درختوں کے لرزاں پتوں لئے چھن چھن کرانے لگی۔ وہ باتیں کرتے رہے، ہم سنتے رہے۔ انہوں نے اپنی ذہنی رفاقتوں کے قصے سنائے۔ شیریں کو فنی مدارج طے کرتے ہوئے دکھایا۔ میاں بیوی دونوں ہر علمی وادبی مسئلے پر آپس میں شدید بحث کرنے کے عادی تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ممتاز شیریں کی تحریر میں اتنی جلدی ایسی پختگی آگئی۔ وہ مسائل پر گہری نظر رکھنے کے علاوہ اپنی نپی تلی رائے کا برملا اظہار کرنے پر بھی قادر تھیں۔ مختلف تجربے قلب و ذہن کی گہرائیوں میں آ کر ایک نئے انداز میں ابھرتے ہیں تو فن کی تخلیق ہوتی ہے اور ذوق ادب کی افزائش۔ یہی ان کے فلسفے کا لب لباب تھا۔ خیر اُن کے فن پر تنقید میرا مقصود نہیں کیونکہ دوسروں کے علاوہ وہ خود اپنی ذات کو بھی اپنی بھرپور تنقید سے نہیں بچا سکیں۔ ان کے فن کو سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی پرستاری نصیب ہوگی۔ ہم مشرب و ہم صحبت بھی کئی ہوں گے۔ اپنوں کی محبتیں اور دوستوں کا خلوص بھی وافر ملا ہوگا۔ دشمنوں کی دشمنی اور رقیبوں کی رقابت سے بھی واسطہ رہا ہوگا۔ کوئی ان کے آغاز کا ساتھی اور کوئی انجام کا شاہد ہوگا۔ افسانے لکھے جائیں گے۔ یادیں دہرائی جائیں گی۔ خراج پیش کیے جائیں گے۔ لمحاتِ آخر و دمِ واپسیں کی گواہی دی جائیگی۔ لیکن میرا یادوں کا سرمایہ تو فقط ضبط کے احساس کی وہ ایک جھلک ہے جس میں منتظر ممتا کے درد سے بھرے ہوئے وہ پیمانے ہیں جو لبالب ہونے کے باوجود چھلکنے نہ پائے۔ میں نے ان آنکھوں میں صرف ایک ماں کا عکس اور ممتا کا پیار دیکھا تھا۔

رات گزرتی رہی، بچی اونگھنے لگی تو ہمیں وقت کا احساس ہوا۔ رخصت سے قبل صمد بھائی نے پرویز و گلریز اپنے بیٹوں کا ذکر کرتے ہوئے پرویز کے ایک خط کا ذکر کیا جس میں اس نے ممتا کی دھڑکنوں کو آواز دی تھی۔ میں نے وہ خط ان سے مانگ لیا اور یوں پیار کے ان روشن لمحوں نے اس کی یادوں کو پھر جگمگا دیا۔

میں وہ خط پڑھتی رہی، بار بار پڑھتی رہی۔ ہر بار آنسوؤں کے دھندلکوں میں الفاظ گم ہوتے رہے اور مطلب کی رفعت میں احساس ڈوبتے رہے اب جب کہ وہ تحریر مجھے تقریباً ازبر ہو چکی ہے، میں اس معصوم پیار کے چند تاثرات اپنے الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ ممتا جس کی ایک جھلک مجھے اس ماں کی آنکھوں میں دکھائی دی تھی، اس کا سرچشمہ کہاں تھا، کیا تھا، کون تھا؟

موت کے بارے میں ڈائلین تھامس کے چند اشعار کے ترجمے میں پرویز نے، شعر و ادب کا ذوق جس کی خمیر و خون میں گھلا ہوا ہے، جو اپنے جذبات و احساسات کا اظہار اشعار ہی میں کیا ہے جن کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ:

عزیز ڈائلین، اس کی موت نے
قتل کیا ہے۔ انسانیت کو
خدا کی!
اگر میرا دیوانہ پن وگریہ زاری
اور غم و غصے میں ڈوبی ہوئی سرد آہیں۔
کلمات کفر ہیں۔
تو مجھے یہ ہرزہ گوئی، یہ بے ادبی، کرنے دو، کرنے دو!!
نہ تو قتل اس سے قبل کبھی اتنا منصفانہ تھا
اور نہ ہی شیریں سے زیادہ کوئی شے اتنی شیریں!
(پرویز)

پرویز نے اپنے پیارے بھائی گلریز کو اور اپنے پیارے ابا کو یوں مخاطب کیا ہے کہ:

"میں نہیں جانتا اس خط میں کیا لکھنے والا ہوں، اس لئے اگر یہ ایک غمزدہ ذہن کی لایعنی گفتگو، ایک دیوانے کی بڑ محسوس ہو تو آپ مجھے معاف کر دیں۔ کیونکہ جب سے میں نے آپ کا خط پڑھا ہے، میرا غم آج ہر دن سے سوا ہو گیا ہے۔ مزاج کا وہ بت جو میں نے اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا یعنی جوانی اور صبر و ضبط اس وقت میری نظروں کے سامنے ڈھے چکا ہے میں نے ایک ننھے بچے کی طرح آج ڈھیروں آنسو بہائے ہیں۔ اب، آج اور اس وقت میں جوان ہوا ہوں۔

اس ماہ کی ۱۵ تاریخ کو جب کہ میں ابھی اس تلخ حقیقت سے لاعلم تھا، میں نے وہ دیکھا جسے میں صرف ایک پراسرار خواب ہی کہہ سکتا ہوں۔ وہ خواب جو ایک ایسی زندہ حقیقت تھی جس کا مجھے علم نہ تھا۔ میں نے دیکھا امی بڑے سکون سے لیٹی ہوئی ہیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور ایک مبہم سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ وہ بے حد پیاری لگ رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ سرخ تھے۔ جیتے جاگتے خون کی طرح۔ لعل و یاقوت کی طرح سرخ نہیں بلکہ خون کی طرح سرخ اور تر و تازہ یہ بات مجھے نہ تو انوکھی لگی اور نہ ہی عجیب بلکہ عین فطرت کے مطابق اور مناسب لگی تھی۔ میں نے جھک کر ان کے ہونٹ چوم لیے۔ ان کی آنکھیں ابھی تک ہنوز بند تھیں اور بند ہونے کی وجہ سے ساکن۔ مجھے ایک احساس ہوا، کچھ ایسی بلندیوں سے جو صرف کسی خواب ہی کا حصہ ہو سکتی ہیں، اگر وہ مجھے اپنے قریب دیکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن۔ انہوں نے میرا نام پکارا کیوں نہیں؟ سرگوشی ہی کی ہوتی یا مسکراہٹ ہی ذرا کھل جانے دی ہوتی!! اب سوچتا ہوں تو راز کھلتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن تھا۔ وہ تو تین دن پہلے عالم وجود سے عدم کی جانب سفر کر چکی تھیں۔ وہ تو وہاں نہیں تھیں۔ لیکن آہ! ان کے ہونٹ تو ویسے ہی زندگی کی حرارت لئے ہوئے تھے۔ گرم اور سرخ۔ میں انہیں ہمیشہ ایسا ہی، اسی صورت میں اور اسی حالت میں یاد رکھوں گا۔ او خدا، اگر کہیں خدا ہے! یا الٰہی خدایا! تو ضرور ہونا، اور میرا بوسہ میری امی کے ہونٹوں تک پہنچا دینا۔

پیارے گلریز! یہ سچ ہے کہ ہم سب کسی طویل مدت کیلئے اکٹھے مل کر نہیں رہ سکے محبت ہی ہمارے درمیان پیار کا تنہا بندھن رہا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے لئے اپنے جذبات

اور اپنی محبت کے اعلانیہ اظہار کے بھی قائل نہیں ہے۔ تاہم ہمارا پیار کبھی بھی اور کسی حالت میں بھی کم نہیں رہا۔ امی ہمیشہ ہمیشہ ہمارے دل میں زندہ رہیں گی اور ہم اب انہی کی یاد کے سہارے زندہ رہیں گے۔

نواب بھائی سے ملنے کے بعد جب میں لوٹا تو ابھی تک بے یقینی کے اس عالم میں تھا کہ مجھے خوشی ہوئی اتنا بڑا صدمہ میں نے ایسی ہمت اور ایسے حوصلے سے سہا لیا ہے۔ حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ میں ابھی تک اس سچائی کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں تھا۔ میں ابھی کچھ بھی برداشت نہ کر پایا تھا۔ وہ تو صرف چند لفظوں کی آوازیں تھیں جو میں نے سنیں۔ پھر جب گھر جاتے ہوئے۔ میں ایک زمین دوز ریلوے سٹیشن کی سیڑھیاں اتر رہا تھا تو سامنے دیوار پر ایک پوسٹر نظر آیا " اپریل ۔ ماں کا دن ہے۔ اپنی پیاری امی کو بتاؤ تم ان سے کس قدر پیار کرتے ہو جب میں نے یہ پڑھا تو پہلی مرتبہ میری آنکھوں میں آنسو جمع ہونے شروع ہوئے لیکن میں پھر بھی نہیں رویا۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ بیٹے، میں نے سوچا، جو اپنی پیاری ماؤں کو اپنے پیار و محبت کی نشانیاں، تحائف پھولوں کی صورت میں بھیج سکیں گے۔ میں نے تو صرف ایک بوسہ ہی دیا اور وہ بھی خواب میں۔ لیکن نہیں میرا وہ ایک پیار دنیا بھر کی محبت کے تمام پھولوں سے زیادہ ہے گلریزا اور آج اس لمحے میں میں موت کی بربریت اور اس کے وحشیانہ پن پر جان ڈون کے ساتھ مل کر اپنی دیوانگی کا اظہار ہی کر سکتا ہوں کہ،

اے اجل! غرور نہ کر۔
نیند کے مختصر سے وقفے کے بعد
ہم جاگ اٹھیں گے، ہمیشہ کے لئے
اور پھر موت نہیں رہے گی۔
اے اجل، پھر تو بھی مر جائے گی۔
(تجھے بھی موت آجائے گی، ہمیشہ کیلئے)

(اتنا ہے فسانہ جینے کا ۔ اتنی ہے کہانی مرنے کی!)

ادا جعفری

بُلاوا

وہ جو چپ چاپ بھری بزم سے اٹھ کر چل دیں — یوں دبے پاؤں کہ جیسے کہیں آئیں نہ گئیں

بے نیازی تھی کہ خود دارئ فن تھی لوگو! — شب کی مہماں کوئی گم گشتہ کرن تھی لوگو!

زہر کا جام بھلا راس کسے آیا ہے

درد کا زہر تھا رگ رگ میں لہو کے بدلے — ناتواں دل کے مگر پھر بھی وہی تیور تھے

اور وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی حیران آنکھیں — نہ ہراساں نہ پریشاں نہ پشیماں آنکھیں

وہی آسودہ و مانوس تبسم لب پر

زہر کا ناز اٹھایا تو کئی غم پہلے — اتنی تنہائی کہ تنہائی بھی لو دینے لگے

خامشی ایسی کہ ہنگامۂ محشر جیسے — یاد کے دھندلے دریچوں میں کہیں صف آرا

عہد ماضی کے حسین خواب تمنا کے سراغ — دور افق پار فروزاں کسی فردا کے چراغ

درد کی شب کو اجالوں کے سندیسے بٹتے — چند روز اور امیدوں کے سہارے کٹتے

زندگی کو کئی راہوں سے گزرتے دیکھا — فکر انسان کی صداقت کو نہ مرتے دیکھا

موت پہلے بھی تو ان جیسوں کا مقسوم نہ تھی — جانے کس دیس پہنچنے کی ہوئی تھی جلدی

جانے کس بزم سے آیا تھا بلاوا اب کے؟

احمد ظفر

منزلِ کا نشاں ___ کتبے

کتنے آئینے یہاں ٹوٹ گئے
پھول چہروں کے ___ ستارے مدفن
حرفِ شیریں بھی کسی تلخ نوا کی صورت
دور و نزدیک کی آواز ہوا جاتا ہے

وہ ادب گاہِ محبت بھی نہیں
جس میں جلتے تھے عقیدت کے چراغ
لوگ آنسو جنہیں کہتے تھے ___ خوشی کے آنسو
چند پتھر ہیں ___ سرِ راہ گذار
چند پتھر جنہیں کتبے بھی کہا جاتا ہے
اور یہ کتبے بھی منزل کا نشاں دیتے ہیں

خاطر غزنوی

ممتاز شیریں

اور بھی کتنی لکیریں ہیں کہ تصویر کو تکمیل کی قوت سونپیں

اور بھی کتنے ہی رنگوں میں ہے جذبات کے اظہار کی لو

اور بھی کتنے ہی خاکوں میں ہے تخلیق کے اسرار کی ضو

اُس کے پیکر کے گر شوخ فسوں ساز خطوط

جگمگاتے ہوئے چہروں کے سمندر میں اسے

بادبانوں کی اُڑانوں کے نظارے بخشیں

اُس کی تصویر کے رنگ

کُلبلائے ہوئے جذبات کو گویائی کے دھارے بخشیں

وہ کہ تخلیق کے اسرار کی ضو ہے —— دیکھو

اُس کی خاموشی بھی آواز ہے اس کے فن کی

عظیم قریشی

بنگلور کی شعلہ نوا کوئل ممتاز شیریں

جو سرزمین اسلام آباد کا ابدی سپنا بن گئی

جذبِ افکار ہیں
میرے اشعار ہیں
میگھ، طہار ہیں
ایک ہی جل پری !
ایک ہی کامنی !!
ایک ہی راگنی !!!

سفیرِ لامکاں

تنہا نہ پہنچی
خلد میں شیریں
عکس شبستاں ساتھ گیا ہے
رقصِ غزالاں ساتھ گیا ہے
نقشِ دبستاں ساتھ گیا ہے

راگنی جو امر بن گئی

سیفو کا شعلہ
"اپنی نگریا"
احساسِ غمگیں
معیارِ شیریں
میگھ اور طہار
میراں کی جھکار

افسانوں کی انورادھا

میراں کو گمگشتہ نام ملا ہے
سیفو کو اب جام ملا ہے
شیریں کو اب نام ملا ہے

بقائے دوام کی اپسراء

کہانی سنا کر کہانی بنی
وہ بیکنٹھ کی ایک رانی بنی
صبا نے کہا غیر فانی بنی

افسانہ کی راجکماری!

"اپنی نگریا"
ڈھونڈ لی آخر
اس خاکداں سے
عرشِ بریں پر
پھولوں کی رانی
سپنوں کی رانی
قِصّوں کی رانی

"اپنی نگریا" کی خالق

ارضِ میسور کی
شاہزادی مری
تری موت پر جتنے آنسو گرے
کوئی بن گیا اِک ضیائے دوام!
کوئی بن گیا اک لوائے دوام!!
کوئی بن گیا اک ارتقائے دوام!!!

تان امر ہے!

زخمی بولا
بان امر ہے
عارفہ بولا
دان امر ہے
شاعر بولا
تان امر ہے!

احمد رئیس

کہانی کار کی کہانی

کہانی کاروں کی
انجمن سے
یہ کون اٹھ کر چلا گیا ہے
کہ لفظ آنسو بہا رہے ہیں
ورق ورق پر
غم و الم کی
سیاہ چادر بچھی ہوئی ہے
سطر سطر
آج نوحہ خواں ہے
یہ کون خوش گو تھا
جس کے چرچے
ہر ایک اخبار
ہر جریدے میں
ہو رہے ہیں
یہ کس کی تصویر ہے کہ جس پر
لکھا ہوا ہے
"میں بنتِ مریم ہوں
بنتِ حوّا
خدا نہیں ہوں
مگر کسی سے میں کم نہیں ہوں
مجھے بھی پوچھو
مجھے بھی پوچھو......؟

وہ اک کہانی
کہ جس کا اوّل
نہ کوئی آخر
جو نامکمل تھی
نامکمل ہی رہ گئی ہے
جو اپنے لفظوں کے
اُس مسیحا کو
ڈھونڈھتی ہے
کہ جس نے اس سے
بڑی محبت سے
یہ کہا تھا
کہ میں تجھے اپنے خون سے
اس طرح لکھوں گی
کہ آنے والی حسین نسلیں
تجھے پڑھیں تو
مجھے دعا دیں!!

خود ہی ممتاز
خود ہی تاج محل

تاج سعید

ڈرائنگ روم میں رکھی ہر شے گھور رہی ہے
جیسے ابھی ابھی کوئی آ کر ان کی گرد اتارے گا
گرد اتارتے ان کو پیارا سا اک لمس ملے گا
اسی لمس کی حسرت میں
یہاں کی ہر شے
یوں چپ چاپ اور گم صم سی ہے
جیسے ان سے کوئی روٹھ کے چلا گیا ہو
کانسی کا فرعون بھی اپنے سر کو جھکائے
سوچ میں گم ہے
بالی کی رقاصہ ـــــ سم پر جمی ہوئی ہے
افریقہ کا حبشی اپنا منہ لٹکائے
دیکھ رہا ہے
وہ نہیں چاہتا، دوسرا کوئی
اس خاموش اداس فضا میں
اس کو آ کر چھیڑے، اس کا سکھ اور چین بکھیرے
اک جاپانی گڑیا، شیشے کی الماری کے اندر سے جھانکتی
رستہ تکتے تکتے تھک سی گئی ہے
اک تصویر پہ شوخ گلابی رنگ کا مسکن
جیسے کوئی دلہن ہار سنگھار کئے
بھڑکیلی ساڑھی پہنے
اتنی سرخ ہو، جیسے کوئی زندہ مورت
لیکن وقت گزرنے پر
اس کے گلال سے چہرے پر برسوں کی اداسی برسے
"دنیا فانی"
کانچ کے اک گلدان نے کی تصویر سے کچھ سرگوشی
یہ سن کر تصویر کے لب مسکائے
اک پھیکی مسکان
جیسے اس کو اس جملے کی سچائی معلوم تھی کب سے
جب سے آدم و حوا دنیا داری کے دھندوں میں پھنس کر
گھر کا رستہ بھول گئے ہیں۔

ممتاز شیریں

کفّارہ

ایک کاغذ بالکل سادہ اور سپید میرے آگے بڑھا یا گیا۔ میری کور ہوتی ہوئی آنکھیں جو تاریک خلا میں بھٹک بھٹک کر تھک رہی تھیں۔ اس مکمل سپیدی پہ جم کر رہ گئیں۔

اچانک میری نظر کے آگے اس سپیدی پہ کالا رنگ انڈیل دیا گیا، گہرا قطرہ بہ قطرہ گرتا اور پھیلتا ہوا۔ پھر یہ کالا رنگ خشک ہو کر سفید کاغذ پہ ایک چوڑی پٹی کی شکل میں محیط ہو گیا۔

مشیت کے ہاتھوں نے لکھا اور لفظوں کی لکیر کی طرف اشارہ کیا۔

جبر و قہر کی آواز آئی۔

"اس پہ دستخط کر دو"!

سیاہی کی گنجان چوڑی پٹی کے نیچے میں نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے دستخط کر دیئے۔

میں نے اپنی موت کے فرمان پر دستخط کر دیئے۔

موت دریچے سے لگی ہوئی مجھ سے ذرا سا دور کھڑی تھی اور مجھے اپنے عشوہ و انداز سے للچا رہی تھی وہ ہیجان خیز اور شہوت انگیز تھی۔ بھری بھری گداز ہوتی رانیں، کولہوں کی گولائیاں جلد سے چپکے ہوتے اسکرٹ سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر ریوے لان یا ہیلنا روبنسٹائن کا میک اپ چڑھا ہوا تھا۔ دہکتے ہوتے سرخ ہوسناک ہونٹوں پر حقارت اور سفاکی کا تبسم لئے وہ کہہ رہی تھی یہ زندہ نہیں رہے گی۔

"نہیں نہیں ڈاکٹر سپانا کورن ایسا مت کہو" سفید براق فرشتہ رحمت نے چیخ کر کہا۔ اس نے تیزی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تاکہ یہ اس کی چیخ نہ سننے پائیں۔ وہ سرگوشی میں ملتجیانہ انداز سے کہے جا رہی تھی نہیں ڈاکٹر اسے بچا لو، ہم سب کو اس سے بڑا لگاؤ پیدا ہو گیا۔ کیسی پیاری موہنی سی ہے —— اس نے تکلیف سہنے میں کسی خاموش طاقت اور قوت برداشت کا مظاہرہ کیا ہے۔ تین دن یہ درد کی اذیت میں مبتلا رہی اور مسکراتی رہی۔ ایک چیخ، ایک کراہنے کی آواز تک اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلی"۔

گہرے پنسل سے کھنچی ہوتی مصنوعی ابروؤں کی کمانیں تن گئیں درشت آواز نے کہا "تم لڑکیاں کتنی جذباتی بن سکتی ہو۔ علاج میں جانبداری یا تعلق سے کام نہیں لیا جاتا ہے، تمہیں ضابطہ کی پابندی میں جذباتیت کا دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ امراض کا علاج ایک سائنس ہے۔ تمہیں ہر مریض پہ مکمل بے تعلقی سے خالی از جذبات ہو کر توجہ دینی چاہیئے۔ اس مریضہ میں یا کسی اور مریضہ میں تمہارے لئے کوئی فرق نہیں ہونا چاہیئے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ اس مریضہ کا معاملہ زیادہ خطرناک اور پیچیدہ ہے۔ زندگی کی امید بہت کم ہے"۔ کوئی جاتے جاتے یہ الفاظ سن کر رک گیا۔ جیسے اسے سخت تکلیف ہوتی اور مڑ کر تلخ لہجے میں پوچھا، "کیا انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے؟ یہ مریض تمہارے لئے صرف ایک کیس" ہے؟

خدا کا شکر ہے "ڈاکٹر سپاناکوان گو یہ کیس تمہارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر اپنگلر اس مریض کو بچانے کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے اور ہر قیمت پر اس کی زندگی بچانے کی کوشش کریں گے۔ میرے لئے یہ زندگی بہت قیمتی ہے۔" "بہت عزیز!"

اور وہ جو موت تھی، اس نے بے پروائی سے اپنے کندھے سے سکوٹر کی بات سنی اور ان سنی کر دی "زیادہ سے زیادہ دس فیصد امکان ہے اس کے زندہ بچنے کا" اس نے حرف آخر کے طور پر اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ کلیمنسٹر کے ہاتھ تھے جن کے ناخنوں سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

جواب کی سفاکی سے مجروح ہو کر پیار میری طرف اس طرح بڑھا۔ جیسے وہ مجھے اپنی آغوش میں لے کر موت کے آگے سپر بن جائے گا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور موت کا انتظار کرتی رہی۔ میری زندگی سبکدوش ہو کر گرد باد مرگ کا انتظار کرتی رہی۔

چنانچہ مجھے مرنا تھا۔ ایک بے معنی اور بے مصرف زندگی ناگہاں اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی۔ میں نے زندگی میں کوئی معرکہ سر نہیں کیا۔ کسی چیز کی تخلیق نہیں کی۔ کوئی ایسا کام نہیں کیا جو میری اب تک کی زندگی کا کوئی جواز بن سکتا لیکن اب تک ایک نئی زندگی کی تخلیق شاید میری زندگی کا جواز بن جاتے۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور محبت کے چہرے پر نگاہ کی۔ اس لمحہ مجھ پر منکشف ہوا کہ مجھے کتنا چاہا گیا ہے۔ میری کتنی قدر کی گئی ہے میری زندگی بیکار اور بے مصرف ہونے کے باوجود ان کے لئے اہم اور قیمتی تھی جو مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اس لمحہ جب موت کا سرد ہاتھ مجھ پر منڈلا رہا تھا۔ یہ خیال بڑا اطمینان دہ تھا۔

محبت کا چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اس چہرے پر اندرونی کرب اضطراب اور پریشانی کے نشانات مرتسم تھے درد کو چھپانے کی کوشش میں ایک ایک نس پر ناقابل برداشت بار پڑ رہا تھا اور محبت کے چہرے کو دیکھتے وقت موت کا عرفان میرے بہت قریب تھا۔

کیا موت گناہ کی قیمت اور کسب جرم کا کفارہ تھا؟ میں تو گناہ سے نا آشنا تھی، یا کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے کبھی گناہ کی جھلک دیکھ لی ہو، خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو؟ اور پھر گناہ کو چھوٹا بڑا قرار دینے کا پیمانہ کس کے پاس ہے؟

محبت کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کا عرفان میرے بہت قریب تھا۔

محبت نے موت سے بچانے کے لئے اپنا بازو بڑھا رکھا تھا اندر گڑی ہوئی نشتر کی سوئی لال لال قطرے چوس رہی تھی۔ سیال سرخی بتدریج بڑھ رہی تھی اور جب سرنج بھر گئی تو سوئی نکال لی گئی۔

سوئی میرے ہاتھ کی باریک رگ کو ٹٹولتی رہی۔ بے شمار مرتبہ سوئی میری کلائی میں داخل ہوئی اور کہنی کے نیچے نیلی رگوں کے پھیلے ہوئے جال میں سرگرداں رہی۔ میرے پلنگ کے پاس لگے ہوئے دہشت ناک سلنڈروں سے گلوکوس کا محلول سوئی کے ذریعے میرے جسم میں داخل ہوتا رہا۔

پھر کسی خطرناک دوا کا محلول قطرہ بہ قطرہ آہستہ آہستہ میری رگ میں اترتا رہا۔

اور جب میں تھکن سے خستہ ہو کر، آنکھیں بند کئے ہوئے، لیٹی ہوئی تھی تو میں نے ایک خوفزدہ کرنے والی آواز کو سرزنش کرتے ہوئے سنا "یہ بہت خطرناک اور بہت طاقتور عرق ہے اسے بدن میں بہت آہستہ جانا چاہیئے۔ اگر بہاؤ تیز ہو گیا یا زیادہ مقدار بدن میں چلی گئی تو شدید انقباض پیدا ہو جانے اور اندرونی حصے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خطرہ ہے۔ ذرا سی لاپرواہی مہلک ثابت ہو سکتی ہے ساری رات مستقل نگہداشت کی ضرورت ہے۔

ساری رات نگہداشت کی جاتی رہی اور لمحہ بہ لمحہ میری تکلیف اور درد کا اندراج ہوتا رہا، وہ دوسری رات تھی۔ خوفناک اور ڈراونی اور یہ تیسری رات۔

اب میری رگوں میں گرم انسانی خون ٹپک رہا تھا۔ بلڈ بینک کے یخ خانوں سے لیا ہوا خون نہیں بلکہ محبت کے بازو سے نکلا ہوا تازہ اور زندہ خون۔ جیسے جیسے یہ خون میرے جسم میں داخل ہو رہا تھا میرا بدن اپنی کھوئی ہوئی حرارت دوبارہ حاصل کر رہا تھا اور مجھ میں زندگی واپس آ رہی تھی۔ زندگی میرے پاس مسکراتی ہوئی۔ محبت

کی مضطرب اور بے چین نظروں کو ڈھارس بندھاتی ہوئی کھڑی تھی
ایک ممنون طمانیت کے ساتھ دو نرم محبت بھرے ہاتھوں نے میرے ہاتھوں کو تھپتھپایا۔ ایک ہاتھ نے بڑھ کر شفقت سے میرے ماتھے سے بالوں کو پیچھے ہٹایا۔ "تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"تم ٹھیک ہو جاؤ گی"، زندگی کے فرشتے کے ہونٹوں سے ایک مہربان مسکراہٹ کی شعاعیں پھوٹیں "تم طاقت ور ہو تم میں بحرانی کیفیتوں کے شدائد برداشت کرنے کی طاقت ہے خطرے کو بڑھانے والی چیزیں تو خوف اور لاعلمی ہوتی ہیں اس پورے وقفے میں تم نے بڑی بہادری سے کام لیا ہے اور ہم سے پورا پورا تعاون کیا ہے تمہیں صورت حال کا صحیح شعور ہے اور اس صورت حال پر قابو پانے کے لئے جو ارادے کی قوت چاہیئے وہ بھی تم میں موجود ہے اور تم یقیناً اس پر قابو پا جاؤ گی۔

میں نے پرسکون اور راضی بہ رضا مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور کہا "ہاں، ڈاکٹر اسپنگلر" اور پھر میں نے محبت کے چہرے کو کھلے ہوئے وسیع دروازوں میں غائب ہوتے ہوئے دیکھا جو اس کے پیچھے بند ہو گئے۔ یہ آرفیوس کا چہرہ تھا۔ جو روشنی کی دنیا میں غائب ہو گیا
ایک ان دیکھی جبری طاقت مجھے تاریکی کی ابدیت میں کھینچ لے گئی
پھر بھی یہ موت نہیں تھی جو میرے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ یہ زندگی کا فرشتہ تھا۔ اس کے سفید دانت ایک دلآویز اور مسحور کن مسکراہٹ میں ایک ثانیہ کے لئے چمکے اور پھر ایک سفید نقاب میں روپوش ہو گئے۔ سنہرے بالوں والا سر ایک سفید ٹوپ میں چھپ گیا اور نیلی آنکھیں جو شفقت سے جگمگاتی تھیں اب سنجیدہ اور متفکر ہو گئی تھیں۔

سفید لبادے اور سفید ٹوپ میں ڈھکے ہوئے اور کئی ایک خاموش سایوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

میں نے اپنی زندگی خدا کے ہاتھوں میں دے دی۔

ریڑھ کی ہڈی کے دہانے پر اعصابی مرکز میں اترتی ہوئی سوئی کے ساتھ موت مجھ میں داخل ہوئی اور یکے بعد دیگرے میرے سارے عضلات، میرا پورا بدن بے حس، سرد اور بے جان ہوتا گیا۔

میں نے ساکت اور بے جان پیکر کو میز پر سفید چادروں میں لپٹا ہوا چھوڑ دیا۔

۱

میں نے اپنے آپ کو آزاد محسوس کیا۔ یکدم آزاد اور بے قید، جیسے میں اپنے جسم کے زنداں سے رہا ہو کر ایک بے حد و بے کراں وسعت میں داخل ہو گئی تھی۔

میرے چاروں طرف وسیع زمین پھیلی ہوئی تھی بنجر اور ویران زمین دفعتاً میرے پیروں کے نیچے زمین کانپنے لگی۔ زمین کانپتی لرزتی رہی اور اس طرح تشنج میں مبتلا رہی جیسے درد زہ سے گزر رہی ہو زمین نے اپنے اندر سے بیش بہا خزانے کا دفینہ باہر اگل دیا لیکن زمین کے بطن سے کوئی زندگی نمودار نہیں ہوئی۔

زمین کو ایک صاف لمبے شگاف میں چاک کیا گیا۔ زمین کا بطن ایک کھلا ہوا خون ریز کچا زخم تھا۔ جس سے لہو ڈھل ڈھل کر نکل رہا تھا اور جذب ہو رہا تھا۔

"اسکرین ٹیڑھی ہو گئی ہے" ایک دبی سرگوشی نے جلدی سے کہا۔

"اسکرین ٹھیک کرو۔ ریڑھ کی ہڈی میں دیا ہوا بے ہوشی کا انجکشن ذہن کو مکمل طور پر ماؤف نہیں کر دیتا چند ایک حصے جزوی طور پر زندہ اور ہوشیار رہتے ہیں۔"

زمین سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ لیکن زمین کے بطن سے کوئی زندگی نمودار نہیں ہوئی۔ زمین کا بطن مضبوطی کے ساتھ بند کر دیا گیا اس پر تمام زندگی کا راستہ بند کر دیا گیا۔

ساری زمین اجاڑ اور بنجر تھی ایک ویران خرابہ میرے چاروں طرف تنہائی اور سنسان دکھائی تھی۔ میں اس ویران خرابے کی وسعتوں میں بچھڑی ہوئی بے مقصد گھومتی رہی۔

اچانک نہ جانے کہاں سے پہاڑوں کا ایک سلسلہ ابھر آیا۔ ان کی آنکھوں کو خیرہ کرنے والی برف پوش چوٹیاں نیلے آسمان کے پس منظر میں سمندر کی منجمد لہریں معلوم ہو رہی تھیں پہاڑوں کی چوٹیاں سارے عناصر کے مقابلے میں امیدوں کی طرح سربلند کھڑی ہوئی تھیں ان کے درمیان خوف کی تاریک اور گہری کھائیاں تھیں۔ میں امید و بیم کے درمیان ایک گہری کھائی کے کنارے مشیت کی دیوار کو مضبوطی سے تھامے کھڑی تھی اور پہاڑ مل کر ایک ناقابل اندازہ اونچی اور ناقابل گذار دیوار بنے

تبدیل ہو گئے تھے کیا۔ یہ دیوار موت اور زندگی کے درمیان خط
فاصل قائم کرنے والی دیوار تھی۔؟

ناقابل یقین طور پر معجزانہ طور پر میں نے یہ دیوار
اور اپنے آپ کو دیوار کی دوسری طرف پایا اور یہاں پھیلی ہوئی
کھلی زمین کی بجائے بھول بھلیوں کی طرح کے راستے تھے میں ان
راستوں میں گم ہو گئی۔ بھول بھلیاں پیچ در پیچ کھلتی گئیں
اور غلام گردشوں، صحن خانوں اور اونچے اونچے ستونوں میں
پھیل گئیں۔

اب میں اپنی پہچان سکتی تھی وہ طویل کٹہرا جس کے سرے
پر کئی سروں والے ناگ اپنے حسین پھن اٹھائے گویا جھوم رہے تھے
پرسنگ بستہ راستے، صحن خانے یہ اونچے ستون ”انگکور“
کے تھے۔

میں اپسراؤں کی قطاروں کے درمیان چلتی گئی ان اپسراؤں کے
کے سنوارے ہوئے لمبے لمبے بال مرصع کندنی زیور اور نازک
حسین بدن اپنے ہوش ربا خموں کے ساتھ رقص کے انداز میں جھکے
ہوئے دیواروں پر ابدی نقوش میں مرتسم تھے۔

اس کے جمال کے کھلتے ہوئے گلاب کی کشش سے کھینچ کر۔
اس کے آموں سے لدے ہوئے درخت کی طرح حسین جسم
کے پھلوں کی طرف جس کسی نے نظر اٹھائی پھر اس کی نظر سے پلٹ
کر واپس نہ آئی۔

باغ میں بہتے ہوئے چشمے کے سکون کی طرح پونم کے
چاندرات کی طرح۔

وہ سرمستی و رعنائی کا پیکر بن کر جاگ اٹھی ہے۔

ایک ایک گوشے سے ہر اپسرا زندہ ہو کر نیچے اتر آئی اور سب
مل کر رقص میں شامل ہو گئیں۔

آسمانی جل پریاں ناچتے ناچتے ایک بے حد و دور بے کراں
فضا میں پہنچ گئیں۔

ان کے ملکوتی جسموں کی تابناکی میں روحانی عظمت کے
چراغ روشن تھے۔

یہ آسمانی اپسرائیں صرف درباری ناچنے والیاں تھیں
ناچ فنکاروں اور مخصوص کمیونٹی کا تھا۔ ساری اپسرائیں اسی طرح ناچ رہی
تھیں جس طرح صدیوں پہلے سوریہ ورمن کے دربار میں انہوں نے ناچا
ہوگا۔ نازک ہاتھ مختلف زاویے بناتی ہوئی مخروطی انگلیاں، بل
کھاتے ہوئے اعضا کا لوچ نرم و نازک ہتھیلیاں جو جڑ کر کھلتے ہوئے
کنول بن رہی تھیں۔

جو اپسرا ناچتی ہوئی گزرتی اس کی طرف جان لیوا ہیرے کی
انگلی اٹھتی جو شیوا نے بدصورت ناقص الخلقت بونے کو بخش
دی تھی، اور تمام اپسرائیں ایک ایک کر کے مردہ ہو کر گرتی گئیں
ننھی دبلی پتلی اور نازک جل پریاں برف کی طرح حسین
پروقار سرو قد اور راج ہنسوں جیسی (BALLERINA) میں
بدل گئیں جو جھیل کے سحر سے آزاد ہو کر چاندنی رات میں چائے کو
وسکی کی مسحور کن موسیقی پر ناچ رہی تھیں۔

راج ہنسوں کی شہزادی سب سے الگ ہو کر اکیلی اپنا آخری
رقص کرتی رہی۔ فضا میں اس کی آواز بھی وہ اپنی موت کا نغمہ گا رہی
تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی حرکات مضمحل ہوتی گئیں اور وہ
فرش پر گر پڑی اس کے نازک بدن میں ایک آخری تھرتھراہٹ پیدا ہوئی
اور اسی حسن و تمکنت کے ساتھ وہ موت کی آغوش میں سو گئی۔

موت میں بھی ایک وقار اور حسن ہوتا ہے۔

نہیں، نہیں موت تو بدصورت اور مضحک تھی۔ میں نے اصلی
اور حکایاتی جنگوں کے مناظر سے منقوش دیواروں کے درمیان سے
گزرتے ہوئے سوچا۔ خونریزی کے مناظر، موت اور تباہی کے مناظر
اور یہ جہنم تھا، اوی سی، کبھی نہ بجھنے والی آگ سے بھرا ہوا الاؤ جو انسانی
جسموں کے ایندھن پر جل رہا تھا شعلوں کی تیز زبانیں گناہ گاروں
کے تعاقب میں لپک رہی تھیں۔

نٹ راجہ دیوانہ وار اپنا وحشیانہ موت کا ناچ ناچ رہا تھا اور پھر
اپنی ایک ٹانگ رقص کے انداز میں فضا میں معلق کئے ہوئے دوسری
ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اس کا پیر انسان کی گردن پر تھا اور انسانی زندگی
اس کے پیر کے نیچے دم توڑ رہی تھی۔

ہندوستانی نٹ راجا، شیوا کے زیادہ شفیق کمبوڈین سے
پیکر میں ڈھل گیا اس کے موٹے ہونٹوں پہ ایک مہربان بلکہ ہوسناک
تبسم تھا اس کے سر پہ بالوں کی جٹائیں بل کھاتے ہوئے سانپوں کی
طرح لپٹی ہوئی تھیں جن پر نصف چاند کا ہالہ سجا ہوا تھا۔ شیوا
تخریب کا دیوتا تھا اور اسی لیے تخلیق کا بھی دیوتا تھا۔ کیونکہ موت
ہی کی کوکھ سے زندگی نکلتی ہے۔

اور وشنو تھے اپنے ساتھ سینکڑوں دیوتاؤں اور
راکششوں کو لے کر دودھ کے ساگروں کو آبِ حیات کے
لیے متھ ڈالا۔

کلدا نے تصویروں کی گیلری سے گزرتی ہوئی میں اُوپر
چڑھنے لگی مرکزی بُرج کی عبادت گاہ کی طرف بڑھنے لگی۔ اینگ
کور کا مندر درجہ بدرجہ بلند ہوتے ہوئے اتنا حسین اور متناسب
لگتا تھا جیسے پتھر میں موسیقی منجمد ہو گئی ہو۔ چار گوشوں کے چار
برجوں کی منزلیں مصری اہرام کے سے تکون بناتے مرکزی بُرج
کے کنول کی طرف اٹھتی تھیں اور یہ کنول نما سر بفلک مینار کیلاش
یا میرو کے پہاڑ کا اسم تھا کیلاش، جو دیویوں، دیوتاؤں کا مسکن
اور ساری کائنات کا مرکز تھا۔

لیکن اور راستہ تنگ اور تاریک تھا، سیڑھیاں اونچی اور ریتیلی تھیں
اندرونی عبادت گاہ میں اندھیرا تھا اور قدم بڑھانے کی ہمت
نہ ہوتی تھی۔

میں آخری زینے پر کھڑی ہوئی تھی، عبادت گاہ سے ایک
شبیہہ اگربتیاں تھامے ہوئے جو طاق میں جلائی جاتی ہیں نیچے اتر
رہی تھی۔ زعفرانی رنگ کی عبا میں ملبوس جو رومی چوغے کی طرح ڈھیلی
ڈھالی تھی اس نے سمندر کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک
اور شہ نشین پہ بدھ کے مجسموں کی قطار بنی ہوئی تھی۔ یہ منظر بنکاک
کے مشہور سنگ مرمر کے مندر کے جانے پہچانے منظر میں تبدیل
ہو گیا۔ بدھ کے سنہری مجسموں کی قطاریں بیٹھے ہوئے مراقبہ میں
مستغرق لیٹے ہوئے استادہ ہاتھ اٹھا کر سمندروں
کو پرسکون کرتے ہوئے۔

دنیاؤں کی لاعلمی سے بہت اوپر،
موسموں کے تغیر و تبدل کے سالوں سے بہت آگے۔
بدھ کا آئینہ چمک رہا ہے اس طرح جیسے
چاند موسم خزاں کے آسمان پر چمک کر
کائنات کو اپنی محبت کی کرنوں سے پور تر بنا کر آغوش
میں لے لیتا ہے۔
جسم ایک بدرو ہے، ہر طرح کی غلاظت اور گندگی
کا گھر۔
جاننے والے کے لیے زندگی
ایک ننھے سے دیے کی لرزتی ہوئی لو ہے۔
جو ہوا کے ایک جھونکے میں بجھ جاتی ہے۔

وہ مقدس اور تمثیلی درخت سامنے تھا جس کے گھنے سائے
تلے بدھ کو روشنی ملی تھی۔ میں نے درخت کی طرف دیکھا وہاں
روشنی نہیں تھی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ عظیم الشان کھمیر تہذیب
کے ان شاندار کھنڈرات میں تنہا بھٹکتی ہوئی تاریکی سے میں
خوفزدہ ہونے لگی۔ راستے سکڑ کر دوبارہ ایک بھول بھلیاں میں
بدل گئے۔ ہوا رک گئی تھی میرا دم گھٹ رہا تھا۔

"دو آکسیجن کی جالی ٹھیک کرو، سانس لینے میں دقت ہو رہی
ہے" کہیں قریب کسی نے تیزی سے سرگوشی میں کہا "دو آکسیجن"

ہوا میں تازگی تھی میرے اوپر روشنی تھی میرے اوپر کھلتی ہوئی
محرابیں شاندار تھیں ستون سفید مرمر کے بنے ہوئے، سنگ
مرمر تقدس اور پاکیزگی کی ایک ملکوتی فضا کا حصہ معلوم ہو رہا
تھا۔ یہاں نہ کندہ کی ہوئی شکلیں تھیں، نہ مجسمے اور تصویریں لیکن
پھر بھی اس سادگی اور پاکیزگی کا ایک اپنا متحیر خیز حسن اور جمال
تھا۔ یہاں مورتیاں نہیں تھیں خارجی علامات نہیں تھے کوئی
"رو واسطہ حسن قبول"، نہ تھا لیکن ایک غیر مرئی برتر و بالا وجود
جاری و ساری تھا۔ اپنے خالق سے ایک خاص اور براہ راست
تعلق کا احساس تھا۔

سفید بیضوی گنبد، مرمر کے ستون، پھیلی ہوئی محرابیں شفاف

فانوس یقیناً بادشاہی مسجد تھی ان جانی، اجنبی راہوں پر بھٹک کر میں گھر لوٹ آئی تھی، مرکزی قبے کے نیچے میں سجدے میں گر گئی اور خشوع و خضوع سے نماز پڑھنے لگی میرا سارا وجود ایک عجیب اور انوکھی مسرت سے لبریز تھا۔ بالآخر مجھے سکون مل گیا۔

میں نے اٹھ کر اپنے ارد گرد سراسیمہ ہو کر نظر ڈالی، میں کہاں تھی؟ ایسا معلوم ہو رہا تھا زماں و مکاں جہت اور پیمانے سے محروم ہو کر اپنا مفہوم کھو بیٹھے تھے اور میں گویا زماں و مکاں سے گزر کر ابدیت میں داخل ہو رہی تھی۔

یا اس کے برعکس ابدیت سے نکل کر "اب" اور "موجود" کی دنیا میں واپس آ رہی تھی؟ تمام وقت ازلی اور ابدی "حال" ہے

جن راستوں سے ہم نہیں گزرے۔
وہاں کے قدموں کی چاپ۔
بازگشت بن کر یادوں میں گونجتی ہے۔

یہ نہ اینگکور کے مرمریں ستون تھے اور نہ بادشاہی مسجد کے سنگ مرمر کے ستون بلکہ معمولی عام قسم کے گول ستون تھے جن پر سفید اور خاکستری روغن چڑھا ہوا تھا۔ سنگ مرمر کی سیال، شفاف سپیدی صرف ہسپتال کی دیواروں میں چنی ہوئی، چمکدار ٹائلز میں تھی۔ ہاں یہ بینگکوک کا سیونتھ ڈے اڈونسٹ سینی ٹے ریم ہاسپٹل تھا۔

میں گویا، ابدیت کی لامتناہی وسعت کے دھندلکوں سے کھینچ کر قریبی اور متعین زماں و مکاں میں واپس لائی گئی تھی۔

ہسپتال کی لفٹ نیچے آئی اور اس سے کوئی باہر نکلا۔ زعفرانی عبا نہیں، سفید لباس پہنے ہوئے، میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ عیسائی مشن کی عورت تھی جو روزانہ مریضوں کے پڑھنے کے لئے اپنے مشن کا لٹریچر لاتی تھی۔ اس نے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا کاغذ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

"خدا کی بادشاہت قریب ہے۔
مسیح موعود کا نزول قریب ہے۔
آرمیگڈان کی بین الاقوامی جنگ، دنیا کی تمام قوموں کے درمیان زبردست ٹکراؤ اور تقریباً پوری دنیا کے تہس نہس ہونے کے بعد زخموں سے نڈھال زمین کو سکون اور امن نصیب ہوگا۔
مسیح موعود کی آمد قریب ہے۔
مسیح کا نورانی شعاعوں میں زمین پہ نزول ہوگا۔ . . .

یہ الفاظ ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئے اور میرے ذہن میں دوسری کتابوں کے الفاظ رینگنے لگے جن میں۔ مسیح کی دوبارہ آمد، ان کی حکومت میں امن اور خوشحالی، یوم حساب کی نزدیکی، مردوں کا زندہ ہو اٹھنا، روز جزا کا آخری انصاف جی اٹھے ہوئے مردوں کا ایک لامتناہی اندھیرے سے نکل کر حیران و سراسیمہ، الوہی نور کی خیرہ کن روشنی کے سامنے جمع ہونا۔ سب مذکور تھا۔

مجھے شہادت کی آرزو نہیں۔
مجھے آخری دید کی تمنا نہیں۔
مجھے صرف نفس مطمئنہ بخش دے۔

میرے سامنے پھیلا ہوا خلاء ایک سماوی روشنی سے معمور ہو گیا۔ طمانیت کا احساس میرے وجود میں پھیل گیا۔

روشنی کے ایک دھارے میں میری ننھی "رشمیں" میرے سامنے آ گئی، نومولود بچے کی شکل میں نہیں بلکہ میرے تصور کی "رشمیں" کے پیکر میں۔ گھنگھریالے بالوں والی گڑیا، گلابی جھالروں کے فراک میں سر جھکا کر اپنے خوبصورت بالوں کے گھونگھر ہلاتی ہوئے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ لئے ہوئے۔ محبت سے بے قابو ہو کر میں نے اس کی طرف اپنی باہیں پھیلا دیں لیکن میری ننھی "رشمیں" گریز پا نکلی وہ روشنی کے تخت پہ سوار ہو کر آسمانوں میں غائب ہو گئی میری باہیں خالی کی خالی رہ گئیں۔

ساری ویرانی اور بنجر پن، ساری تنہائی میرے اپنے اندر تھی سارا درد اور کرب پھر جاگ اٹھا یہ درد اذیت وہ تھا۔ بہت بہت اذیت وہ تھا۔ لاشعور کی وسعتوں آزادانہ گھومتا ہوا ذہن تکلیف وہ آگہی کے ایک نوکیلے نقطہ پر مرکوز کر دیا گیا۔ روح اپنی لاحاصل تلاش کے سفر سے لوٹ کر دوبارہ اپنے قید خانے میں داخل ہو گئی جو میرا جسم تھا۔

میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ روشنی میری کمزور آنکھوں کو تکلیف دے رہی تھی بد روشنی، آپریشن کی میز پر پڑتی ہوئی خیرہ کن بے رحم اور آنکھوں کو اندھا بنانے والی روشنی تھی "طمانیت" مارفیا یا کوئی اور خواب آور۔ دوا تھی جو میرے درد کی شدت کو کم کرنے کے لئے دی گئی تھی لیکن کوئی مارفیا اس درد کو مٹا نہیں سکتا تھا جو میرے اپنے اندر موجود تھا میرے وجود کی گہرائی میں زندہ تھا۔

میرے نفس نے آزاد ہو کر عالمگیر ویرانی اور تنہائی کا جو تصور دیکھا تھا وہ دراصل میرے اپنے شدید اندرونی احساس کا اظہار تھا جیسے جیسے آہستہ آہستہ میرے حواس مجتمع ہوتے گئے۔ ویرانی اور اجاڑپن کا کائناتی احساس سمٹ کر ایک شدید ذاتی المیے میں ڈھل گیا۔

جیسے ہی دروازہ کھلا آپریشن تھیٹر کے باہر اذیت دہ انتظار کا اعصابی تشنج ختم ہوا اور وہ اندر داخل ہوتے لیکن ڈاکٹر نے معانقتی انداز میں ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور الگ لے گیا میں ڈاکٹر سرگوشیانہ لہجے میں گفتگو سن سکتی تھی "مجھے افسوس ہے۔ بچہ کو بچایا نہیں جا سکا۔ ہم نے دل کے مساج کا طریقہ بھی آزمایا مگر بے کار۔ آخری لمحہ تک ہم نے اس کے دل کی دھڑکن پر کان لگائے رکھے وہ زندہ تھا۔ موت پیدائش کے فوراً بعد ہوئی ایک طرح سے پیدائش اور موت دونوں ایک ساتھ واقع ہوئیں"

صمیم دل سے مانگی ہوئی آخری دعا نے شاید یہ ننھی زندگی ایک دوسری زیادہ "قیمتی" زندگی کے بدلے میں بھینٹ دے دی تھی۔

کیا دل کی گہرائیوں سے مانگی ہوئی وہ دعا قبول ہوئی تھی ان کی کرب ناک اور مضطرب آنکھیں میری طرف پلٹیں۔

ڈاکٹر نے جلدی سے انہیں اطمینان دلانے کی کوشش کی اب یہ ٹھیک ہیں آہستہ آہستہ ہوش آرہا ہے جلد ہی انہیں ان کے اسپیشل وارڈ میں منتقل کر دیا جائے گا اور آپ ان سے بات کر سکیں گے اس ابتلا سے وہ بڑی ہمت سے گزریں بڑا پیچیدہ اور خطرناک کیس تھا لیکن اب خطرے کی سرحد پار ہو گئی ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سیزیرین آپریشن بذاتہ خطرناک نہیں ہوتا گو کہ بڑا آپریشن ہے کیونکہ شگاف براہ راست پیٹ میں اترتا ہے لیکن آجکل سلفا ڈرگس اور اینٹی بائیوٹکس کے اس دور میں سمیت پھیلنے اور موت کے خطرات بالکل دور ہو گئے ہیں آپ کی بیوی خطرے سے باہر ہیں۔ ابھی ان کی حالت بہت نازک ہے اور انتہائی حفاظت اور نگہداشت کی ضرورت ہے بچہ کی موت کے بارے میں انہیں ابھی نہ بتایا جائے تو بہتر ہوگا۔"

میرے دل پر سردی کی ایک تہہ سی چڑھ گئی میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ میرے سینے میں جو ننھی محبت کا شعلہ بھڑکا تھا وہ سرد ہو گیا۔

موت مجھے چھوتے ہوئے گزر گئی لیکن جاتے جاتے وہ تاوان میں اس ننھی سی زندگی کو لے گئی جو میرے اندر متحرک تھی وہ ننھا وجود اپنی نشوونما کی ساری منزلوں میں میرے تخیل میں اتنا واضح طور پر موجود تھا۔ اس کی تقدیر میں صرف ایک لمحہ کی زندگی تھی۔

میں نے زندگی کو نہیں، موت کو جنم دینے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی میں ندامت اور غم کے احساس میں ڈوب گئی۔ میری آنکھیں خشک تھیں آنسوؤں کے پاس بھی اس درد کا علاج نہیں تھا۔

میں تنہا تھی، اپنے کرب اور غم کے ساتھ، بالکل تنہا۔

میں اس ساری قیامت سے موت کے لئے گذری تھی یا پیدائش کے لئے۔۔؟ پیدائش ہوئی یقیناً لیکن۔

یہ پیدائش میرے واسطے موت کی طرح سخت اور تلخ اذیت بن گئی۔

یہ بہت بڑا کفارہ تھا۔ اس کفارے کے لئے مجھے کیوں منتخب کیا گیا۔؟

کفّارہ

ایک تجزیہ

عتیق احمد
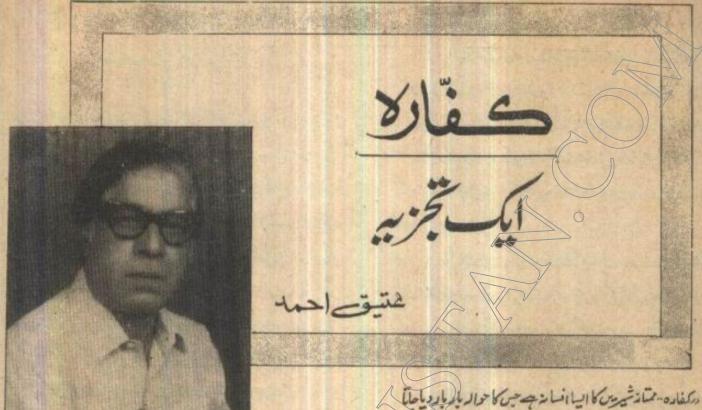
"کفارہ" ممتاز شیریں کا ایسا افسانہ ہے جس کا حوالہ بار بار دیا جاتا ہے ان کی زندگی میں بھی اس افسانے کی بہت سی تاویلات ہوتی رہی ہیں خود انہوں نے اس افسانے کا موضوع "موت" بتایا ہے۔ محمود ایاز نے "میگھ ملہار" پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کو "تلاشِ نجات کا افسانہ" کہا ہے اس ہی تبصرہ میں انہوں نے مظفر علی سیّد کے حوالے سے ایک فقرہ لکھا ہے "یہ زچگی کے بارے میں لکھا ہوا افسانہ نہیں بلکہ اس کا موضوع احساس گناہ ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ سیّد صاحب اس کو زچگی کے بارے میں لکھا ہوا افسانہ مانتے ہیں[1] چونکہ مصنف کی خود اپنی رائے بھی ملتی ہے اس اعتبار سے "کفارہ" کا مطالبہ جتنا دلچسپ ہے اتنا ہی مشکل بھی بہر حال موضوع کا تعین ابتدائی ضرورت ہے۔

افسانے کا مرکزی واقعہ ایک خاتون کے یہاں ولادت سیزیرین آپریشن کے ذریعہ کرائی جاتی ہے غالباً یہی واقعہ اس افسانے کے موضوع کو زچگی متعین کرانے کی طرف توجہ بھی دلاتا ہے۔

اس واقعہ کے ضمن میں کئی ایک اشارے مرکزی کردار کی طرف کئے گئے ہیں۔ مثلاً وہ جسمانی طور پر بے حد کمزور عورت ہے یہ زچگی غالباً پہلی ہے اور شادی کے کافی عرصے بعد ہونے والی ہے ہر عورت کی طرح یہ خاتون بھی ماں بننے کی شدید خواہش مند ہے وہ اپنے خاوند کی بڑی چہیتی بیوی ہے۔ وہ خاوند کو اس کے نام سے نہیں بلکہ "محبت" کے نام سے پکارتی ہے آپریشن خطرناک نہیں ہے مگر خاتون خوفزدہ ہے اور موت اور زندگی کی جنگ اس کے اندر شدید طور پر جاری ہے آپریشن سے پہلے فارم پر دستخط کرنے کا لمحہ دیکھئے۔ "مشیّت کے ہاتھوں نے لکھا اور نقطوں کی لکیر کی طرف اشارہ کیا۔ جبر و قہر کی آواز آئی۔ اس پر دستخط کر دو۔ سیاہی کی گنجان چوڑی پٹی کے نیچے میں نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے دستخط کر دیئے۔ میں نے اپنی موت کے فرمان پر دستخط کر دیئے تھے" خط کشیدہ الفاظ سے موت کا موضوع اخذ ہوتا ہے اور یہی افسانہ نگار کا متعین کیا ہوا موضوع بھی ہے۔

افسانے کے موضوع کے سلسلے میں اوپر دیئے گئے دونوں نظریوں سے ہٹ کر، واقعاتی ڈھانچے کی تہہ میں کچھ زیریں لہریں (UNDER CURRENTS) بھی قابلِ مطالعہ ہیں پہلا مسئلہ افسانے کے عنوان اور متن کا ہے متن سیزیرین آپریشن کی روداد اور مرکزی کردار کی ذہنی کیفیت پر مبنی

[1] چونکہ سید صاحب کا تبصرہ راقم الحروف کی نظروں سے نہیں گذرا اس لئے افسانے کے بارے میں زچگی کے بارے میں میری کسی رائے کو سید صاحب کی بات کا جواب نہ سمجھا جائے (عتیق احمد)

ہے۔ عنوان یعنی "کفارہ" ایک مذہبی فریضہ ہے جو کسی دانستہ یا نادانستہ گناہ کی سزا سے معافی کے لئے کسی نہ کسی شکل میں کوئی بدل ادا کرنے سے پورا ہوتا ہے۔

متن اور عنوان کو ایک ساتھ دیکھنے سے پہلا سوال یہ ذہن میں آتا ہے کہ وہ گناہ کیا ہے جس کا کفارہ دیا گیا ہے؟ اور کفارہ کی شکل کیا ہے؟

پورے افسانے میں ایک ہی واقعہ ظہور میں آتا ہے وہ ہے زچگی یا۔ زچگی گناہ ہے؟ زچگی کس صورت میں گناہ ہوتی ہے؟ نکاح کے انسٹی ٹیوشن کی خلاف ورزی یعنی ناجائز تعلقات کے نتیجے کے طور پر اگر زچگی ناجائز ہے تو آپریشن کفارہ ہوگا۔ لیکن مرکزی کردار والی خاتون سے متعلق جس مرد کو سامنے لایا گیا ہے، یہ خاتون اسے "محبت" کے نام سے یاد کرتی ہے اور آپریشن سے پہلے اس کے دوران میں اور اس کے بعد تک خاتون کا لگاؤ اس مرد سے برابر قائم رہتا ہے ظاہر ہے کہ ناجائز اولاد کے ناجائز باپ کے سلسلے میں ایسے مواقع پر لڑکی کے احساسات دوسرے ہی ہوتے ہیں۔ فریب اور دھوکہ دینے کی بنا پر نفرت کے احساسات معلوم ہوا کہ یہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ افسانے کا ایک ٹکڑا دیکھیئے۔

"جیسے ہی دروازہ کھلا آپریشن تھیٹر کے باہر اذیت وہ انتظار کا اعصابی تشنج ختم ہوا اور وہ اندر داخل ہوئے" اس ہی ٹکڑے سے تھوڑا پہلے یعنی آپریشن تھیٹر میں جاتے ہوئے لمحہ کے تاثرات اس صورت حال کو اور واضح کرتی ہے۔ "اور پھر میں نے محبت کے چہرے کو کھلے ہوئے وسیع دروازوں سے غائب ہوتے دیکھا جو اس کے پیچھے بند ہوگئے۔ یہ آرفیوس کا چہرہ تھا جو روشنی کی دنیا میں غائب ہو گیا۔"

شہنشاہ او ریگیس کا بیٹا، اپالو دیوتا کی دی ہوئی بانسری سے جادو والا فنکار، موسیقی کی دیوی (MUSE) کا شاگرد اور یوری ڈائیس (EURYDICE) کا خاوند آرفیوس جو پیچھے مڑ کر دیکھنے پر اپنی چہیتی بیوی کو کھو بیٹھا تھا، اس افسانے کی مرکزی کردار کا ایسا بدقماش عاشق نہیں ہو سکتا جو ناجائز اولاد کا ناجائز باپ ہو۔ کفارہ کا آرفیوس آپریشن تھیٹر کے بند ہوتے ہوئے دروازے کو پلٹ کر نہیں دیکھتا کہ سارا وہ تھیٹر کے اندر کی خاتون کو بیٹھے دونوں کا رشتہ ظاہر ہے کفارہ کا آرفیوس (جس کا اصطلاحی نام محبت ہے) افسانے کی "یوری ڈائیس" کا خاوند ہے لہٰذا اس صورت میں میاں بیوی کے درمیان کسی گناہ کی کیا گنجائش ہو سکتی

ہے؟ اور کفارہ کس بات کا!

اب آخری صورت رہ جاتی ہے کہ یہ جائز ولادت "گناہ" کیسے بنی؟ اگر گناہ نہیں ہے تو یا تو افسانے کا عنوان "کفارہ" غلط ہے یا عنوان صحیح ہے تو متن غلط ہوگا۔ ہم کسی فنکار سے اتنی بڑی سہو کی توقع کس گمان پر کریں۔ یہ ہونا ممکن ہے۔ ایک مرتبہ پھر افسانے کے واقعاتی ڈھانچے کی تہہ میں انڈر کرنٹس (UNDER CURRENT) کا مطالعہ لازمی ہے۔

افسانے میں ان کہے واقعات کی طرف سب سے اہم اشارہ یہ ہے کہ کوئی صورت ایسی ہے کہ مرکزی کردار کی خاتون عرصے سے بے اولاد ہے اور یہ پہلی زچگی ہے افسانے کا یہ ٹکڑا اس صورت حال کی وضاحت کرتا ہے۔

"روشنی کے ایک دھارے میں میری ننھی "ریشمیں" میرے سامنے آئی نومولود بچے کی شکل میں نہیں بلکہ میرے تصور کی ریشمیں کے پیکر میں گھنگریالے بالوں والی گڑیا گلابی جھالروں کے فراک پہنے مرجھا کر اپنے خوبصورت بالوں کے گھونگر ہلاتی ہوئی ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ لئے ہوئے محبت سے بے قابو ہو کر میں نے اس کی طرف اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ لیکن میری ننھی "ریشمیں" گرینہ پانکلی وہ روشنی کے تخت پر سوار ہو کر آسمانوں میں غائب ہو گئی میری بانہیں خالی رہ گئیں"

اس ٹکڑے کے ایک ایک لفظ میں جذبات کا بھرا سمندر ہے۔ یہ کیفیت کسی ایسی عورت کی ہو سکتی ہے جس کے یہاں اولاد کی چاہت اپنے نقطہ عروج پر ہو۔ خط کشیدہ الفاظ میں خوابوں، ارمانوں آرزوؤں کا خون، زبان حال سے پکار پکار کر انتہائی شدید اور کربناک جذباتی شکست کا اعلان کر رہا ہے آپریشن کا نتیجہ بھی ہمارے سامنے ہے مرکزی کردار کی یہ ذہنی اور جذباتی جنگ عملی طور پر واقع ہو چکی ہے یعنی بچے کی موت اور ولادت ایک ساتھ واقع ہوئی ہے یہ ماں بننے کی شدید خواہش مند عورت کی کھلی شکست ہے ماں جو تخلیق کا سب سے بڑا سمبل ہے ماں جو روئے کائنات پر کی خاتون اول یعنی حوا کی تخلیقی میراث (CREATIVE LEGACY) کی سب سے بڑی اعلیٰ امین ہے اس سے تخلیق کائنات کے رنگوں کا وجود ہے۔ اس سے تخلیق کا بھرم قائم ہے وہ اگر تخلیقی عمل کی انتہائی سرحدوں کو چھو کر بھی خالی ہاتھ لوٹ

خالی گود رہ جائے تو یہ اس تخلیقی خلقت کی سب سے بڑی توہین ہوگی اور وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگتی ہے جرم کے احساس کی آخری منزل انسان کو احساس گناہ کی دلدل میں پھنسا ڈالتی ہے پھر سوسائٹی کے اپنے تقاضے ہیں ہمارے یہاں شادی شدہ عورت کا ماں نہ بننا بڑا گھناؤنا جرم تصور ہوتا ہے اور خود تخلیق کار کے سینے پر بجلیاں گرتی رہتی ہیں "کفارہ" کی مرکزی کردار ذلت، ناکامی احساس جرم اور احساس گناہ کی اس ہی دلدل میں دھنسی ہوئی انتہائی اضطراب کے عالم میں ہست یا نیست (TOBE OR NOT TOBE) کے ویرانوں میں آبلہ پا گھوم رہی ہے یہ سطور دیکھیے (جو آپریشن کے بعد اور بچے کی موت اور ولادت کے بعد کی ہے۔)

"ساری ویرانی اور بنجر پن ساری تنہائی میرے کر اپنے اندر تھی سارا درد اور کرب پھر جاگ اٹھا یہ درد اذیت دہ تھا بہت بہت اذیت دہ"

کردار کی جذباتی اور ذہنی کیفیت میں مکمل تباہی اور شدید ٹوٹ پھوٹ کی ہیبت ناک آواز صاف سنائی دے رہی ہے جس طرح سے گولڈ اسمتھ کی نظم (SWEET AUBURN) میں یہ حقیقت بیان ہوئی کہ جب دیہات کے کسانوں کا جذبۂ زمین پرستی کا غرور ایک مرتبہ تباہ ہو جائے تو دنیا کی کوئی شے اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔

BUT A BOLD PEASANTRY , THEIR
COUNTRY,S PRIDE WHEN ONCE DESTROYED
CAN NEVERBE SUPPLIED ——

بالکل اسی طرح سے عورت کے اندر کا جذبۂ تخلیق اگر ایک دفعہ مجروح ہو جائے تو دنیا کا کوئی جتن اس کا بدل تلاش نہیں کر سکتا۔ افسانے کے کلائمیکس اور مائنٹی کلائمیکس کا لمحہ بھی دیکھیے۔

"زمین سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ لیکن زمین کے بطن سے کوئی زندگی نمودار نہیں ہوئی زمین کا بطن مضبوطی کے ساتھ بند کر دیا گیا اس پر زندگی کا راستہ بند کر دیا گیا"

خط کشیدہ لفظ کیا کہتے ہیں؟ مستقبل میں تخلیق کے تمام امکانات ختم ہونے یہ شدید احساس ندامت کی گھڑی ہے احساس جرم گناہ کی دلدل میں دھکیل دیئے جانے کی گھڑی ہے۔ یہ خاتون اپنے آپ کو اپنی صنف اور انسانیت کا گناہگار سمجھ رہی ہے اور ہمارے معاشرے میں عورت کی MANUFACTURING MACHINE والی حیثیت کے پیش نظر اس کے علاوہ یہ مصیبت زدہ عورت اپنے آپ کو کیا سمجھے؟ ناکامی کے بعد خود مجرمی کا احساس کتنا شدید ہوتا ہے؟ یہ ہم جانتے ہیں آدمی اپنے ہم عصروں اور ہم عمروں کی نگاہوں میں مجرم اور گناہگار بن کر رہ جاتا ہے۔ اس صورت کا مداوا صرف کفارہ ہے چنانچہ اب "کفارہ" کی مرکزی کردار کو آخری بار اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ دیکھیے یہ کفارہ کیا ہے اس کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟۔

مزید واقعات پر نظر ڈالیے تو یہ مرکزی کردار آپریشن کے بعد بچ جاتی ہے اور متوقع بچہ پیدائش کے ساتھ ہی مر جاتا ہے کیا یہ مردہ زندگی ریہ زندگی جو معرض وجود میں آتے ہی کالعدم ہوگئی) اس زندگی یعنی ماں کا کفارہ ہے جو موت کے منہ سے واپس آئی ہے یہ پہلو اہم ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تصور غلط ہے کوئی ماں اپنی اولاد کو اپنے کسی بھی "گناہ" کے کفارے میں پیش نہیں کر سکتی۔ تو پھر؟ پھر بات بالکل سیدھی ہے اس خاتون نے (ہر شادی شدہ عورت کی طرح) ماں بننے کی خواہش کی نہ صرف یہ کہ خواہش پوری نہیں ہوئی بلکہ وہ اس کا وجود "موت" کو جنم دے کر موت کے ہم معنی بن گئی۔ یعنی بانجھ یعنی بنجر یہی بانجھ ہو جانا دراصل کفارہ ہے زندگی کو جنم دینے کی خواہش کا۔ اور یہ خواہش اس خاتون کے بانجھ ہو جانے کے بعد اس کا گناہ بن گئی اور گناہ کا کفارہ اسے دینا پڑا۔ اب ان الفاظ کو مربوط کر کے پڑھیے۔

"زمین کے بطن سے کوئی زندگی نمودار نہیں ہوئی۔ زمین کا بطن مضبوطی کے ساتھ بند کر دیا گیا۔ اور اس پہ تمام زندگی کا راستہ بند کر دیا گیا سارا درد اور کرب پھر جاگ اٹھا یہ درد اذیت دہ تھا۔ بہت بہت اذیت دہ . . ."

یہاں تک پہنچنے کے بعد افسانے کے اصل موضوع کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں۔ اس کا موضوع "بانجھ پن" سمجھ میں آتا ہے۔ بانجھ پن جو خود کفارہ ہے گناہِ تخلیق یا تخلیق کی خواہش کے گناہ کا۔

یہ سوال اہم ہے کہ ممتاز شیریں نے اس سیدھی سادی سی بات کو خود اسے موت کا افسانہ کہہ کر کیوں الجھا لیا ہے؟ وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہیں کہ ہم ان سے مزید سوالات کر سکیں۔ ۲

البتہ ذہن اس طرف ضرور جاتا ہے کہ "موت" زندگی کی نفی کا دوسرا نام ہے بانجھ پن بھی زندگی اور تخلیق کی نفی کرتا ہے اس لئے ممکن ہے کہ بانجھ پن کو انہوں نے ABRUPTLY لفظ موت سے ادا کیا ہو صورت احوال کچھ بھی کیوں نہ ہو اس سوال سے زیادہ اہم ایک اور سوال ہے کہ ایک سیدھی سادی تقسیم کو ان الجھنوں سے گذار کر ممتاز شیریں کیا حاصل کرنا چاہتی تھیں؟

اس سوال کے دو رخ ہیں ایک پہلو افسانہ نگاری کا فن ہے اور دوسرا مقصدیت ان دونوں باتوں کو علاحدہ علاحدہ سمجھنا ضروری ہے۔

سوال کے پہلے رخ کا مفہوم یوں بنتا ہے کہ کیا ممتاز شیریں نے محض فنکاری دکھانے کے لئے ایسا کیا ہے؟ یہ تخلیق کے فن کا ایک بنیادی مطالبہ ہے کہ مقصدیت کے ساتھ ساتھ اگر بات فنی معیار سے گری ہوئی ہو تو بات تو کسی بھی پیرائے میں کہی جا سکتی ہے اسے فن کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

افسانے کا موضوع متعین کرتے ہوئے ہم ابھی یہ دیکھ چکے ہیں کہ اس کے بنیادی نکتے دو ہیں یعنی تخلیق اور بانجھ پن دونوں باتوں کو ملائیے تو بات تخلیق کے بانجھ پن" تک پہنچتی ہے ماں کا بانجھ پن، زمین کا بانجھ پن کائنات کا بانجھ پن ہمارے اپنے دور کا بانجھ پن یہ سب مترادفات ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں۔ ماں زمین کائنات، انسانی تہذیب کے کسی بھی دور کا بانجھ پن اس لئے کہ ماں، زمین، کائنات اور دور (زمانہ) سب کا مفہوم تخلیق کے بغیر ادھورا رہ جاتا ہے اور یہ ادھورا پن کفارہ ہے کسی ایسی خواہش کا جو پوری ہو جانے پر بھی ادھوری رہے اور گناہ کا ہم معنیٰ بن جائے تو گویا ممتاز شیریں نے اس افسانے کی مدد سے ہمیں یہ احساس دلایا ہے کہ ہمارا عہد ہر زاویئے سے ماں کے زاویئے سے زمین کے زاویئے سے، کائنات کے زاویئے سے، عہد موجود کے زاویئے سے۔ بانجھ پن اور بنجر پن کا عہد ہے!

افسانے کا یہ موڑ اہم ہے اور اس پر ہمیں پورے انہماک سے سوچنا ہے۔

"کفارہ" کی مقصدیت یہی ہے۔ یہ ہمارے عہد کا بے حد اہم پہلو ہے کہ ہمارا عہد اپنے ماضی کے مقابلے میں کتنا زرخیز ہے ممتاز شیریں کو یہ شک کیسے ہو کہ ہم ایک [illegible] بانجھ عہد میں [illegible] رہے ہیں؟ انسان رفتاً فوقتاً تخلیق کاری سے کیوں عاجز ہے؟

اس سوال کے جواب میں میرا ذہن ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ (WASTELAND) کی طرف جاتا ہے۔ ویسٹ لینڈ میں ایلیٹ نے اس عہد کو SETERILE کا نام دیا ہے۔ یعنی تخلیق سے ایک دم عاری انتہا درجے کا بنجر پن جس میں گھاس کا ایک ہرا تنکا بھی نہ اگ سکے اور WE ARE THE HOLLOW MEN میں اس عہد کے انسان کی زبان سے اس کو HALLOW STUFFED MEN کہلوایا ہے ممتاز شیریں بھی اس افسانہ کی مدد سے یہی کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ یہ الفاظ دیکھئے۔

"زمین سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ لیکن زمین کے بطن سے کوئی زندگی نمودار نہیں ہوئی۔۔۔ ساری زمین اجاڑ اور بنجر تھی ایک ویرانہ خرابہ سے کہ چاروں طرف تنہائی اور سنسان ویرانی تھی اس ویران خرابے کی وسعتوں میں میں بچھڑی ہوئی۔ بے مقصد گھوم رہی تھی۔"

افسانے کے مفہوم میں زمین سے مراد ماں کی کوکھ ہے اور یہ ویرانہ ANESTHESIA کے زیر اثر مرکزی کردار کی وہ آزاد شعوری روح ہے جو اس کے جسم کو چھوڑ کر خلاؤں میں محو سفر ہے یہ افسانہ بلاشبہ استعاراتی زبان (ALLEGORICAL) ہی ہے اس استعارہ کی زبان کو DECODE کیجئے تو بات بدل کر واضح ہو جاتی ہے اس طلسم کا اسم اعظم اوپر دی ہوئی سطروں کے آخری چند لفظوں میں ہے "اس ویران خرابے کی وسعتوں میں بچھڑی ہوئی بے مقصد گھوم رہی تھی" بات تخلیق انسان کے مقصد اس زمین پر اس کی بے مقصد آوارگی کی ہے یعنی زندگی کا مفہوم اور مقصد گم ہو جانے کی طرف اشارہ کیا یہ بات صحیح ہے؟

موت اور زندگی۔ تخلیق اور بانجھ پن کی کش مکش پورے افسانے پر حاوی ہے موت کا اضطراب اس سے خوف، تاریکی کی ابدیت میں گم ہو جانے پر اظہار وحشت زندگی کی روشنی پر فرحت سے زیادہ ضرور دان سارے احساسات اور جذبات کی UNDER-CURRENT ایک ایک لفظ کی [illegible] اور [illegible] سے [illegible] کی تقاضت

ا۔ یہ [illegible] بھی [illegible] کر [illegible] زندہ [illegible] سے [illegible] ان سے پوچھتے ہی [illegible] یہاں کے قارئین اپنے ادیبوں سے یہ واسطہ رکھتے ہی نہیں (علیق احمد)

ہمت اور بہادری کا ذکر بالاصرار کیا ہے مثلاً آپریشن کرنے والے ڈاکٹر کے
یہ الفاظ "بیٹے! اس پورے وقفے میں تم نے بڑی ہی بہادری سے کام لیا ہے اور
ہم سے پورا پورا تعاون کیا ہے تمہیں صورت حال کا صحیح شعور ہے اور اس
صورت حال پر قابو پانے کے لئے جو ارادے کی قوت چاہیئے وہ بھی تم میں موجود
ہے لیکن جس اضطرار اور اضطراب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کو صرف
داستانی یا ذہنی تسکین کا نکال کر دیکھا جائے اور جس وسیع پیمانے پر ALLEGORY
کا استعمال کر کے افسانے کو آفاقیت دی جانے کی کوشش کی گئی ہے وہ مجروح
ہوتی ہے یہ ذہن کار کے عجز کا اعلان ہے اس اعلان کو ڈاکٹر کی اوپر دی گئی ہے بات
کا ایک فقرہ بالکل واضح کر دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ "خطرے کو بڑھانے والی
چیز تو خوف اور لاعلمی ہوتی ہے۔" کردار کے اندر بنجر پن کا خوف اور
"ابدیت" سے لاعلمی دونوں موجود ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

اس بات کا جواب افسانے میں اساطیری FIGURES کے استعمال
سے سمجھ میں آتا ہے ایک ذاتی المیہ (بانجھ پن) کو اساطیری فضا سے اور دیوی
دیوتاؤں سے اساطیری FIGURES سے اور مذہبی عبادت گاہوں سے
متعلق کر دینے کا عمل محض زیب داستان کے لئے نہیں ہے ممتاز شیریں
نے "کفارہ" کی آفاقی اور مذہبی تاریخ کا دامن بلا وجہ نہیں پکڑا ہے اس
سارے افسانے میں ایک نفس مطمئنہ کی تلاش کا عمل بھی جاری ہے۔

"مجھے شہادت کی آرزو نہیں
مجھے آخری دید کی تمنا نہیں
مجھے صرف نفس مطمئنہ بخش دے"

نفس کی عدم اطمینانی کردار کے اندر بنجر پن کا احساس ہے نفس مطمئنہ
کی خواہش اس بنجر پن کا نعم البدل ہے افسانے مواد کے ساتھ تمثیلی برتاؤ
(ALLEGORICAL TREATMENT) کو سامنے رکھئے تو بنجر پن
انسان کے اندر "حی علی خیر العمل" کی پکار اور تاکید سے روگردانی کے سبب
ہے ممتاز شیریں نے اس چھوٹے سے افسانے میں دنیا بھر کے مشرق سے مغرب
تک اساطیری FIGURES کو جمع کر دیا ہے لیکن وہ رکاوٹ جو
مرکزی کردار کی راہ میں اچانک پہاڑوں کے نمودار ہو جانے سے پیدا ہوتی
ہے اس کو صرف ایمان کا جذبہ ہی پار کرتا ہے یہ سطریں دیکھئے۔
"ناقابل یقین طور پر معجزانہ طور پر میں نے یہ دیوار پار کر لی

اپنے آپ کو دیوار کی دوسری طرف پایا۔ اور یہاں پھیلی ہوئی کھلی زمین
کے بجائے بھول بھلیوں کی طرح کے راستے تھے میں ان راستوں
میں گم ہو گئی" یہ راستے اساطیر کے راستے ہیں اور معجزانہ طور پر
جس طرح سے یہ پہاڑ عبور کئے گئے تھے اسی طرح اس فضا سے نکلنے
کا حال بھی سن لیجئے۔

"ہوا میں تازگی تھی، میرے ارد گرد روشنی تھی...... سفید مرمری گنبد
مرمر کے ستون پھیلی ہوئی محرابیں، شفاف فانوس، یہ یقیناً آباد شاہی
مسجد تھی ان جانی اور اجنبی راہوں پر بھٹک کر میں گھر لوٹ آئی تھی
مرکزی قصبے کے نیچے میں گر گئی اور خشوع اور خضوع سے نماز پڑھنے
لگی۔ میرا سارا وجود ایک عجیب اور انوکھی مسرت سے لبریز تھا۔ بالآخر
مجھے سکون مل گیا"

افسانے پر یہ فضا مکمل طور پر طاری رہتی ہے اس حصے کو پڑھ
کر بار بار مجھے BUNYAN کی PILGRIM'S PROGRESS یاد آتی رہی، وہی
CELESTIAL ماحول ہے مواد کا برتاؤ بھی اسی انداز کا ہے
وہاں بھی شکوک و شبہات کے پہاڑ ہیں۔ یہاں بھی ہیں وہاں بھی عمل
خیر ان کانٹوں کو دور کرتا ہے۔ یہاں بھی شاہی مسجد کے مرکزی
قصبے کے نیچے نماز راہ راست پر لاتی ہے BUNYAN
کا تھیم بھی نفس مطمئنہ کی تلاش ہے اور ممتاز شیریں کی تھیم بھی کا ایک
جزو ہی ہے۔

آخری تجزیے میں یہ افسانہ عہد حاضر کے روحانی بنجر پن کا افسانہ
ثابت ہوتا ہے انسان نے اس کائنات کو بنانا اور سنوارنا چاہا۔۔ تو
شب آفریدی چراغ آفریدم یہ تخلیق اور تخلیق کی جنگ ہے ایک
اس وقت کی تخلیق جو مذہبی اداروں میں ایمان بالغیب کے سہارے
قائم و دائم ہے اور دوسری (اعلیٰ تخلیق کی تخلیق یعنی انسان کی تخلیق) — "چراغ
آفریدم۔ لیکن ممتاز شیریں کو اس چراغ کی روشنی ابدیت کی تاریکی کے
مقابلے میں بھی زیادہ تاریک نظر آتی ہے یہ دوسری تاریکی وہ بنجر پن
ہے جو انسان کی خواہش تخلیق (بلکہ گناہ تخلیق) کا کفارہ ہے ممتاز
شیریں اگر آج ہمارے درمیان ہوتیں تو ان سے ایک بالواسطہ
سوال کرتا مگر اب یہ سوال بے سود ہے اور ان کی یاد میں اس موقع

پر وہ ان پوچھا سوال کر کے ہیں ان کے قارئین اور ان کے نقادوں
کا دل نہیں دکھانا چاہتا۔ یہ بات پھر کبھی سہی تاہم یہ سوچا جا سکتا ہے کہ
آپریشن کے دوران ANES THESIA کے زیر اثر مرکزی
کردار کا "روحانی سفر" اور ساطیری واسطوں سے ہوتا ہوا مذہب
(شاہی مسجد کے قبے میں نماز اور سکون) ہمارے اپنے عہد کے حوالے
سے کیا مطابقت رکھتے ہیں۔ کیا ممتاز شیریں یہ نہیں کہنا چاہتیں کہ دور
حاضر کا انسان مادی ترقی کے ANES THESIAN اثرات
کے تحت اندر سے بنجر ہے اور انسانی تاریخ کا پورا سفر بالآخر
ISTITUTION OF PELIGION میں پناہ گزیں ہو سکتا ہے
شاید افسانہ لکھتے لکھتے انہیں "لکم دینکم ولی دین" یاد آ گیا ہوگا۔ ایک
بار پھر ان الفاظ کو دیکھیے کہ وہ کس طرح سے اپنا مفہوم بدل رہے ہیں

ان جانی راہوں (یعنی یونانی ساطیری ہندو مت کی اساطیر
گوتم اور یسوع مسیح کی بتائی ہوئی راہ نجات) پر بھٹک میں گھر لوٹ آئی
تھی (یہ گھر یقیناً بادشاہی مسجد ہے) مرکزی قبے کے نیچے میں سجدے
میں گر گئی اور خشوع اور خضوع سے نماز پڑھنے لگی۔ میرا سارا وجود
ایک عجیب اور انوکھی مسرت سے لبریز تھا۔ بالآخر مجھے سکون مل گیا
ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ... میں گویا زمان و مکاں سے گزر کر
ابدیت میں داخل ہو رہی تھی... تمام وقت ازلی اور ابدی
"حال" ہے.. مختصر یہ کہا جا سکتا ہے تمام "حال" مادیت کے
ANES THESIA کے زیر اثر گمراہ اور بے حال ہے —— •

ممتاز شیریں بڑی وسیع المطالعہ مشہور ہیں (اور اس میں مجھے
کوئی شبہ بھی نہیں ہے کہ ایسا نہیں تھا) وہ انگریزی اور دوسرے یورپی
ادب بلکہ شاید عالمی ادب پہ گہری نظر رکھتی تھیں وہ ہمارے اپنے عہد کی
فنکاری اور اپنے دور کا بعض کوئی فنکار اس کے جدید تقاضوں
سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ فن افسانہ نگاری کے اصولوں تکنیک اور
تجربوں کے جدید ترین رجحانات سے ممتاز شیریں ہرگز بے خبر نہیں
تھیں وہ ہر اعتبار سے جدید نسل نہیں تو جدید ذہن کی افسانہ نگار تھیں
ان کے اکثر افسانے پڑھ کر ہمیشہ میرے ذہن میں اپنی اس جدید نسل
کا تصور ابھر رہا ہے کہ کوئی نہایت الٹرا موڈرن لڑکی میکسی میں ملبوس
گلے میں ہزاروں منکوں کا ہار ڈالے جنا ہماری بنی ہوئی جدید ترین
میک اپ سے راستہ، جدید ترین ہیر اسٹائل میں بنوائے ہوئے کسی
ایسی محفل میں میلاد اکبرا اکبر وارق والا جھوم جھوم کر پڑھ رہی ہے جہاں
بے سینکڑوں قدامت پسند بیبیاں آڑے پجامے سوسی کی کرتیاں
اور موٹے موٹے ڈوپٹے تین تین تہہ کئے ہوئے سر اور ناک کے اوپر
تک کا حصہ ڈھانپے ہوئے صرف آنکھیں بے پردہ کئے ہوئے بیٹھی
جھوم رہی ہوں، نئی نسل کی یہ دو رنگی انتہائی مذہب پسند ہونے
کے باوجود خارجی عادات و اطوار میں اخلاق اور عمل میں شدید کھوکھلی
اور غیر تخلیقی نسل ہے مگر ان کے بزرگ خوش ہیں کہ وہ اللہ والوں کی
اولادیں ہیں۔ ممتاز شیریں نے ہم آپ سب کو پورے کرۂ ارض
کے انسانوں کو اسی رنگ میں دیکھا ہے اور وہ خوش ہیں کہ اس
طرح کے عمل سے بالآخر پوری کائنات کے انسانوں کے دل ایک عجیب
اور انوکھی مسرت سے لبریز ہو کر ان ہی کی طرح سکون حاصل کر سکتے
[illegible] میں یہ بات یوں بنتی ہے کہ اس مادی دنیا کے
[illegible] انسان کی وہ تمام تخلیقی خواہشات
جن کو بروئے کار لا کر وہ اپنی دنیا کو [illegible] سنوارنا چاہتا ہے وہ سب
بالآخر کفارہ بن جائے گا اس کی اس تخلیقی خواہش کے گناہ کا اس لئے
کہ ایسے یہ سارے اعمال یوم آخرت کو ملنے والے نامۂ اعمال میں
گناہ کے طور پر لکھے ہوں گے۔

ہماری پوری کی جدید دنیا کے افراد کا یہ
حال ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو جیسا کہ ممتاز شیریں سمجھتی رہیں، لیکن مقامِ
فکر یہ ہے کہ کیا تخلیقِ کائنات کا یہ تمام "ہنگامہ" (بقول غالب
ہنگامہ اسے خدا کیا ہے) کہیں اس کے خالق کے لئے ہی تو کفارہ کی
حیثیت میں تبدیل نہیں ہو جاتا... مگر چھوڑیے ممتاز شیریں جس
جہاں کی باتیں کر رہی ہیں اس کے متعلق یہی کافی ہے۔

مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

موضوع مواد اور اس کے ساتھ برتاؤ کے اس تجزیے کے بعد
افسانے کے فنی پہلو پر ایک نگاہ ڈالنا رہ جاتی ہے یوں تو جستہ جستہ
حسب ضرورت اشارات کر دیئے گئے ہیں اب صرف ان کا اعادہ

باقی ہے۔

افسانہ تمثیلی تکنیک میں لکھا گیا ہے ازل اور ابد سے موضوع کو متعلق کر دینے کا کام کچھ عالمی اساطیری FIGURES سے لیا گیا ہے کچھ عبادت گاہوں کے تذکروں سے کچھ یسوع مسیح کے حوالوں سے کچھ گوتم کی نروانی ریاضت کے حوالوں سے اور باقی اور آخری کام شاہی مسجد کے قبے کے نیچے نماز کی ادائیگی نے خالص فنی اعتبار سے یہ طریقہ کار کامیاب رہا ممتاز شیریں کا نام ہی ان کی کامیابی کے لئے کافی تھا۔ افسانہ نگار کی گرفت اپنے موضوع پر مضبوط اور فنکارانہ بھی ہے۔ ممتاز شیریں نے وشنو کے دودھ ساگروں کو متھ کر آبِ حیات نکالنے کے عمل کا بھی حوالہ دیا ہے میں ممتاز شیریں کے اس افسانے میں ان کے کمال فن کو بھی وشنو کا عمل ہی سمجھتا ہوں انہوں نے بھی افسانے میں دنیا بھر کے مواد کو بڑی چابکدستی سے متھا ہے ممتاز شیریں کا یہ "آبِ حیات" وہ معجزے ہیں جو انہیں مادی علائق کے پہاڑ اور دیواروں کو پھلانگنے میں مدد دیتے ہیں ایمان بالغیب اور عقیدوں کی وہ "توانائی" ہے جو انہیں نفسِ مطمئنہ کی تلاش میں جان لیوا ہم جوئی میں ——

—— "تازہ دم" دکھتی ہے افسانہ ایک مخصوص پیٹرن PATTERN کا افسانہ ہے وہ پیٹرن جسے محمد حسن عسکری نے صاحب بہشتی زیور کی شاعری میں کم و بیش چالیس برس کے (یہ عرصہ یوں بھی پیغمبری پر فائز کرا دینے میں شاید عسکری صاحب کے پیش نظر رہا ہو) ادبی مشق و مزاولت کے بعد دریافت کیا ممتاز شیریں اور حسن عسکری کے فنی میڈیم (یعنی تنقید اور افسانہ نگاری) کے فرق کو سامنے رکھیے۔ حسن عسکری نے شعر و ادب کی پوری "روایت" کو دو ٹوک بیان کر دیا۔ ممتاز شیریں نے اپنے اظہار بیان پر فنکاری کے دبیز پردے ڈالے ہیں صاحبان ایمان و ایقان کو ان پردوں کے پیچھے جھانکنے کی فرصت کم ہے یہ کام تو ہم ایسے دنیا دار قسم کے "معیب جویوں" کا ہے۔

ممتاز شیریں کا فن کتنا کامیاب ہے؟ ان کا فنی نقطۂ نگاہ کتنا صائب ہے یہیں بالراست کوئی بات کہے بغیر آج کے "داستان گو" افسانہ نگاروں کے جگری "نقاد دوستوں" کے لئے گنجائش چھوڑ دیتا ہوں، وہ جانیں اور ان کا کام جانے، رہ گیا سوال مجھ ایسے دنیا دار مادیت پسند قاریوں کا مسئلہ وہ ہم جانیں۔ "جگری دوست نقادوں" سے البتہ یہ گذارش ہے کہ وہ دنیا داری کے معاملات میں الجھنے کی کوشش نہ فرمائیں!

تم بھو ٹیا سے یہ کیا جانو۔

مظفر علی سیّد

منٹو
ممتاز شیریں کی نظر میں

"لوگ کتابوں کو نہیں سمجھتے جب تک کہ ان کو تھوڑا بہت زندگی کا تجربہ حاصل نہ ہو۔ بہرحال کوئی آدمی کسی گہری کتاب کو اس وقت تک سمجھ نہیں پاتا جب تک کہ اس کے مشمولات کا کم سے کم ایک حصہ اس کے سامنے اور خود اس پر گزر نہ جائے۔ کتابوں کے خلاف تعصب اُن لوگوں کی حماقت کو دیکھ کر پھیلا ہے جنہوں نے محض کتابیں پڑھی ہیں۔" ایذرا پاؤنڈ: مطالعے کی الف بے

مولوی عبدالماجد دریاآبادی سے لے کر جناب افتخار جالب تک جتنے بھی لوگوں نے منٹو کے بارے میں لکھا ہے ان میں مرحومہ ممتاز شیریں کا نام اور نام سے زیادہ کام، سب سے زیادہ اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔

ایک وجہِ امتیاز تو یہی ہے کہ انہوں نے منٹو پر جم کے لکھا ہے جس کا محض یہ مفہوم نہیں کہ انہوں نے متعدد مقالات اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر قلم بند کئے ہیں (اگرچہ یہ بھی کسی کو کرنا ہی چاہئے تھا) بلکہ یہ بھی کہ اس سلسلے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے کسی قدر محویت اور ذمہ داری کے ساتھ لکھا ہے۔ ہمارے یہاں تنقید اتنے اوپری دل سے لکھی جاتی ہے کہ جو کچھ بھی کسی قدر یکسوئی اور تسلسل کے ساتھ لکھا جائے غنیمت محسوس ہوتا ہے مگر اس سلسلہ مضامین کی کیفیت اس سے کچھ زیادہ ہے یہاں نقاد نے تخلیقی فنکار کے رویّے میں تھوڑا بہت اپنے آپ کو بھی شامل کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے تنقیدی منصب سے دست بردار ہونا بھی گوارہ نہیں کیا۔ اردو تنقید میں اپنے موضوع کے ساتھ ایسی قربت و مناسبت عام ہے نہ ایسا احساس ذمہ داری۔

ہمارے یہاں ذمہ داری کا مفہوم عام طور پر اجارہ داری سے مختلف نہیں ہوتا اسلئے ہمارے تعلیمی نظام اور ادبی ماحول پر سوار پیرانِ تسمہ پا سے زیادہ ذمہ دار کسی کو سمجھا جاتا ہے تو ان لوگوں کو جنہوں نے فکر و خیال کی تمام ترقی اور اجتماعی ذمہ داریوں کی جملہ فہرست کو بلا شرکت غیرے اپنی جاگیر بنا رکھا ہے چاہے یہ لوگ اپنی پیشانیوں پر ترقی پسندی کا لیبل لگا لیں یا کوئی دوسرا اسائن بورڈ سجا کے بیٹھ جائیں ان کے یہاں نہ تو اس حریتِ فکر کا سراغ ملتا ہے جو بین الاقوامی تحریکوں میں لازماً موجود ہوتی ہے نہ وہ مضبوط تہذیبی بنیاد کہیں نظر آتی ہے جس کے بغیر حاضر و ناظر بڑی طاقتوں کے نفوذ اور مفادات کے مقابل تیسری دنیا کی تعمیر ممکن ہی نہیں۔ ممتاز شیریں کی ذمہ داری ان لوگوں کے مقابلے میں ایک علمی، ادبی اور تکنیکی ذمہ داری ہے۔ افسانے کا فن ان کے فکر و احساس کا محور ہے اور اس کی مختلف شکلوں اور عصری تقاضوں سے جدائی ان کو کسی وقت بھی قبول نہیں۔ ساتھ ہی عصری تقاضوں کے نام پر ہنگامی ضرورتوں اور وقتی فیشنوں کا شکار ہو کے رہ جانا بھی ان کو گوارا نہیں۔

چنانچہ منٹو کو بھی انہوں نے آسانی کے ساتھ کسی جلدی میں پکڑ کے آنکھوں سے نہیں لگا لیا۔ آزادی سے پہلے جب منٹو بمبئی کی زیر زمین دنیا میں اپنے تجربات کر رہا تھا اور ممتاز شیریں بنگلور میں صمد شاہین کے ساتھ نیا دور نکالنے میں مصروف تھیں تو ان دونوں کے درمیان فاصلہ ہی فاصلہ تھا یہاں تک کہ پاکستان بننے کے بعد جب کراچی سے نیا دور نکلا تو اس کے لکھنے والوں نے پہلی بار منٹو کا نام اس میں دیکھا اور وہ بھی کیسے ! جناب محمد حسن عسکری کا منٹو کے بارے میں ایک پورا مقالہ اب کی بار اس میں شامل تھا۔ ظاہر ہے آن علمی معاندین کو حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا کہ ممتاز شیریں اور نیا دور کی یہ کومٹ منٹ ان کے گمان سے باہر تھی۔

" نیا دور" کے علاوہ اس تبدیلیٔ منظر کا سراغ خود ممتاز شیریں کے مجموعہ مضامین "معیار" سے بھی مل سکتا ہے۔ اس مجموعے کا پہلا اور ادب کے اس دور کا ایک اہم مقالہ "تکنیک کا تنوع" منٹو کے ذکر سے یکسر خالی ہے جبکہ سینکڑوں مغربی اور بیسیوں مشرقی افسانہ نگاروں اور ان کی تخلیقات کا حوالہ اس میں موجود ہے اردو کے بھی متعدد قصہ نویس اور ان کی تحریریں مختلف افسانوی تکنیکوں کی مثال کے طور پر اس مقالے میں زیر بحث آتی ہیں مگر کیا یہ حیرت کا مقام نہیں کہ اردو زبان کے معتبر دو افسانہ نگار عصمت اور منٹو اس طویل و بسیط مقالے میں ذرا سی جگہ بھی حاصل نہیں کر سکے اور ان میں سے ایک افسانہ نگار اتفاق سے وہی ہے جسے بعد میں خود ممتاز شیریں نے "معیار" کے آخری مضامین کے علاوہ ایک مستقل (مگر نا تمام) کتاب "نوری نہ ناری" کا موضوع بنانا پسند کیا !

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہماری زبان کے دو اہم لکھنے والوں کے درمیان اتنی بڑی خلیج کیوں حائل تھی ! اور تھی تو کیا وقت نے اپنے آپ ہی اس کو پاٹ کے رکھ دیا ! کہیں کسی داخلی خارجی یا دونوں قسم کے محرکات کا دخل اس سلسلے میں تو نہیں تھا !

آسان بات تو یہ ہے کہ تغافل اور توجہ دونوں قسم کے رویوں کو جیسا کہ دستور ہے "غیر اہم" قرار دے کر موضوعِ گفتگو ہی نہ بنایا جائے دقت فقط اتنی ہے کہ منٹو یا ممتاز شیریں یا دونوں کو آپ کچھ نہ کچھ اہمیت دیتے ہوں تو یہ سوال اٹھے گا تو سہی — وقت کے سر بھی یہ تبدیلی مڑھی جا سکتی ہے جبکہ ہمارے دور کے جملہ عمرانی علوم اپنی تمام تر اصطلاحات کے ساتھ ایک نئی قسم کی جبریت مروّج کرنے کے لیے بکثرت استعمال ہوتے ہیں اور ہم ہر تبدیلی کو خصوصاً جبکہ وہ ایک واضح شکل میں ہمارے سامنے آ چکی ہو اسباب و علل کا ایک لازمی نتیجہ اور ارتقائے معاشرت کا ایک مرحلہ سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ خارجی محرکات میں دونوں کی پاکستان کو ہجرت اور جناب محمد حسن عسکری کے مقالے کی اشاعت کا شمار ہو سکتا ہے، جیسا کہ میں نے بھی کیا ہے۔ مگر کیا ممتاز شیریں کو یہ تبدیلی دل سے قبول نہیں تھی ! اور قبول تھی تو پہلے کس قسم کا داخلی رویہ اس کے راستے میں حائل تھا ؟

ایک انٹرویو میں ممتاز شیریں نے منٹو کی طرف اپنی منفصل توجہ کا یہ جواز فراہم کیا ہے :-

> "منٹو ایک سچا اور بے باک فنکار تھا' ایک آگ تھی جس میں وہ مسلسل تپتا رہتا تھا)۔ منٹو کے افسانوں میں بلا کی جان ہے اور ان کا تاثر ہر سطح کے پڑھنے والے قبول کرتے ہیں۔ یوں تو میں نے بہت سے افسانہ نگاروں کا اپنے مضامین میں جائزہ لیا ہے (یہاں یہ حاشیہ لگانے کی ضرورت ہے کہ ایک مدت تک منٹو کا جائزہ تو کیا' اس کا نام بھی نوکِ قلم تک آنے نہیں دیا) لیکن منٹو پر ایک کتاب لکھنے کا خیال اس لیے آیا تھا کہ میری نظر میں منٹو ہمارا نمائندہ اور بہترین افسانہ نگار ہے"۔

"ہمارا نمائندہ اور بہترین" اور "خیال آیا تھا" — یہ الفاظ منٹو کے حق میں نہیں جاتے۔ نمائندہ کہنے کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اردو زبان میں اسی قسم کے افسانے لکھے جاتے ہیں جیسے منٹو نے لکھے ہیں اور بہترین کے بین السطور شاید یہ بات ہو کہ منٹو کو عالمی معیار کا ادیب کہنا تو مشکل ہے' بس ہمارے یہاں اس نے دوسروں سے اچھا لکھا ہے تو مجبوری ہے' اس سے بہتر ادیب کہاں سے نکال کر بحث کا موضوع بنائیں۔ مگر کیا منٹو کو ایک سچا' بے باک اور جاندار لکھنے والا قرار

دینا ایک مثبت اقدام نہیں تھا؛ جبکہ نمائندہ اور بہترین کہنے میں وہ مربیانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے جو مغربی ادب کو اوڑھنا بچھونا بنانے والے اردو ادب کے سلسلے میں روا رکھتے ہیں۔ پھر اپنی کتاب کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کا خیال کس طرح آیا، بدگمانی میں اور بھی شدت پیدا کرتا ہے۔ شاید ان الفاظ کی ایک دوسری تاویل بھی ممکن ہو گر منٹو کے بارے میں ممتاز شیریں کا انداز سرپرستانہ لگنے لگے تو بڑی تکلیف کی بات ہے۔ اردو ادب میں ان کا سب کچھ نہ سہی بہت کچھ داؤں پر لگا تھا اور جب آپ نے اتنا کچھ داؤں پر لگا رکھا ہو تو لہجے میں ذرا اصرار تو ہو۔

پھر بھی ہمارے ادبی ماحول کی ٹریجیڈی یا کامیڈی ملاحظہ ہو کہ ممتاز شیریں کے یہ مشفقانہ کلمات بھی بعض لوگوں کو بہت بڑا لگے محسوس ہوتے۔ ترقی پسندوں کو اس کے پس پردہ کرشن چندر کی تحقیر نظر آئی اور ہلے کر مفرا جناب الطاف گوہر کو خدا جانے کس کی پہنچا سرکاری، غیر سرکاری مطبوعات میں ایسے مقالے شائع ہوتے جن کا مقصد اول و آخر بس اتنا تھا کہ منٹو کو اردو کا بہترین افسانہ نگار قرار دینا "ایک اور صنم" تراشنے کی کوشش ہے حالانکہ بقول عسکری منٹو کا پیغام تھا کہ مجھ سے بھی آزاد ہو۔

بہر حال کوئی منٹو سے آزاد ہو یا اس کا گرفتار، ہمارا سروکار تو یہی ہوگا کہ ادب، تہذیب اور زندگی کے بارے میں اس کو بطور خود کیا کہنا ہے اور اس بطورِ خود کہنے والی بات میں منٹو کا فن اور پیغام کہاں سے آ کر داخل ہوتا ہے اور خود اس کے لیے منٹو کا کمال کوئی معنے رکھتا ہے کہ نہیں۔ نہیں رکھتا تو بھلے کو نہ رکھے، یہ تو پتہ چلے کہ آخر ان حضرت کو دس برس میں ایک مرتبہ ہی سہی ایک ایسی تحریر لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے جس کے بغیر بھی وہ خیر و عافیت کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے تھے۔

کیا ممتاز شیریں کے بارے میں یہ کہنا درست ہوگا کہ منٹو کے بغیر ان کی زندگی سکھ چین سے گذر سکتی تھی؛ ساتھ ہی یہ تسلیم کرنا بھی لازم ہے کہ انہوں نے اس امر کی کوشش بہت کی اور اس کوشش کی شہادتیں ان کی اپنی تحریر میں موجود ہیں۔ "میگھ ملہار" کے دیباچے میں انہوں نے اپنے ابتدائی افسانوں کے حوالے سے لکھا ہے:۔

"اس زمانے کے ترقی پسند ادب میں زندگی کے تاریک پہلوؤں، تلخ حقیقتوں، برائیوں اور کجرویوں کے افسانے پڑھ پڑھ کے مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ میں انسانی فطرت کی اچھائیوں اور اثباتی قدروں کو پیش کروں۔ اس کوشش میں خلوص شامل تھا اور شاید وہ پہلی معصومیت بھی جو گناہ کے وجود سے اگر منکر نہیں تو خود بے خبر ضرور تھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے .... کہ انسان سرشت میں شر کے وجود سے آگاہ ہونے کے باوجود میں اس شر کو چھوتے ہوئے ڈرتی تھی"۔

اس واردات کی صداقت کا محض اپنے ابتدائی افسانوں ہی سے نہیں بلکہ تنقید سے بھی گہرا تعلق ہے۔

"بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کی رائے میں شر کے تصور کے بغیر کوئی گہرا ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ شر کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد مجھ میں آہستہ آہستہ نامکمل انسان کا وہ تصور ابھر کر آ گیا جو معصوم فطری انسان کے تصور سے بلند تر تصور ہے۔ جس میں انسان خیر و شر کا مجموعہ ہے اگلی فطرت کے ان دونوں پہلوؤں میں مسلسل اندرونی کشمکش جاری رہتی ہے۔ بے راہروی اور گناہ کا احساس اسے ایک مسلسل روحانی کرب و اضطراب میں مبتلا رکھتا ہے۔ یہ انسان اپنی فطری حیوانی جبلتوں پر فتح پا کر بلند ہو سکتا ہے اور نامکمل ہونے کے باوجود اپنی تکمیل میں کوشاں رہتا ہے۔ بڑے ادب میں انسان کا یہی تصور ہے۔ آگے چل کر یہی تصور منٹو پر میری کتاب "نوری نہ ناری" کا مرکزی موضوع بنا"۔

پیچھے مڑ کے جب اس دور پر نظر جاتی ہے جس وقت منٹو

بے غفلت، تغافل یا خوف محسوس ہوا کرتا تھا تو وہ زمانہ بچپنے کا زمانہ لگنے لگتا ہے۔

"میری نظر میں ان تنقیدی مضامین کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے جو میں نے تقسیم سے پہلے لکھے تھے .... یہ مضامین اتنی چھوٹی عمر میں لکھے گئے تھے کہ ان میں سنجیدگی، سلجھاؤ اور توازن کا فقدان تھا۔ تنقید میں میں نے جو بہتر کام کیا ہے وہ تقسیم کے بعد ہی کیا ہے۔ چنانچہ منٹو کا مطالعہ بھی جسے میں اپنی تنقیدی کاوشوں میں سب سے بہتر اور اہم سمجھتی ہوں۔"

(ادب لطیف جوبلی نمبر ۶۳: نقادوں سے دس سوال)

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا منٹو پر توجہ اس وجہ سے تو نہیں دی گئی کہ اس کے یہاں صنف لطیف کی طرفداری بہت ہے، ممتاز شیریں کا جواب سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک، منٹو پر کتاب لکھنے کا باعث یہ نہ تھا کہ اس نے اپنے نسوانی کرداروں کو بلکہ طوائف تک کو ہمدردی سے پیش کیا ہے۔ اس کی کہانیوں میں تو مرد عورت ایک ہی صف میں کھڑے ہیں اور اس کو جہاں عورت سے ہمدردی ہے وہاں ایشر سنگھ، بابو گوپی ناتھ اور شیام سے بھی ہے۔ اپنی کتاب کے ان ابواب میں بھی جو منٹو کے ہاں عورت کے تصور کے بارے میں لکھے ہیں، ممتاز شیریں نے بقولِ خود عورت کی طرفداری نہیں کی۔ نسوانی حقوق کی علمبرداری ایک ایسا معاشرتی تجربہ ہے جو اب پیش پا افتادہ بن چکا ہے۔ منٹو کو راشد الخیری بننا قبول نہیں تو ممتاز شیریں کو بھی عصمت چغتائی بننا قبول نہیں۔ اس کی دانشوری میں تو ایک ایسی خود انتقادی بصیرت ہے کہ شاید ہی کسی خاتون افسانہ نگار کو بشمول قرۃ العین حیدر باایں ہمہ علامگی اس کی ہوا لگی ہو۔ ذرا سنیے:

"عورت خود ترغیب مجسم ہے۔ کسی معاشرے کی بلندی یا پستی کا انحصار عورت کی اخلاقی بلندی یا پستی پر ہے البتہ عورت کو ماں کے روپ میں میں ایک بلند تر اور مقدس ہستی سمجھتی ہوں اور منٹو نے عورت کے اس روپ کو بھی اپنے افسانوں میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت میں ماں بھی ہوتی ہے اور طوائف بھی۔ نفسیاتی ماہروں نے عورت کا تجزیہ کیا ہے اور اس حقیقت کو ہمارے ادب میں منٹو سے بہتر اور کس ادیب نے پیش کیا ہے۔"

منٹو شناسی سے قطع نظر زندگی اور مسائل کے بارے میں یہ بصیرت نہ عصمت کے یہاں ملے گی، نہ قرۃ العین میں۔ البتہ ترغیب کا پہلو شاید کہیں جھلک مار جائے وہ بھی اعتراف کے بغیر۔ اور جہاں تک ماں کے روپ کا تعلق ہے تو آزادیٔ نسواں کی تبلیغ میں اس کے ساتھ کوئی تقدس وابستہ نہیں۔ اس کے برعکس ممتاز شیریں زندگی اور انسانی نفسیات سے اس قدر قریب ہو سکیں تو اس میں عصمت سے بدک جانے کے علاوہ بالآخر منٹو کے منکشف ہونے کا حصہ بھی ضرور ہوگا۔

منٹو کا انکشاف جیسا کہ میں نے پہلے کہا ان پر دیر سے ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں عصمت اور منٹو کا فرق واضح نہیں تھا اور ناپختگی کے دور میں خود منٹو بھی ایک ترغیب کی طرح نظر آتا ہوگا جس سے طبقہ اشراف کی ایک خاتون پرہیز کرنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔ بعد میں انہوں نے اس پرہیز کی تلافی ایک مفصل سلسلہ مضامین کے ذریعہ کرنا چاہی مگر یہ پرہیز کی ایک معاشرتی یا قانونی شکل تو پھر بھی قائم رہی یعنی منٹو کا "ٹھنڈا گوشت" طرفین کی رضا کے باوجود "نیا دور" میں چھاپا نہ جا سکا۔ شوہر کی نوکری حائل ہونے کے علاوہ اپنی اشرافیت بھی عدالتی چارہ جوئی سے گریزاں پرہیز پر بدستور مائل تھی۔

چنانچہ اصل مسئلہ جو منٹو کو دل سے قبول کر لینے میں حائل یا مزاحم تھا قانون یا عدالت کا خوف نہیں تھا بلکہ نقطہ نظر کی اشرافیت تھی۔ جس کی رو سے منٹو اور عصمت برابر مردود ٹھہرتے تھے اگرچہ الگ الگ وجوہات کی بنا پر۔ اس زمانے میں یعنی دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے تک نیا ادب، اور ترقی پسند ادب، سماجی حقیقت نگاری اور

جنسی حقیقت نگاری کے امتیازات ابھی تیکھے نہیں ہوتے تھے اور ادب میں تمام نئے نقطہ ہائے نظر کا متحدہ محاذ قدامت اور فرسودگی کے خلاف احتجاج میں شریک تھا گویا اس متحدہ محاذ کے ٹوٹنے میں ذرا سے اشارے کی دیر تھی۔ ادھر ممتاز شیریں سماجی اور جنسی حقیقت نگاری دونوں میں "سنجیدگی، توازن اور اعتدال" کی طلب گار تھیں اور دوسری طرف ایک ادبی ٹولہ دوسروں پر چھا جانے کی فکر میں تھا۔ جنگ کے بعد نمودار ہونے والی نئی اور یک طرفہ پارٹی لائن کا تقاضا تھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی صفوں کو درست کر کے ان لکھنے والوں کو جو فقط احتجاج یا آزادیٔ فکر کی نمائندگی کرتے تھے یا تو نئی مصلحتوں کا غلام بنا کے رکھا جائے یا تنظیم سے نکال دیا جائے۔ یہ پالیسی واضح طور پر جنگ کے فوراً بعد حیدرآباد دکن میں ایک کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ظاہر ہوئی مگر سجاد ظہیر صاحب کی یادوں کی کتاب "روشنائی" سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کا جال بہت دنوں سے بُنا جا رہا تھا۔ اب بورژوا سوشلزم کے نمائندے بورژوائی ریاکاریوں کے ساتھ معاملہ کرنے کو پوری طرح تیار تھے اور اس کے لیے عصمت چغتائی کرشن چندر وغیرہ کو اپنے ساتھ ملا کر منٹو، راشد اور میراجی کو قربان کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔

اس پس منظر میں آج ممتاز شیریں کا مقالہ "ترقی پسند ادب" ملاحظہ فرمایئے تو یہ خیال پیدا ہونا فطری ہوگا کہ یہ تحریر بھی اس پھیلتے ہوئے جال کا ایک کنارہ تو نہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ مقالے کے اندر "موجودہ جنگ" اور اسی طرح کے اور دو تین الفاظ اور جملے ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حیدرآباد کانفرنس سے پہلے کی تحریر ہے۔ اگرچہ ندیم کے "نقوشِ لطیف" میں اسکی اشاعت کانفرنس کے ایک سال بعد ہوئی ہے۔ اس مقالے میں جہاں سماجی حقیقت نگاری کے نام پر مارکسیت کی تبلیغ کرنے والوں سے اختلاف کیا گیا ہے وہاں جنسی حقیقت نگاری کے نام پر منٹو کو (اور ساتھ ہی عصمت کو بھی کیوں کہ ابھی وہ سجاد ظہیر کے ہاتھ پر ایمان نہیں لے کے آئی تھیں) ایک دو افسانوں کی بنا پر جنس زدہ قرار دیا گیا ہے۔ شاید اس جگہ ایک طویل اقتباس بے محل نہ ہو:-

"ہمارے ہاں جنس پر بہت لکھا جا رہا ہے جنس زندگی کا ایک بہت اہم جزو ہے لیکن اس پر ضرورت سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ شاید مغربی ادب کی ۱۹۲۵ء کے بعد کی جنسی حقیقت نگاری کی تقلید اب ہو رہی ہے۔ ہم تقلید بھی بیس برس بعد کرتے ہیں! جنسی بھوک، جنسی ناآسودگی، جنسی بے راہ روی۔ بس انہی کے ذکر سے ہمارا ادب بھرا پڑا ہے۔ مرد کی تصویر بھی سیاہ ہے اور عورت کی بھی۔ افسوس تو یہ ہے کہ عورت کے قلم سے کھنچی ہوئی عورت کی تصویر بھی سیاہ ہے۔ سوگندھیاں (دھنک: منٹو) اور جینائیں (چپ: ممتاز مفتی) کتنی زیادہ ہیں اور شمی (گرم کوٹ) صفیہ (نیلی) اور آپا کتنی کم۔ حالانکہ ہندوستان میں انہیں کی تعداد زیادہ ہے۔ شاید ترقی پسند یہ کہیں کہ ہمیشہ جنسی برائیوں کا ہی ذکر اسلیے کیا جاتا ہے کہ یہ برائیاں محض سماجی حالات کا نتیجہ ہیں اور ان سماجی حالات کو بدلنا ہو تو برائیوں کو اپنی کریہہ صورت میں پیش کرنا ہوگا لیکن پورے جنسی ادب کا ہم جائزہ لیں تو اس میں بہت کم سماجی مسائل ملیں گے۔ لے دے کے طوائف کا ایک موضوع ہے یا ایک بوڑھے مرد اور جوان لڑکی کی بے جوڑ شادی ان موضوعوں پر بیسیوں افسانے لکھے گئے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں لیکن کتنے اہم مسائل چھوئے تک نہیں گئے ہیں۔ زیادہ تعداد میں ایسے افسانے ہیں جن میں منفرد کرداروں کی جنسی بے راہروی یا عیاشی کا ذکر ہوتا ہے۔ ان افسانوں کے انفرادی ہونے سے کوئی گلہ نہیں۔ آخر ایک فرد کے احساسات اس پر گزرے ہوئے واقعات بھی اہم ہیں۔ گلہ اس بات سے ہے کہ آخر انسان کو ہمیشہ حیوان کے روپ میں کیوں پیش کیا جائے؟ جدید افسانہ نگاروں کو جنسی

بدعنوانیوں کا ذکر کرنے کا خبط ہے، ترقی پسند ادب میں عریانی اور فحاشی پر آئے دن بحثیں ہوتی رہتی ہیں اسلیے یہ الزام بھی بے بنیاد نہیں۔ ممکن ہے بعض ادیبوں کے ارادوں میں واقعی خلوص ہو اور گناہوں کو ایسی کریہہ صورت میں پیش کرنے سے ان کا مقصد ان سے نفرت دلانا ہو لیکن بعض تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیکس کو فیشن سمجھ کر خواہ مخواہ عریاں حقیقتوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ بعض عریاں نگاری کو اپنی جرأت کا اظہار سمجھتے ہیں یا محض ضد اور بغاوت۔ مخصوص باتوں کو کھلے طور پر بیان کرنا بجائے خود فحاشی ہرگز نہیں۔ اس کا انحصار پیش کرنے کے انداز اور موقع پر ہے۔ ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ایسے افسانے بھی لکھے گئے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں جو کریہہ، گناہ آمیز اور غلاظت میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے افسانوں میں یوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ نئے لکھنے والے پہلے کی چند مثالیں دیکھ کر تقلید کرتے ہیں پھر ان کے بعد جو آتے ہیں ان کی تحریروں میں اور عریانی بڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ مبتدی اور معمولی لکھنے والے عریانی کو اپنے افسانے کے اچھے اور ترقی پسند ہونے کی سند میں پیش کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادب پر فحاشی کے الزام کے جواب میں ترقی پسند اکثر یہ کہتے ہیں کہ لوگ ایسے افسانے پڑھ کر اس لیے جھنجھلا اٹھتے ہیں کہ یہ ان کا پول کھول دیتے ہیں۔ یہ محض چور کی داڑھی میں تنکے والا معاملہ نہیں ہے ممکن ہے بعض لوگوں کی طبیعت پر ایسے افسانے اسلیے گراں گزرتے ہوں کہ یہ ان کی جمالیاتی حس کو ٹھیس پہنچاتے ہیں اور پڑھنے والوں میں ایسے بھی ہیں جنہیں ایسے افسانوں سے اکتاہٹ ہوتی ہے اس لیے نہیں کہ یہ ان کا پول کھولتے ہیں بلکہ اس کے برخلاف اس لیے کہ ایسا جنسی ادب ان کی زندگی کو نظر انداز کر رہا ہے۔ ممکن ہے وہ صحت مند محبت یا ازدواجی محبت کے قائل ہوں، خود اچھی زندگی بسر کرتے ہوں اور ادب میں اپنی زندگی کا ایسا عکس بھی دیکھنا چاہتے ہوں جس سے انہیں ایک طرح کا سکون اور مسرت حاصل ہو۔ آپ ہی کا "لحاف" گندہ ہے۔ آپ ہی کے جسم سے "بو" آتی ہے کہہ کر چپ ہونے کی بجائے ہمیں چاہیئے کہ اس شکایت پر غور کریں اس معاملے پر زیادہ توجہ دیں اور جنسی ادب میں سنجیدگی، توازن اور اعتدال پیدا کریں۔ جنس میں لتھڑے ہوتے افسانے کی بجائے جنس میں زندگی کو پیش کریں"۔

کسی تاویل یا تعبیر کے بغیر یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ شکایت کا لہجہ مہذب اور معتدل ہونے کے باوجود یہاں منٹو کے ساتھ متعدد بے انصافیاں روا رکھی گئی ہیں: "ہتک" کی سوگندھی کا ممتاز مفتی کی جنیا سے کیا تعلق ممکن ہے؟ بلکہ خود اس افسانے میں جنسی حقیقت نگاری نام کی کوئی چیز کس جگہ پر موجود ہے؟ منٹو کے "بو" اور عصمت کے "لحاف" میں کیا قدرِ مشترک ہے؟ "بو" کے جواز میں کون یہ کہے گا کہ آپ ہی کے جسم سے یہ بو آتی ہے؟ اور پھر منٹو کا شمار آپکے "پہلے کی چند مثالوں" میں کیا ہے تو بعد میں آنے والوں کے مقابلے میں اس کو جو امتیاز حاصل ہے اس کی نشاندہی بھی تو کیجیے۔ منٹو نے بے جوڑ شادیوں پر کبھی کچھ نہیں لکھا البتہ اس کے جن افسانوں میں چکلے کے لوگ پائے جاتے ہیں (اور اس وقت تک تو ایسے افسانے ابھی اس نے بہت کم لکھے تھے) ان کے بارے میں یہ سمجھنا کہ یہ محض طوائف کے بارے میں لکھے گئے ہیں نہایت درجے کی سادہ لوحی اور ظاہر پرستی کے سوا اور کیا ہے؟ "ادب اور انقلاب" والے اختر حسین رائے پوری کے خیال میں طوائف ہماری جدید شہری زندگی کا لازمی حصہ ہے (یعنی یہ حصہ جب تک قائم رہے گا جب تک نظام کا انقلاب آ جائے) منٹو اس جا نقطہ نظر سے چکلے کو قبول نہیں کر سکتا تو "اس ناگزیر شہری ضرورت" پر اس کے اعتراض کو سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے

یہ وہ مسائل ہیں جن پر ترقی پسند نہیں کر سکتے تھے تو ممتاز شیریں کو ایسی کونسی مجبوری تھی؟ سوا شرافت کے جو ایسے مکروہات پر قدغن لگانے کے حق میں ہے۔

جنس زدہ لکھنے والوں کے ساتھ منٹو کو محشور کرنے کی ایسی کوشش منظم طریقے سے عزیز احمد، علی سردار جعفری اور سجاد ظہیر کی کتابوں میں اور ان کے زیرِ اثر وقار عظیم اور ممتاز حسین تک کے یہاں ملتی ہے۔ اگرچہ اتنے مُدَلّل انداز میں نہیں ان بزرگوں کے رویے پر سلیم احمد کا یہ کہنا غلط نہیں کہ انہوں نے مولانا ماہر القادری اور عبدالماجد دریا بادی کی زبان میں بولنا شروع کر دیا ہے۔ شاید ان میں سے کسی کو پنجاب کے محکمہ احتساب میں چودھری محمد حسین کی جگہ مامور ہونا چاہیے تھا۔ صحت مند جنس پر اصرار بہرحال ممتاز شیریں کی اپنی بات ہے جو ترقی پسندوں سے ایک اور لحاظ سے بھی ممتاز ہیں کہ جب ان پر اپنا اشتباہ روشن ہوتا ہے تو وہ اتنی ہی فراخدلی سے منٹو کے کمال کو تسلیم کر لیتی ہیں۔ یہاں تک کہ "ہتک" اور "بُو" ان کے نزدیک منٹو کے اور اردو زبان کے بہترین افسانوں کی فہرست میں شامل ہو جاتے ہیں "بُو" کا رندھیر ایک فطری آدمی اور صحت مند جنس کا نمونہ اور "ہتک" کی سوگندھی شکست خوردہ فطری عورت کی مثال بن جاتی ہے۔

فطری آدمی، سیاسی آدمی، آدھے اور پورے آدمی کی بحثیں ہمارے ادب میں عسکری صاحب نے اٹھائی ہیں اگرچہ یہ بات محلِ نظر ہے کہ ان اصطلاحوں کے حوالے سے جو باتیں یورپ کی صورتِ حال میں کہی جا چکی ہیں ان کی تیسری دنیا کے ادب اور تہذیب کے سلسلے میں کوئی معنویت بنتی بھی ہے یا نہیں۔ انگریزی کے شاعر اور کافکا کے مترجم ایڈوِن میور کا مشہور مقالہ جو اردو زبان کی ان تمام بحثوں کا ماخذ ہے۔ اس کا تذکرہ عسکری صاحب اور ممتاز شیریں دونوں کے یہاں موجود ہے اگرچہ اتنا سرسری جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ میور کے نزدیک اشتراکیت اور نازیت دونوں کی بنیاد فطری انسان کے تصور پر ہے جس کی جبلتوں میں ہیجان پیدا کر کے اسے ایک سیاسی آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور فطری انسان کا یہی تصور بگڑے اور (میور کی نظر میں) ڈی۔ ایچ لارنس جیسے مقبول و مؤثر ناول نگاروں کے یہاں بھی ملتا ہے۔ یہ انسان مذہب، روحانیت اور اخلاق کی جملہ قیود سے آزاد ہے مگر فکری اور تخلیقی حریت سے محروم چنانچہ فکر و تخلیق کی دشمن قوتوں کے ہاتھ میں کھیلنے کو تیار ہے اس کے برعکس مذہب نے قرونِ وسطیٰ میں جس اخلاقی آدمی کا تصور مغرب کو دیا تھا وہ بھی شکست و ریخت کے باوجود پوری طرح مرا نہیں، ذہنوں میں ایک دھندلی تصویر کی طرح اب بھی محفوظ ہے اور بیسویں صدی میں فطری آدمی کے بالمقابل اخلاقی کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ یہ آدمی (جسے عسکری صاحب نے نامکمل آدمی کہا ہے) اپنی تکمیل کی آرزو میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوا پروست اور جوئس وغیرہ کے یہاں نظر آتا ہے۔

اس تفلسف میں کئی خرابیاں تھیں۔ مغرب کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ان اصطلاحوں میں جمہوریت کے لیے کوئی جگہ نہیں اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد صنعتی توسیع کے دور میں، پیدا ہونے والا آدمی چونکہ ایڈوِن میور صاحب کے مقالے کے بعد پیدا ہوا تھا اسلئے ان سے دریافت نہ کر سکا کہ میرے لیے کیا حکم ہے۔ البتہ یہ کمی عسکری صاحب نے پوری کر دی اور اسے مشینی آدمی کا نام عنایت کیا اور ولیم فاکنر کے ناولوں سے کھینچ تان کر اس کو برآمد بھی کر دیا پھر ہمارے عسکری صاحب چونکہ تفلسف کے میدان میں کسی باہر والے سے کم نہیں ہیں اور میر سے لے کر منٹو تک اردو ادب بھی انہوں نے پڑھ رکھا ہے اسلیے یہاں وہاں مقامی ادبی اشاروں کی مدد سے ان اصطلاحوں کی اہمیت ہم پر واضح کرتے چلے گئے یہ الگ بات کہ فطری آدمی کا جو مفہوم میور کے یہاں تھا وہ عسکری صاحب کے یہاں کچھ کا کچھ بن گیا اور بعد میں عسکری صاحب کو اپنے مقالے کی تردید میں عنوان الٹ کر ایک اور مقالہ لکھنے کی زحمت اٹھانا پڑی۔

منٹو کے سلسلے میں ان کا اشارہ بس اتنا تھا کہ اس کے یہاں فطری آدمی کی جلوہ گری ہے۔ کہاں اور کیسے یہ آپ جانیں آپ کا کام اور اس فطری آدمی کے ساتھ جو منٹو کے یہاں سے خدا جانے برآمد ہو بھی یا نہیں آپ جو بھی چاہیں سلوک کریں اس کا یہ کمال کیا کم ہے کہ اس نے فطری آدمی کی تصویر آپ کو دکھائی ہے۔ "معیار" کے آخر میں جو چھوٹے چھوٹے مقالے ممتاز شیریں کے قلم سے نکلے ہیں (اور ان کے علاوہ چند ایک تنقیدی

جا سکتا ہے (یعنی) فطری آدمی کی اصطلاح تقریباً ایسے ہی استعمال ہوئی ہے
جیسے عسکری صاحب نے روا رکھی تھی۔ زیادہ سے زیادہ مطلب جو اس
قسم کی اصطلاح سے نکل سکتا ہے یہی تھا کہ ترقی پسندوں کے معاشی
اور سیاسی خیالات کی تردید منٹو کے یہاں سے تلاش کی جائے مانا
پڑتا ہے کہ عسکری سے زیادہ اور بہتر انداز میں یہ فریضہ ممتاز شیریں نے
انجام دیا اگرچہ آیت اور تفسیر کا فرق پھر بھی رہے گا۔

ممتاز شیریں کے بعد کے مضامین میں البتہ عسکری صاحب سے
چپ چاپ اختلاف کی ایک صورت پیدا ہو جاتی ہے جب غور
کرنے پر منٹو کے یہاں سے فطری آدمی کی بجائے مکمل آدمی نکل آتا ہے
اپنے ادب اور زندگی کے سلسلے میں ایسی غیر متعین اصطلاحوں کی
معنویت مشکوک ہے اور اگر کسی نقاد کو ان کے برتنے پر اصرار ہو
تو اسے یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اپنے کسی ادیب کی کونسی تحریر کا مفہوم یا کسی
تخلیقی زندگی کا کون سا گوشہ ان کی مدد سے روشن ہو سکتا ہے۔ اصل میں
عسکری صاحب کے نیم فلسفیانہ مقالات کا ادبی تنقید سے تعلق اتفاقی
ہے اور ادب پر ان کا اطلاق ہو بھی تو زیر بحث ادیب کے لکھے ہوئے
متن میں اترنا ہوگا۔ یہ کام عسکری صاحب نے منٹو کے سلسلے میں کبھی نہیں
کیا تو یہ بھی لازم نہیں کہ اور کوئی نہ کر سکے۔ منٹو پر ممتاز شیریں کی تنقید کا
سب سے کمزور پہلو یہی ہے کہ ان چند افسانوں کو بھی جن کا تذکرہ ان کے
یہاں بار بار آتا ہے، انہوں نے قریبی اور تجزیاتی مطالعے کے لیے بہت
کم استعمال کیا ہے گویا مجسم تخلیق کی نسبت مجرد خیالات سے نقاد کی
رغبت زیادہ ہے۔ اگر یہ خیالات اپنی جگہ مستحکم بھی ہوتے اور ان کا
استنباط خود منٹو کی تحریر میں پوری طرح جذب ہونے کے بعد کیا جاتا
تو نقدِ ادب کی صورت چاہے اس قدر عالمانہ و فلسفیانہ نظر نہ آتی مگر
منٹو کا مطالعہ ایک طرف ترقی پسندوں کی تنگ نظری اور دوسری طرف
عسکری صاحب کے ردِ عمل سے آزاد ہو کر بیک وقت وسعت اور گہرائی
کا حامل ضرور ہو جاتا۔

چنانچہ ممتاز شیریں کے متعدد مقالات (اور بعض ایسی تحریروں کے
اجزا جن میں منٹو کا ذکر آتا ہے) مل جل کر جو تصویر بناتے ہیں اس میں
دونوں قسم کے رویے موجود نظر آتے ہیں لیکن ان میں مطابقت پیدا
کرنے کی خاطر یا شاید تضاد کے الزام سے بچنے کے لیے ممتاز شیریں کو
منٹو کے یہاں تغیر، ارتقا اور تکمیل پر ضرورت سے زیادہ زور دینا پڑتا
ہے جس کا بالآخر یہی مفہوم نکلتا ہے کہ جب ترقی پسندوں نے (اور
خود ممتاز شیریں) نے منٹو کے ساتھ تغافل اور تنفر کا سلوک کیا تھا تو اس
وقت منٹو کی اپنی تخلیقی قوت، شعور کے ابتدائی مراحل پر تھی اور بعد میں
جب اس کے یہاں پختگی اور گہرائی پیدا ہوئی تو اسکی نشاندہی عسکری صاحب
(اور خود ممتاز شیریں) کے حصے میں آئی۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ منٹو شروع
سے آخر تک ایک مستقل غیر متبدل حقیقت تھا جس کو کسی قسم کے
تغیر، تکمیل یا نشو و نما کی ضرورت نہ تھی (تنقید میں ڈاروِن کی اصطلاح "ارتقا"
پروفیسر حضرات کے لیے چھوڑ دی جائے تو بہتر ہوگا) مگر منٹو کے ساتھ
ساتھ تغیر و تبدل کا یہ عمل کچھ تو نقادوں کے یہاں بھی پایا جاتا ہوگا۔ ہتک
اور بو کے سلسلے میں ممتاز شیریں کی رائے اور رویے میں جو فرق پیدا ہوا
اس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ دراصل آزادی سے پہلے کے منٹو میں
ممتاز شیریں کو آزادی کے بعد ہی دلچسپی پیدا ہوئی۔

خیر دیر آید درست آید۔ منٹو غریب کو بالآخر کوئی ایسا نقاد تو
ملا جس کو منٹو کے فن، افسانہ نگاری سے گہری دلچسپی ہو اور جو تنظیمی مصلحتوں
اور ہنگامی سرگرمیوں کی روشنی یا تاریکی سے ذرا ہٹ کر اس کے کام کو
تخلیقی ادب کی تاریخ کے تناظر میں رکھ کر دیکھ سکے۔ ممتاز شیریں نے جدید
اردو افسانے پر جتنا وقت اور جتنی توجہ صرف کی ہے وہ ان لوگوں سے مقدار
اور معیار دونوں کے اعتبار سے کہیں زیادہ ہے جن کو تعلیمی اداروں میں اس
میدان کے متخصص کہا جاتا ہے۔ پھر بھی انہوں نے ان خصوصی ماہرین کے
برعکس اپنے وقت اور توجہ کا غالب حصہ کرشن چندر، عصمت، بیدی
ندیم، قرۃ العین حیدر یا ان سے کمتر درجے کے ادیبوں پر صرف کرنے کی
بجائے منٹو کے لیے وقف کیا۔ یہ ان کی تنقیدی بصیرت اور قوتِ فیصلہ
کی صحت کا کھلا ثبوت ہے۔ آج کے لکھنے والے چاہے عصمت کے
سلسلے میں ان کی رائے سے پوری طرح متفق نہ ہوں یا بیدی اور ندیم کے
سلسلے میں ان سے زیادہ توجہ صرف کرنا پسند کریں۔ منٹو پر ان کے مقالات
کی بنیادی حیثیت اب بھی قائم ہے حالانکہ معیار کے سوا منٹو پر ان کی
کوئی تحریر آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی اور نوری و ناری کے اجزا رسالوں

ہیں بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں سے پہلا مقالہ جو "معصیت، معصومیت" کے زیرِ عنوان منٹو کے جیتے جی سویرا میں شائع ہوا تھا اور منٹو کو بہت پسند آیا تھا، ان جملوں کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے۔

"وہ آدم کی جرأتِ گناہ کا قائل ہے۔ منٹو کا انسان نوری ہے نہ ناری۔ منٹو کا انسان آدمِ خاکی ہے" وہ وجودِ خاکی جس میں بنیادی گناہ فساد، قتل وخون وغیرہ کا امکان ہونے کے باوجود جس کے سامنے خدا نے نوری فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔"

بنیادی گناہ سے مراد عیسائی عقیدے کے مطابق آدم کا گناہِ اول یعنی عشق ہے جس کی ترغیب عورت کی طرف سے ہوتی ہے (حوا) اور جس کا کفارہ بھی عورت (مریم) ہی کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں سے بات دوسرے گناہ یعنی قتل وخون (قابیل) تک پہنچتی ہے۔ ("معیار" کے آخری اور مختصر مقالات میں بھی تقریباً یہی باتیں کہی گئی ہیں اگرچہ اتنے زور و شور کے ساتھ نہیں کہ مغربی ادب کے یوں نمونوں کا حوالہ لازم ہو یا نفسیاتِ جنس اور علم الاساطیر کو کھنگالنے کی ضرورت ہو) اس سلسلے کا کلیدی مقالہ تو بنیادی گناہ ہی کے بارے میں ہو سکتا تھا اور جیسا کہ ترغیبِ گناہ والے مقالے پر لگے ہوئے ایک حاشیے میں درج ہے یہ کلیدی مقالہ لکھا بھی جا چکا تھا۔ اس انٹرویو کے دوران جس کے چند اقتباسات اوپر دیے جا چکے ہیں، ممتاز شیریں نے اس تیاری کی تفصیلات بھی دی ہیں جو یہ باب لکھنے کے لیے انہوں نے کی۔ مگر یہ معلوم کر کے بے حد رنج ہوتا ہے کہ مجوزہ کتاب کا یہ مرکزی حصہ نہ تو ممتاز شیریں کی زندگی میں شائع ہو سکا اور نہ ان کے انتقال کے بعد ڈاکٹر صمد شاہین صاحب کو جنہیں اس کا سننا اور دیکھنا اچھی طرح یاد ہے، مرحومہ کے کاغذوں میں ملا۔ ممکن ہے خود ممتاز شیریں نے اس کو اشاعت کے لیے مناسب نہ سمجھ کر تلف کر دیا ہو اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ اتنی مہتم بالشان تیاری کے بعد ان کی یہ تحریر اس معیار کی نہ بنی ہو اور طاقِ نسیاں کی نذر ہو گئی ہو۔ پھر بھی منٹو اور ممتاز شیریں سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کی دریافت کا انتظار رہے گا۔

یہ البتہ خوشی کی بات ہے کہ اس تمام بحث کے خلاصے کے طور پر انہوں نے ایک چھوڑ دو مقالے لکھے ایک منٹو کی پندرھویں برسی کے موقع پر اور دوسرا "ادب میں انسان کا تصور" کے زیرِ عنوان یہ دونوں مقالات دستیاب ہو چکے ہیں اور اب ان کی موت کے بعد اشاعت پذیر ہو رہے ہیں۔

"ادب میں انسان کا تصور" میں انہوں نے گوئٹے سے لے کر "نارمن میلر" تک مغرب کے ادب میں اور اقبال سے لے کر انتظار حسین تک اردو ادب میں منعکس انسان کے مختلف تصورات کا جائزہ لیا ہے اقبال کا انسانِ کامل، پریم چند کا سادہ انسان اور اردو ادب کی تاریخ میں سب سے زیادہ حاوی "نامکمل انسان"۔ منٹو کے یہاں ان کو انسان کے تصور میں ایک نمایاں ارتقا نظر آتا ہے۔

"منٹو کا انسان پہلے فطری انسان تھا جو ...... فطری جبلتوں کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے ...... فطری انسان کی مثال ہمنگوے کے ہاں ملتی ہے۔ منٹو کے یہاں ..... تقسیمِ ہند سے پہلے اس کا خالص انسان ہمنگوے کے انسان سے مشابہ تھا جو اپنی جبلتوں پر آزادی سے عمل کرنے کا خواہاں تھا اور سماجی قیود و بند کا پابند نہ رہنا چاہتا تھا لیکن سماج کی مروجہ اقدار اور اخلاقی بندشیں فطری جبلتوں کے آگے روک لگا دیتی ہیں اور فطری انسان گھٹن اور کجروی کا شکار ہو جاتا ہے۔ منٹو کا شکست خوردہ فرسٹریٹڈ انسان گناہ اور گندگی میں گھرا ہوا نظر آتا ہے ...... منٹو نے اس زندگی کو مکمل معروضیت، جرأت اور بے رحم صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے ......
"بو" کے فطری انسان رندھیر کے افعال کی اچھائی اور برائی سے منٹو کو کوئی سروکار نہ تھا لیکن ننگی آوازیں، ٹھنڈا گوشت اور بابو گوپی ناتھ میں وہ اچھے برے کی تمیز کرتا ہے۔ یہاں منٹو کا اخلاقی نظریۂ حیات کردار کے تجزیے اور تعمیر میں مضمر ہے۔ بابو گوپی ناتھ وہ اہم موڑ ہے جہاں سے منٹو کے انسان کا تصور بدلا ہے۔ اب وہ فطری انسان نہیں نامکمل انسان ہے جو بیک وقت اچھائیوں اور برائیوں، پستیوں اور بلندیوں کا مجموعہ ہے ...... ایک مکمل کردار ...... مروجہ اخلاقی اقدار کی رو سے چھٹا ہوا بدمعاش، عیاش اور رندِ خانہ خراب لیکن اس بدی

کے خول میں ایک نیک باطن بھی ہے اسکی روح پاکیزہ اور اس کا دل
بڑا ہے۔ اس کے پاس خلوص، ہمدردی، فیاضی اور دوستی کا بے پناہ
جذبہ ہے ...... ایک بڑے تجربے اور تکمیل کا احساس ۔"

اخلاقی نظریہ حیات، اور وہ بھی منٹو کے یہاں! ہمارے ترقی پسند
اصحاب، پروفیسر حضرات، افسر شاہی کے سابق و حاضر پرزے یعنی کہ
جملہ اسٹیبلشمنٹ جو اپنے آپ کو اجتماعی اخلاق کی نگہبان سمجھتی ہے اس
افسانے کو شہرتِ عام ملنے کے بعد اس کے بارے میں اپنی پسندیدگی
کا اظہار کر چکی ہے۔ پھر بھی اسکی نظر میں منٹو کے یہاں اخلاقیات سے
کوئی سروکار نہیں پایا جاتا۔ ایک اور مطبوعہ مقالے میں جو منٹو کی
پندرھویں برسی پر لکھا گیا تھا۔ ممتاز شیریں نے یہ سوال پوچھا ہے کہ منٹو
نے بدی کی دنیا کیوں تخلیق کی؟ اور اس کا جواب دیا ہے! اس لئے
کہ وہ ایک اخلاقی فنکار تھا۔ ان کی نظر میں :

" ہمارے ہاں جنس نگار ادیبوں میں منٹو
کی تحریریں سب سے زیادہ صاف ستھری ہیں۔
چنانچہ منٹو کی واضح اور کھلی تحریروں اور براہِ راست
بیان میں عصمت چغتائی کی پردے کے پیچھے والی
ڈھکی چھپی اکساہٹ اور لذتیت نہیں ہے عصمت
کی تحریروں میں TITILLATION کی کیفیت
ہے یعنی جنسی چھیڑ چھاڑ اور گدگداہٹ اور عزیز احمد
نے اپنے ناولوں (گریز، ایسی بلندی ایسی پستی)
اور افسانوں میں جنسی تجربات کو جس تلذذ سے
بیان کیا ہے اس سے کراہت محسوس ہوتی ہے
.... (منٹو کے یہاں) جنسی موضوعات کے
باوجود لذتیت اور ترغیب کا عنصر بہت کم ہے....
منٹو یقیناً فحش نگار نہیں تھا۔"

اس مقالے میں انہوں نے کہا ہے کہ :-

" منٹو کی تحریریں آج دوبارہ پڑھی جائیں
تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے اچھے افسانوں کا
وہی تاثر برقرار ہے ..... اردو کے صفِ اول
کے گنے چنے افسانہ نگاروں میں منٹو کو جو اہم مقام
حاصل تھا آج بھی منٹو کا وہی مقام ہے۔"

اس کے ساتھ انہوں نے پندرہ برس کے عرصے کو ادب کی تاریخ
میں کسی ادیب کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے ناکافی قرار دیا ہے۔ اگرچہ
(ان کی نظر میں) جدید اردو افسانے کی مختصر تاریخ میں اس کام کے لیے
ایک طویل وقتی فاصلے اور وسیع تناظر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس
ساری اگر مگر کا مطلب شاید یہ ہو کہ منٹو کو اردو زبان کی حد تک تو بہت
بڑا افسانہ نگار تسلیم کرنا پڑتا ہے مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ مطلق معنوں
میں ایک بہت بڑا فنکار تھا۔ شاید مرحومہ کو بھی ہم سب کی طرح اردو
زبان سے شکایت تھی یا ساری عمر افسانے کے فن سے تعلق رکھنے کے
بعد حافظ کے الفاظ میں اس فنِ شریف کے موجبِ حرماں ہونے کا
احساس ہوا ہو۔ موت سے پہلے ان کو لافانی ادب تخلیق نہ کر سکنے کا
افسوس تھا، ساتھ ہی یہ شعور بھی کہ اردو زبان کی پچھلی ڈیڑھ دو صدیوں میں
بہت کم لکھنے والے اس مقام تک پہنچ سکے ہیں :

" عظیم ادیبوں نے حیاتِ جاوداں پائی
ہے۔ اپنی موت کے بعد بھی وہ صدیوں سے زندہ
ہیں لیکن اپنے ملک اور خصوصیت سے موجودہ دور
کے کتنے ادیبوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے
کہ وہ زندہ رہیں گے؟ کوئی غالب و میر ہوں، کوئی
اقبال ہوں تو اور بات ہے ورنہ آج منٹو کو بھی
لوگ بھولتے جا رہے ہیں۔"

اگر شعورِ کامل تک پہنچنے کا نام موت ہے تو یہ لمحہ ان پر جسمانی
موت سے پہلے ہی آ چکا تھا اور شاید اسی لئے زندگی کے آخری چند برس
ان سے کچھ نہ لکھا گیا، حتیٰ کہ منٹو والی کتاب بھی نامکمل ہی رہ گئی جس کے
سلسلے میں ان کو احساسِ جرم بھی محسوس ہوا کرتا تھا۔ منٹو کی پندرھویں برسی
پر لکھی ہوئی تحریر میں (جو ممکن ہے ان کی آخری تحریر ہو) انہوں نے ایک
حیران کن اعتراف کیا ہے :-

" منٹو کے افسانوں میں کوئی ابہام نہیں

(باقی صفحہ ۷۹ پر)

ایک کامیاب نقّاد

ایک ناکام افسانہ نگار

شہزاد منظر

> یہ مضمون شہزاد منظر کے طویل مقالے کا ایک حصہ ہے جس میں ممتاز شیریں کی افسانہ نگاری سے بحث کی گئی ہے۔ اس مقالے کا دوسرا حصہ ان کی مقالہ نگاری کے بارے میں ہے۔ چونکہ یہ مقالہ ہمیں تاخیر سے ملا ہے اس لیے اس کا صرف یہی حصہ اس شمارے کی زینت بن سکا ہے۔ شہزاد منظر صاحب نے اس مضمون میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے بہت سے حضرات متفق نہیں ہوں گے لیکن یہ ایک فرد کی رائے ہے اور اس پر قدغن لگانا ہمارا کام نہیں ہے۔ ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ اس بارے میں اگر کوئی اختلاف رائے موصول ہو تو اسے من و عن "نئی قدریں" کے صفحات پر شائع کر دیں اس طرح قارئین بحث کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر کسی مثبت نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ اس مضمون کے مطالعے کے بعد آپ ہمیں اپنی رائے گرامی سے ضرور نوازیں گے۔
>
> (ایڈیٹر)

ممتاز شیریں کا شمار ان خوش نصیب ادیبوں میں ہوتا ہے جو اپنی پہلی ہی تخلیق میں قارئین اور ناقدین کی توجہ مبذول کر لیتے ہیں اور آتے ہی دنیائے ادب پر چھا جاتے ہیں۔ ممتاز شیریں بھی دنیائے ادب میں نقارے بجاتی ہوئی بڑے طمطراق سے آئیں اور آتے ہی اپنے چند مضامین اور افسانے کی بنیاد پر اپنا ایک الگ اور منفرد مقام بنا لیا۔

ممتاز شیریں کی ادبی زندگی کا آغاز دو ماہی جریدہ "نیا دور" بنگلور (انڈیا) سے ہوتا ہے۔ یہ جریدہ ان کے اب نواز اور "ادب گر" شوہر صمد شاہین نے دسمبر ۱۹۴۲ء میں شائع کرنا شروع کیا تھا۔ "نیا دور" کے پہلے شمارہ میں ان کا پہلا مقالہ "۱۹۴۲ء کے افسانے" شائع ہوا تھا یہ مقالہ اتنا اچھا، اتنا عمدہ اور اس قدر بھرپور تھا کہ اس نے دنیائے ادب میں دھوم مچا دی۔ یہ اردو کا پہلا مقالہ تھا جس میں سال بھر کے تمام اچھے افسانوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا تھا۔ ہر افسانہ اور اس کے مصنف کے فن سے بھرپور بحث کی گئی تھی اور ان افسانوں کی ادبی قدر و قیمت جانچنے کی کوشش کی گئی تھی اردو میں اس سے قبل مجنوں گورکھپوری، وقار عظیم اور احتشام حسین وغیرہ نے اردو افسانوں اور فن افسانہ نگاری کے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا لیکن کسی نقاد نے اس سے قبل سال بھر کے افسانے کا اتنا عالمانہ انداز میں جائزہ نہیں لیا تھا۔ اس وقت تک اردو میں اس قسم کے مضامین کی روایت نہیں تھی چنانچہ یہ مقالہ شائع ہوتے ہی ادبی دنیا کی توجہ اس مقالہ نگار خاتون کی جانب مبذول ہو گئی اور اردو کے

سربرآوردہ ادیبوں اور نقادوں نے ان کے مقالہ کو پرشکوہ الفاظ میں سراہا۔ ممتاز شیریں نے اپنے پہلے ہی مقالہ میں اپنی بے پناہ تنقیدی صلاحیتوں کا ثبوت دیا تھا۔

"۱۹۴۳ء کے افسانے" کی اشاعت نے ممتاز شیریں کو ملک گیر شہرت بخشی اور ہندوستان کے گوشے گوشے انہیں اردو کے ممتاز ادیبوں اور نقادوں کے تعریفی خطوط موصول ہونے لگے اردو کے مشہور انشا پرداز اور ادیب ڈاکٹر عبد الستار خان نے لکھا:۔

"ممتاز شیریں نے اردو کے تمام مشہور افسانہ نگاروں کی جدید مطبوعات اور ان کی طرزِ نگارش پر مختصر تبصرہ کیا ہے۔ اس مضمون سے ایک سرسری نظر میں اردو کے افسانوی ادب کی وہ ترقی ظاہر ہوتی ہے جو اس نے گذشتہ بارہ ماہ میں کی ہے اگر وقتاً فوقتاً اس قسم کے تبصرے ہوتے رہے تو ان کے ذریعے سے بیک نظر تمام اہلِ قلم کی ادبی جدوجہد کا اندازہ ہو سکتا ہے مگر اس قسم کی تنقید نقد و نظر کے ایک بہت ہی متوازن اور سنجیدہ زاویہ کی متقاضی ہوتی ہے۔

کرشن چندر نے لکھا:

"ممتاز شیریں صاحبہ نے ۱۹۴۳ء کے افسانوی ادب کو بڑے غور سے دیکھا ہے۔ یہ جائزہ ایک مستقل ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ "ٹکڑے" کے بارے میں ان کی رائے کس قدر صحیح ہے۔ حیرت ہوتی ہے جب میں نے یہ افسانہ لکھا تو میں اس کے دو ٹکڑوں سے مطمئن نہ تھا لیکن اس کے باوجود میں اپنے افسانے میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کر سکا۔"

احتشام حسین نے لکھا کہ:۔

"ممتاز شیریں صاحبہ کا طویل مضمون میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا اور مجھے موصوف کی وسیع النظری اور مطالعہ کی کثرت پر حیرت ہوتی ہے۔ پھر افسانہ نگاروں کا تجزیہ ان کے افسانوں کے متعلق پرخلوص اور ناقدانہ رائیں۔ یہ باتیں بہت دنوں میں آتی ہیں مگر افسانوں کے متعلق اس مضمون کو پڑھ کر کوئی یہ کہہ نہیں سکتا کہ ان کی جگہ برسوں لکھنے والوں کے ساتھ نہیں ہے۔"

خواجہ احمد عباس نے بمبئی کے مشہور اخبار "بمبئی کرانیکل ویکلی" میں "نیا دور" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:۔

"THE BEST THING AMONG THE ORIGIND CONTRIBUTIONS, HOWEVER, IS A COM-PREHENSIVE REVIEW OF "SHORT STORIES OF 1943" BY MUMTAZ SHIREEN WHICH WILL BE RANKED AMONG THE BEST PIECES OF CONTEMPORARY LITERARY CRITICISM."

یہ ہیں وہ آراء جو اردو کے سربرآوردہ ادیبوں نے اس نوخیز ادیبہ اور نقادہ کے پہلے مقالہ کے بارے میں دی تھیں۔ یہ ممتاز شیریں کا شائع ہونے والا پہلا مقالہ ضرور تھا لیکن ان کی پہلی تحریر نہیں تھی وہ بہت چھوٹی عمر سے افسانے لکھا کرتی تھیں اور انہیں ادبی کتابیں پڑھنے کا بچپن سے شوق تھا لیکن وہ اپنے ابتدائی دور کو اپنے ادبی دور میں شامل نہیں کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے ادبی دور کا آغاز ۱۹۴۲ء میں صمد شاہین سے شادی کے بعد شروع ہوا تھا۔ صمد شاہین خود ادبی ذوق رکھتے تھے اور ان کی اپنی لائبریری میں زیادہ تر ادبی کتابیں تھیں جب انہوں نے اچھے ادب کا مطالعہ شروع کیا اور ان کے ذوق میں پختگی آئی تو پھر ان میں لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔

ممتاز شیریں کا پہلا افسانہ "انگڑائی" تھا جو ۱۹۴۴ء کے "ساقی" میں شائع ہوا۔ جس کے بارے میں اس دور میں صمد شاہین کا خیال تھا کہ "یہ افسانہ ۱۹۴۴ء کے بہترین افسانوں میں شمار ہو سکتا ہے"! (ملاحظہ ہو "نیا دور" بنگلور۔ دسمبر ۱۹۴۴ء) حقیقت یہ ہے کہ ممتاز شیریں کے

افسانوں میں سب سے زیادہ مقبول یہی افسانہ ہوا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ "انگڑائی" میں انہوں نے اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا ہے اور یہ افسانہ ان کا آٹو بایو گرافک ہے اس بارے میں ممتاز شیریں کا کہنا ہے کہ:-

"بعض لوگ میرے افسانوں کو آٹو بایو گرافک سمجھتے ہیں "انگڑائی" کی بنا ایک خواب پر رکھی گئی ہے۔ میں نے "اپنی نگریا" کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ میرا مشاہدہ محدود ہے میرا خیال ہے کہ آرٹسٹ کا اصول ہونا چاہیے کہ وہ اپنے RANGE میں لکھے چنانچہ جین آسٹن کی بڑائی اور ادبی دیانتداری اسی میں ہے کہ انہوں نے اپنے تجربے اور اپنے رینج سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ اب تو یہ دیکھا جا رہا ہے کہ یہاں بیٹھے چین اور کوریا کے بارے میں افسانے لکھے جا رہے ہیں ظاہر ہے ان کا معیار کیا ہوگا۔ مشاہدے کی وسعت کی جتنی اہمیت ہے INTENSITY OF FEELING کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے۔"

(ممتاز شیریں سے ایک انٹرویو۔ شفیع عقیل، جنگ کراچی ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء)

ممتاز شیریں کا افسانہ "انگڑائی" اگرچہ کافی مقبول ہوا لیکن انہیں اپنا افسانہ "آئینہ" بے حد پسند تھا۔ یہ افسانہ ممتاز شیریں نے اناطول فرانس کے "مسیڈیم میتھائس" سے متاثر ہو کر لکھا تھا لیکن مواد، ذہنیت اور تکنیک کے لحاظ سے یہ ایک بالکل جدا تخلیق ہے۔ ممتاز شیریں اسے اپنا بہترین افسانہ سمجھتی تھیں چنانچہ وہ اس بارے میں لکھتی ہیں:-

"میں "آئینہ" کو اپنا بہترین افسانہ سمجھتی ہوں یہ افسانہ ایک شدید تخلیقی امنگ کے تحت لکھا گیا تھا۔ یہ افسانہ خاص طور پر مجھے اس لیے پسند ہے کہ اس میں زندگی کی ٹریجڈی ہے

جس طرح ہم جیمس جوئس کی کہانی موت (DEATH) پڑھتے ہوئے محسوس کرتے ہیں کہ اس کے مرکزی کردار کی انا آفاقیت میں حاوی ہو جاتی ہے۔"

ممتاز شیریں افسانے کی بہت اچھی نقاد تھیں انہوں نے افسانے کی تکنیک اور عصرِ حاضر کے اردو اور مغربی افسانے کے بارے میں جتنے اچھے اور عمدہ مقالے لکھے ہیں دوسرے کسی نقاد نے نہیں لکھے حتیٰ کہ وقار عظیم اور ڈاکٹر احسن فاروقی نے بھی نہیں جو عام طور پر افسانے کے نقاد تصور کئے جاتے ہیں۔ ممتاز شیریں کے مقالوں میں "تکنیک کا تنوع" "اردو افسانے پر مغرب کے اثرات" اور سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری پر ان کی معرکتہ الآرا تصنیف "نوری نہ ناری" قابلِ ذکر تخلیقات ہیں۔ انہوں نے بلاشبہ ان تنقیدوں کو تخلیق کا درجہ بخشا ہے لیکن ہم جب ممتاز شیریں کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ انہوں نے فنِ افسانہ نگاری اور مختلف افسانہ نگاروں کی تخلیقات پر جتنی خوبصورت تنقیدیں لکھی ہیں ان کے اپنے افسانے اتنے اچھے اور خوبصورت نہیں ہیں۔

ممتاز شیریں کے بارے میں مجھے یہ لکھتے ہوئے اس بات کا احساس ہے کہ وہ اردو کی نامور ادیبہ ہیں اور ان کا شمار اردو کے بہترین تنقید نگاروں اور چوٹی کی خاتون افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ عصرِ حاضر کے ادب کے بارے میں جائزہ لیتے وقت بعض دفعہ قارئین اور ناقدین سے غلطی یا بھول ہونے کا امکان ہوتا ہے کسی بھی فن پارے کو اس کے صحیح پس منظر میں پڑھنے کے لیے کم از کم نصف یا ربع صدی کی ضرورت ہوتی ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جو ادب پارہ دو چار سال کے دوران یا پانچ دس سال کے عرصے میں بہترین اور شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ ربع صدی کے بعد اس کی اہمیت اور قدر و قیمت یا تو گھٹ جاتی ہے یا بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ شعر و ادب کا مزاج اور تنقید کا معیار زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اس کا اندازہ ذوق اور غالب کے دور سے ہوتا ہے۔ ذوق کے دور کا مذاقِ شعر و سخن ہرگز وہ نہیں تھا

جو آج کے دور کا ہے۔ غالب شناسی صرف آج کے دور میں ہی
ممکن تھی۔ شیکسپیئر کی حقیقی اہمیت کو سمجھنے کے لیے کئی صدی کی ضرورت
ہوئی، زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فلسفی کرک گارڈ اور
افسانہ نگار کافکا کو دوسری عالمگیر جنگ کے بہت بعد سراہا گیا اس
سے قبل نہیں! اسی لیے جو ادب پارہ وقت کی چھلنی میں چھلنے کے
بعد بھی زندہ و تابندہ رہتا ہے وہی صحیح معنوں میں شاہکار اور کلاسیک
کہلاتا ہے۔ منشی پریم چند نصف صدی پہلے کے مصنف ہیں لیکن ان
کے بعض افسانے خصوصاً "زادِ راہ" کے افسانے آج بھی اردو میں
شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس پس منظر میں ہم اگر ممتاز شیریں کے
افسانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ ممتاز شیریں
نے آج سے ۲۹ سال قبل افسانہ نگاری شروع کی۔ آج جب ہم ۲۹
سال کے تناظر میں ان کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں بہت
کم ایسے افسانے نظر آتے ہیں جو آج بھی اچھے اور معیاری کہے
جاسکتے ہیں۔ ممتاز شیریں کا خیال تھا کہ "آئینہ" ان کا بہترین افسانہ اور
"انگڑائی" ان کا مشہور افسانہ ہے لیکن کیا یہ دونوں افسانے اس قابل
ہیں کہ انہیں اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جائے اور انہیں
اردو کے افسانوی ادب کے نمائندہ انتخاب میں شامل کیا جائے؟
یہ درست ہے کہ ان کے افسانہ "انگڑائی" کا انگریزی، فرانسیسی، ڈچ
عربی، ہندی، گجراتی اور بنگالی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے لیکن بقول
محمود ایاز ترجمہ ہونے اور ترجمہ کرانے میں بہت فرق ہے۔ خوش قسمتی
سے ممتاز شیریں حصولِ شہرت کے سلسلے میں بے حد باشعور واقع ہوتی
تھیں۔ وہ شہرت کی اہل ہونے کے ساتھ ساتھ حصولِ شہرت کے
فن سے بھی اچھی طرح واقف تھیں چنانچہ انہوں نے اور ان کے نقاد
شوہر صمد شاہین نے ابتدا سے ہی اس سلسلے میں مہم چلائی اور ایک
سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شہرت حاصل کی۔ ان تمام باتوں کا یہ مطلب نہیں
کہ ممتاز شیریں اچھی مصنفہ نہیں تھیں وہ افسانے کی یقیناً بہت اچھی
ناقد تھیں لیکن انہوں نے افسانے بہت اچھے نہیں لکھے اور جو چند
اچھے افسانے لکھے انہیں "بڑا افسانہ" ثابت کرنے کے لیے اتنی مبالغہ
آمیزی سے کام لیا کہ پڑھنے والوں کو اپنی صلاحیت کے بارے میں
شبہ ہونے لگا۔

جہاں تک "اپنی نگریا" کے افسانوں کا تعلق ہے یہ ان کے ابتدائی
دور کے لکھے ہوئے افسانے ہیں جہاں تک "انگڑائی" کے موضوع اور
فنی قدر و قیمت کا تعلق ہے بقول ممتاز شیریں یہ ان کے سنِ بلوغت
کے ابتدائی زمانے کی تخلیق ہے "آئینہ" "اپنی نگریا" اور "گھنیری بدلیوں میں"
انہوں نے اٹھارہ برس کی عمر میں لکھے ہیں۔ "انگڑائی" کا موضوع میلان
ہم جنسی ہے جو بقول ان کے "اردو میں اس موضوع پر لکھا جانے
والا پہلا افسانہ ہے جو بغیر کسی جنسی چٹخارے اور سنسنی خیزی کے نفسیاتی
نزاکت اور فنکارانہ نفاست سے نبھایا گیا ہے۔" (افسانے کی تعریف
میں یہ ان کے اپنے الفاظ ہیں) اس میں شبہ نہیں کہ ممتاز شیریں کے
دوسرے افسانوی مجموعہ "میگھ ملہار" کے افسانوں کے مقابلہ میں "آئینہ" اور
"انگڑائی" زیادہ بہتر افسانے ہیں جو فنی اعتبار سے "میگھ ملہار" کے
افسانوں سے زیادہ اچھے ہیں لیکن ممتاز شیریں کا خیال قطعی مختلف ہے۔
ان کا خیال ہے کہ "میگھ ملہار" کے افسانے "زیادہ گہرے اور پختہ ذہن"
کی پیداوار ہیں اور اس میں انٹلیکچوئلزم پایا جاتا ہے ان کے خیال میں
"اپنی نگریا" کے افسانے چونکہ ابتدائی دور کے لکھے ہوئے ہیں اس لئے
ان میں زیادہ پختگی نہیں ہے۔ "اپنی نگریا" میں شامل جو افسانہ انہیں
سب سے زیادہ ناپسند ہے وہ ہے "شکست"۔

ممتاز شیریں کے بیان کے مطابق:-

> "شکست" ایک افسانہ تھا جس کا کبھی میں نے
> اپنے اچھے افسانوں میں شمار نہیں کیا تھا کیوں کہ میری
> رائے میں فنکار کا جذباتی خلوص اور موضوع سے
> ہمدردی ہی کسی افسانے کو اچھا بنانے کے لیے کافی
> نہیں چنانچہ "شکست" اور "رانی" گو میں نے پورے
> جذباتی خلوص سے لکھے ہیں اور ان میں ہمدردی کے
> ساتھ غریب طبقے کی مصیبت زدہ زندگی کو پیش کیا
> ہے لیکن میرے لیے یہ پیش کش بہرحال ایک شعوری
> کوشش تھی .... بعض ادیبوں کی تحریروں میں
> جذباتی خلوص ہوتا تھا لیکن ادبی خلوص نہیں "شکست"

اور "رانی" کے جذباتی خلوص کے باوجود ان میں ادبی
خلوص کی کمی تھی۔ "آئینہ" البتہ پورے ادبی خلوص کے
ساتھ لکھا گیا ہے۔"

(دیباچہ ــــ "میگھ ملہار")

ممتاز شیریں نے "شکست" اور "رانی" ترقی پسند ادبی تحریک سے متاثر ہو کر لکھا تھا اس وقت تک وہ ترقی پسندی سے تائب نہیں ہوئی تھیں بلکہ ابتدا میں (یعنی "نیا دور" بنگلور کے اجراء کے وقت) انہوں نے ترقی پسند تحریک کو شہرت کے حصول اور بڑے ادیبوں کی توجہ مبذول کرنے کے لیے سیڑھی کے طور پر استعمال کیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جبکہ ترقی پسند ادب کا ہر جانب ڈنکا بج رہا تھا۔ اردو کے تمام بڑے نامور اور اچھے ادیب انجمن ترقی پسند مصنفین کے پلیٹ فارم پر جمع تھے اور ترقی پسند ادیب کہلانا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا چنانچہ ترقی پسند ادیبوں کے عروج اور مقبولیت کے دور میں ممتاز شیریں کے لیے ان سے ٹکر لینا ممکن نہیں تھا اس وقت وہ نوآموز ادیبہ تھیں۔ ان کا افسانہ نگار اور ناقد کی حیثیت سے امیج قائم نہیں ہوا تھا اسلیے انہوں نے حصولِ شہرت کی غرض سے اس وقت کے مروجہ ادبی فیشن کے مطابق "شکست" اور "رانی" جیسے خالص "ترقی پسند" افسانے لکھے لیکن پاکستان آنے اور "اسلامی اور پاکستانی ادب" کا پرچم لہرانے کے بعد وہ "شکست" اور "رانی" لکھنے پر بے حد شرمندہ تھیں چنانچہ انہوں نے اس کے کفارہ کے طور پر اپنے اچھے افسانوں کی فہرست سے مذکورہ دونوں افسانوں کو خارج کر دیا ان افسانوں پر ان کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ یہ افسانے "شعوری کوشش" سے لکھے گئے تھے لیکن کیا "میگھ ملہار" اور "دیپک راگ" ان کی "شعوری کوشش" سے نہیں لکھے گئے؟

ممتاز شیریں نے اپنی تنقیدوں میں "تخلیق کی بے فطری ساختگی" کا بار بار ذکر کیا ہے چنانچہ ممتاز شیریں نے ایک بار تنقید اور تخلیق کے فرق سے بحث کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"میری تنقید اور تخلیق ایک دوسرے کیلئے COMPLIMENTARY رہے ہیں۔ ادیب کی شخصیت کے دو پہلو۔ تنقیدی اور تخلیقی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ادیب میں جو نقاد ہے وہ فنکار کی رہنمائی کرتا ہے لیکن اسے اس حد تک حاوی نہیں ہونا چاہیئے کہ تخلیق کی بے فطری ساختگی معدوم ہو جائے اور آمد کی جگہ آورد پیدا ہو۔"

"میگھ ملہار" اور "دیپک راگ" کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ دونوں افسانے قطعی شعوری کوشش سے لکھے ہیں ان میں بقول ان کے تخلیق کی فطری بے ساختگی نام کو نہیں ہے اور یہ افسانے ان کی اصطلاح میں آمد نہیں سو فی صد آورد ہیں۔

ممتاز شیریں کو اپنے انتہائی ذہین اور انٹلیکچول ہونے کا شدید احساس تھا اور احساس کیوں نہ ہوتا۔ بونوں کی دنیا میں گولیو اگر اپنے آپ کو دیوقامت سمجھے تو اسے قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ ممتاز شیریں نے جب افسانہ نگاری اور تنقید نگاری شروع کی تو اس وقت تک انہوں نے دنیا کے مغربی ادب کا ایک بڑا حصہ پڑھ ڈالا تھا جبکہ ہمارے زیادہ تر ادیب (جن میں چوٹی کے افسانہ نگار اور نقاد شامل ہیں) جدید ترین مغربی ادب کے برائے نام واقف تھے اور اگر واقف تھے تو انہوں نے جدید ادب کا مسلسل مطالعہ جاری نہیں رکھا تھا چنانچہ ممتاز شیریں نے جب ۱۹۴۳ء میں "۱۹۲۳ء کے افسانے" اور "تکنیک کا تنوع" لکھا تو اردو کے ممتاز ادیبوں اور نقادوں نے ممتاز شیریں پر تعریف کے ڈونگرے برسائے چنانچہ ممتاز شیریں میں اپنے انٹلیکچول ہونے کا احساس شدید سے شدید ہوتا گیا جو ان کی تنقید نگاری کے لیے تو مفید ثابت ہوا لیکن افسانہ نگاری کے لیے نہیں۔

ممتاز شیریں کی انٹلیکچولزم کا بڑا اثر یوں تو ان کے کئی افسانوں پر پڑا ہے لیکن ان میں سب سے زیادہ اثر "میگھ ملہار" میں نمایاں ہے۔ "میگھ ملہار" کو اگر ایک تجرباتی افسانہ کہا جائے تو بھی یہ ایک سو فی صد ناکام تجربہ ہے۔ ممتاز شیریں نے عزیز احمد کے افسانوں کے مجموعہ "رقص شرر" پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بار لکھا تھا:۔

"اکثر یہ ہوتا ہے کہ تجربہ محض تجربہ رہ جاتا ہے۔ تجربہ میں بڑی حد تک شعوری کوشش شامل

ہوتی ہے۔ وجدان کی رو اور شدتِ احساس
افسانہ کی محرک کم ہی ہوتی ہے اس لیے تجربہ پھیکا
رہ جاتا ہے۔ شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ تجربہ "تجربہ"
کی حد سے گزر کر ایک مکمل اور کامیاب تخلیق بن
جائے جیسے غلام عباس کا "آنندی" یا حیات اللہ
انصاری کا "لالادیو" یا احمد علی کا "قید خانہ"
"ہماری گلی" یا عسکری کا "ذکرِ انور" "حرامجادی" لیکن
وہی "حرامجادی" والے نسخے سے "چائے کی پیالی" میں
بات نہیں بن سکی۔ "قید خانہ" اتنا مکمل افسانہ بنا
"موت سے پہلے" مبہم رہ گیا۔ کرشن چندر نے اپنی
افسانہ نگاری کے ہر دور میں ہیئتی تجربوں پر بہت
توجہ دی ہے۔ ان کے پہلے تجربے کامیاب تھے۔
"حسن وحیوان" "پورب دیس ہے دلّی" "دو فرلانگ
لمبی سڑک" "زندگی کے موڑ پر" "بالکونی" "ان داتا"
"ان داتا" تک تجربے بہت کامیاب رہے لیکن اس
کے بعد یہ مواد کے بغیر صرف تکنیکی پینترے بن گئے"۔

("نیا دور"، کراچی)

میں نے ممتاز شیریں کے تبصرے سے اتنا طویل اقتباس اس لیے پیش کیا کہ میں یہ بتا سکوں کہ افسانے کے بارے میں ان کا اپنا کیا خیال ہے۔ اُن کی مندرجہ بالا رائے کی روشنی میں اگر ان کا اپنا افسانہ "میگھ ملہار" یا "دیپک راگ" دیکھا جائے تو ان دونوں افسانوں کو مواد کے بغیر صرف "تکنیکی پینترے" کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے جس میں بقول ان کے "تخلیق کی فطری بے ساختگی" مفقود ہے۔
ممتاز شیریں نے اپنے ان ناکام تجربوں کو چھپانے کے لیے محمد حسن عسکری کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "عسکری صاحب کے سے نقاد کی رائے ہے کہ پچھلے دس برس میں لکھے گئے افسانوں میں "دیپک راگ" کافی اہم اور نیا تجربہ ہے اور یہ تجربہ محض تکنیکی تجربہ نہیں ہے"۔ عسکری صاحب کے اس سارٹیفکیٹ کے باوجود یہ فنی اور تکنیکی اعتبار سے قطعی ناکام افسانہ ہے جسکا خود ممتاز شیریں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ اس بارے میں وہ خود لکھتی ہیں:۔

"یوں تو "دیپک راگ" بھی پسند ہے اس میں میں
نے زندگی کے ایک پہلو کو سات زاویوں سے روشنی
ڈال کر ایک چیز پیش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میرا
خیال ہے اس میں ایک کمی رہ گئی ہے کیوں کہ پورے
افسانے کو COMPOLECT WHOLE
نہیں بنا سکی یعنی اس میں ایک مکمل یک جائی پیدا نہیں
ہو پاتی"۔

ان کے دوسرے تجرباتی افسانہ "میگھ ملہار" کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس افسانہ کے بعض حصے بہت اچھے ہیں لیکن مجموعی طور پر افسانہ اچھا نہیں ہے چنانچہ میں بھی ممتاز شیریں کے الفاظ میں وہی بات کہنا چاہتا ہوں جو انہوں نے عزیز احمد کے افسانہ "مدن سینا" سے بحث کرتے ہوئے کہی تھی کہ "کسی افسانے کے حصوں میں اچھا ہونا اس کی کامیابی یا فنکاری کی دلیل نہیں ہے"۔
ممتاز شیریں اپنے افسانوں کی خود بہت اچھی وکیل تھیں چنانچہ وہ اپنے افسانوں کی اتنی خوبصورتی اور چابکدستی سے تعریف کرتی تھیں کہ پڑھنے والا مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا تھا چنانچہ وہ اپنے افسانوں "دیپک راگ" اور "میگھ ملہار" کی بالواسطہ تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

"ایک سطح کے پڑھنے والے تو اسے پڑھ کر
یوں چونک اٹھے جیسے "میگھ ملہار" میں میں نے فن وادب
کی بلندیوں کو چھو لیا ہو۔ جو اونچا ادبی ذوق رکھتے تھے
ان میں سے بعض نے اسے ایک قدر اور تحسین تسلیم
کیا۔ کافی پڑھے لکھے لوگ اس سے متاثر بھی ہوئے
یہ سب کی متفقہ رائے تھی کہ پہلے دو حصے یقیناً
بہت اچھے ہیں۔ ان میں حسن ہے، شعریت ہے
جذباتی بلندی ہے اور ایک گہرا تاثر لیکن بعد کے دو
حصوں میں وہ گرفت اور وہ دلچسپی قائم نہیں رہتی
کیوں کہ یہ بوجھل بن گئے ہیں اور افسانہ ختم کرنے

کے بعد ایک تشنگی سی باقی رہ جاتی ہے۔"

(دیباچہ — "میگھ ملہار")

ممتاز شیریں کی اس تحریر کے مطالعہ کے بعد "میگھ ملہار" اور "دیپک راگ" جیسی "فن و ادب کی بلندیوں کو چھونے والی" "قدآور تخلیق" پر تنقید کرتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا ہے کہ کہیں اہلِ ذوق مجھے جاہلِ مطلق نہ سمجھنے لگیں اور میں "اونچا ادبی ذوق" رکھنے والے اور "کافی پڑھے لکھے لوگ" کی فہرست سے خارج نہ ہو جاؤں! لیکن کیا کیا جائے کہ اس مقالہ میں ان کی اس "قدآور تخلیق" پر تنقید کر کے اپنی علمی کم مائیگی اور نا اہلی کا مظاہرہ کرنا پڑ رہا ہے۔

میں نے اس سے قبل لکھا تھا کہ ممتاز شیریں اپنے افسانوں کی بہت "اچھی" وکیل ہیں (میں نے یہاں لفظ ناقد عمداً استعمال نہیں کیا ہے وہ اپنے افسانوں کی خوبیاں اس طرح گنواتی ہیں کہ ان پر تنقید سے زیادہ وکالت کا گمان ہونے لگتا ہے۔) اور اپنے افسانوں کی فنی باریکیوں کے بارے میں بڑے بھاری اور وزنی دلائل پیش کرتی ہیں۔ انھیں آسانی سے گرفت میں لانا ممکن نہیں ہے چنانچہ وہ پہلے اپنے افسانہ "میگھ ملہار" کی خوب تعریفیں کرنے کے بعد کہتی ہیں:۔

"میگھ ملہار" میں سقم ضرور ہے جب میں اس کیف و سرشاری کو جو "میگھ ملہار" لکھتے ہوئے مجھ پر طاری تھی بھول کر ایک نقاد کی حیثیت سے معروضیت اور علیحدگی کے ساتھ اس افسانہ کو جانچنے کی کوشش کرتی ہوں تو مجھے بھی اس میں چند خامیاں ضرور نظر آتی ہیں مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے پہلے دو حصے بہت اچھے ہیں۔ بعد کے دو حصے بوجھل اور علمی بن گئے ہیں اور مجموعی حیثیت سے "میگھ ملہار" ایسا مکمل اور پوری تسکین بخشنے والا افسانہ نہیں ہے جیسا کہ "آئینہ" اور "نظارہ" ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ افسانہ "میگھ ملہار" میں نے ایک شدید تخلیقی تحریک کے تحت لکھا ہے۔ مجھ پر واقعتاً اس وقت ایک جنون سا سوار تھا اور میں ایک وجدانی کیفیت سے سرشار تھی۔

اگر "میگھ ملہار" جیسا فنی اعتبار سے نہایت کمزور افسانہ ممتاز شیریں نے شدید تخلیقی تحریک کے تحت لکھا ہے اور افسانہ لکھتے وقت ان پر جنون سا سوار تھا اور وہ ایک وجدانی کیفیت سے سرشار تھیں تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے قطعی ناکام تھیں اور ان کے اندر کے نقاد نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بُری طرح کچل کر رکھ دیا تھا۔ اگر انہوں نے افسانہ نگار کی حیثیت سے کیف و سرشاری کے عالم میں افسانہ لکھنے کے بعد نقاد کی حیثیت سے اس میں چند خامیاں محسوس کیں تو انہوں نے مذکورہ افسانے میں (مجموعہ میں شامل کرنے سے قبل) ترمیم و اضافہ کیوں نہ کیا اور افسانہ کو بوجھل اور علمی بنانے سے کیوں نہیں روکا! ممتاز شیریں کو اس کا علم تھا کہ اس افسانہ کی ناکامی پر "نچلی سطح کے پڑھنے والے جو فن و ادب کی بلندیوں کو چھونے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں معترض ہوں گے چنانچہ انہوں نے اس کے لیے یہ جواز پیش کیا کہ "یہ لازمی نہیں کہ لکھنے والے کو جو چیز زیادہ پسند آئے وہی اس کی بہترین تحریر بھی ہو لیکن فنکار کو اپنی کسی تخلیق سے محبت ہوتی ہے۔ یہ محبت میں نے "میگھ ملہار" کے لیے محسوس کی۔"

میں نے اس سے قبل لکھا ہے کہ ممتاز شیریں کے انٹلیکچوئل ازم کا ان کے فن پر بُرا اثر پڑا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اچھے اور کامیاب فنکار کو انٹلیکچوئل نہیں ہونا چاہیئے اردو میں ایک انٹلیکچوئل افسانہ نگار قرۃ العین حیدر ہیں۔ (دیکھا جائے تو قرۃ العین حیدر ممتاز شیریں سے زیادہ بڑی انٹلیکچوئل ہیں) ان دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر میں اپنی علمیت اور ذہانت کے جا اور بے جا مظاہرے کا شوق نہیں ہے جبکہ ممتاز شیریں میں حد سے زیادہ خود نمائی ہے آپ ان کا کوئی بھی افسانہ یا مقالہ اٹھا کر دیکھ لیجئے ایسا محسوس ہوگا جیسے وہ قارئین پر اپنی بے پناہ قابلیت و علمیت کی دھونس جمانے کی کوشش کر رہی ہیں جبکہ قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں آپ کو اس کا قطعی احساس نہ ہوگا حتیٰ کہ ان کے ادبی مقالوں میں بھی نہیں جبکہ ان کے افسانوں اور مقالوں میں ممتاز شیریں سے زیادہ فکری گہرائی اور بصیرت ہوتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری ان کی انٹلیکچوئل ازم سے متاثر نہیں ہے۔

ان کا ہر افسانہ فنی نقطۂ نظر سے مکمل اور پُر اثر ہوتا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں جبکہ ممتاز شیریں بنیادی طور پر نقاد۔ میرا خیال ہے کہ ممتاز شیریں ادیب کی شخصیت کے تنقیدی اور تخلیقی پہلوؤں کے درمیان توازن برقرار رکھنے میں ناکام رہی ہیں اور ان کی شخصیت کے اندر چھپے ہوئے نقاد نے ان کے اندر کے افسانہ نگار کو قتل کر دیا ہے۔

(ایک طویل مقالے کا حصہ)

بقیہ منٹو، ممتاز شیریں کی نظر میں

نہ کوئی پوشیدہ اشارے ہیں، نہ کوئی پیچیدہ گتھیاں کہ ان کے سمجھانے میں دقت محسوس ہو۔ وقت کے ساتھ ساتھ نئی تشریحیں اور تفسیریں ہوں، نہ درپردہ معانی نکالے جائیں۔ یہ صاف، کھلی، سیدھی اور براہِ راست نوعیت کی تحریریں ہیں جن کا پیغام واضح ہے۔"

درست کہ منٹو، غالب ہے نہ جیمس جوائس جس کی شرحوں پر شرحیں لکھی جائیں مگر منٹو کا پیغام بھی کن کن مشکلوں سے واضح ہوجاتا ہے اور اس کے لیے ممتاز شیریں کو کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی اس کا اندازہ کیا جائے تو منٹو کے ساتھ ساتھ اس کے سنجیدہ ترین نقاد کو بھی خراج تحسین ادا کرنا لازم ہوجاتا ہے جس نے ابتداء میں اشراف کی بے اعتنائی کے ساتھ منٹو کا افسانہ سنا تو اَن سنا کر دیا بعد میں ذرا کان لگا کے سُنا تو گھِن آئی اور غور سے سننا شروع کیا تو اسکی تفہیم کے لیے عالمی ادب اور جنسی نفسیات اور علم الاساطیر اور خدا جانے کیسے کیسے سہاروں کی سخت ضرورت پڑی اور بقول یگانہ:

سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سُنا نہ گیا

۱

میگھ ملہار کے افسانے

محمد سلیم الرحمٰن

ذیل کا تبصرہ سن ۱۹۵۳ء میں میگھ ملہار کی اشاعت پر پاکستان ٹائمز کے لیے لکھا گیا تھا۔ سلیم الرحمٰن صاحب نے روزانہ صحافت کی ضرورتوں کے تحت ایجاز و اختصار کے باوجود ممتاز شیریں کی افسانہ نگاری کے بارے میں بڑے بلیغ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ (ایڈیٹر)

اس وقت جو متعدد خواتین اردو ادب کے میدان میں سرگرم عمل ہیں، میرے خیال میں، ان میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی ممتاز شیریں ہی ہیں۔ عالمی ادب کے بارے میں انہیں خاصی معلومات حاصل ہیں۔ اتنی کہ وہ دوسروں پر اپنی دھاک بٹھا سکتی ہیں۔ ادب کے جدید سے جدید تر رجحانات سے بھی انہیں آگاہی ہے لیکن علم و فضل پُر فریب شے ہے اور آدمی کو مغالطے میں ڈال سکتا ہے۔ بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ ادیب کے لیے اپنے علم و فضل اور تخلیقی صلاحیتوں کے درمیان توازن برقرار رکھنا مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا گیا۔ ممتاز شیریں کے افسانوں کے تازہ ترین مجموعے کو پڑھنے کے بعد لازماً یہ محسوس ہوتا ہے کہ بعض افسانے اس علمیت کو جس کا ٹیکہ انہیں لگایا گیا تھا پچا نہیں سکے اور علامتیں، استعارے اور تلمیحیں ان سے رِس رہی ہیں۔

ممتاز شیریں کے ساتھ دِقت یہ ہے کہ افسانہ لکھتے وقت وہ شعوری طور پر بے شمار باتوں کو مدِ نظر رکھتی ہیں — یعنی خیر کے شعور علامت نگاری، منصوبہ بندی اور تازہ ترین ادبی فیشنوں کے شعور سے انہیں واسطہ رہتا ہے۔ وہ کبھی اپنے آپ کو آزاد نہیں چھوڑتیں۔ انہوں نے خود کو عجیب طرح سے علمیت کی بے خون بندشوں میں، موٹی موٹی سرد گرہوں میں جکڑ رکھا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ آدمی جب تک شر سے دست و گریباں نہ ہو کسی بڑے موضوع کی تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا۔ لہٰذا وہ قلم اٹھا کر شعوری طور پر شر کے بارے میں لکھنا شروع کر دیتی ہیں۔ شر اتنا مجسم جو ظیرا، یا پھر وہ کسی ایسے استعارے کا انتخاب کرتی ہیں جس کی تقدیس کا زمانہ گواہ ہے اور شعوری طور پر تمام پہلوؤں کو ناپ تول کر اسے اپنے الفاظ میں بیان کرنے لگتی ہیں۔

کتاب کا آغاز ایک طویل پیش لفظ سے ہوتا ہے جو تقریباً ۴۰ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اسے پڑھتے پڑھتے آدمی اکتا جاتا ہے۔ ممتاز شیریں نے بڑے لدے پھندے مدرسانہ انداز میں ہر بات کی تشریح کر کے قاری کی حتی الامکان مدد کرنے کی کوشش کی ہے۔ درحقیقت قاری کی اس قدر رہنمائی غیر ضروری ہے اگر پڑھنے والا ذہین ہو تو اصل نکتے کو جلد ہی پا لیتا ہے۔ اس پیش لفظ سے افسانوں کا کچھ بھلا نہیں ہوتا۔

اب ذرا افسانوں کا رخ کیا جائے۔ مجموعے میں چھ افسانے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ دو طویل ناولٹ اور چار افسانے ہیں۔ پہلے افسانے

کا عنوان "کفارہ" ہے۔ اس میں ایک ماں کے کرب کا بیان ہے جو زندگی اور موت کے درمیان کشمکش کے دوران میں بچے کو جنم دیتی ہے جو زندہ نہیں رہتا۔ میری رائے میں یہ نہ صرف اس مجموعے کا بہترین افسانہ ہے بلکہ ایک لحاظ سے ممتاز شیریں کے فن کا بہترین نمائندہ ہے ماں (جو جانتی ہے کہ اس کے جسم و جان میں موجود موت بھینٹ لیے بغیر نہیں ٹلے گی) اس لیے مرنے کو تیار ہے کہ اس کا بچہ جیتا رہے وہ ایک موثر کردار ہے۔ بے چاری گویا موت کے غصے کو فرو کرنے کی کوشش میں اپنی موت کے پروانے پر خود دستخط کرتی ہے اور دستخط کرنے کے بعد ایسی غشی میں ڈوب جاتی ہے جو اس کے حق میں صلیب گاہ کی طرف جانے اذیت ناک سڑک کے سوا کچھ نہیں۔ آخر میں نومولود بچہ مرجاتا ہے۔ وہ اپنی ماں کی جان بچانے کے لیے اس پر نثار ہوگیا۔ ایک اور سطح پر اس افسانے کو دورِ حاضر کی تفسیر قرار دینا ممکن ہے۔ دورِ حاضر جو اپنی نجات کی خاطر، خون بہاکر اور چیر پھاڑ کا دکھ جھیل کر (جسے افسانے میں ایک سیزیرین آپریشن کے ذریعے سے پیش کیا گیا ہے) کسی مسیحا کو جنم دینے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے اور اسے ناکام ہونا بھی چاہیئے کہ وہ نہ صرف منکر ہے بلکہ باز آجانے اور تسلیم کا خوگر بننے پر بھی آمادہ نہیں۔ "کفارہ" میں قابل اعتراض بات ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ افسانے میں کہیں کہیں شاعرانہ نثر جڑنے کا تکلف کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں بعض نثر نگار کبھی کبھار یہ غلطی کرتے ہیں کہ تاثر کو دوچند بنانے کی خاطر نثر کو ادھر ادھر سے خوب بنا سنوار دیتے ہیں۔ ان کی یہ بنی ٹھنی نثر بالعموم ذرا بھی شاعرانہ نہیں ہوتی۔

اپنے ناولٹوں میں ممتاز شیریں نے نئی بلندیوں کو چھونے کی پرزور کوشش کی ہے۔ یہ جدوجہد اپنی جگہ مستحسن سہی مگر اس کا حاصل کچھ خاطر خواہ نہیں۔ "دیپک راگ" نسبتاً بہتر ناولٹ ہے۔ کئی بے جوڑ واقعات پر مشتمل ہونے کے باعث اس کا مجموعی تاثر کسی ایسی کھڑکی سے ملتا جلتا ہے جو رنگ برنگے شیشوں سے مزین ہو۔ ہر واقعہ جنس اور محبت کے کسی نہ کسی پہلو کے بارے میں ہے۔ ممتاز شیریں کے بے لاگ اندازِ بیان نے یہ بات بڑی حد تک واضح کردی ہے کہ جدید معاشرے کے ہاتھوں انسانی زندگی کے یہ ارفع پہلو کس طرح ناتواں اور مبتذل ہوکر رہ گئے ہیں۔ انہوں نے اس ناولٹ میں بعض جگہ بہت اچھی نثر لکھی ہے اور زبیری جیسے کردار اپنی خباثت کے باوجود جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں اور مضحکہ خیز بھی۔

دوسرا ناولٹ "میگھ ملہار" قدرے ثقیل ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ دلچسپ ہے اور اثر سے خالی نہیں مگر رفتہ رفتہ کہانی اسطاروں اور بنیادی خیال کی تکرار کے بھاری بوجھ کی تاب نہ لاکر دم توڑ دیتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ ناولٹ پوری طرح ان کے قابو میں نہ آسکا۔ "آزادی نگارستان" سے قطع نظر جو دلچسپ طنزیہ کہانی ہے۔ مجموعے کے باقی دو افسانے اتنے ڈھیلے ڈھالے اور نربل ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ لکھنا بیکار ہے۔

یہ کہنا تو مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ ممتاز شیریں نقاد کے فرائض انجام دینے سے باز آجائیں مگر انہیں اپنی باہم دگر پیوست معنوی اولاد کو (میری مراد ان کی ذات میں موجود ادیب اور نقاد سے ہے) علیحدہ علیحدہ کرنے کے لیے کوئی جتن کرنا چاہیئے تاکہ وہ ایک دوسرے کو گھسیٹتی نہ پھرے بلکہ الگ الگ راستوں پر سفر کرسکے۔

آخری بات یہ ہے کہ کتاب کی طباعت اس قدر ناقص ہے کہ اسے پڑھنا انتہائی تکلیف دہ امر ہے۔

ممتاز شیریں کی تنقید

انور سدید

اردو تنقید کے افق پر ممتاز شیریں شہاب ثاقب کی طرح نمودار ہوئیں اور مشعل مستعجل کی طرح آسمانِ ادب کی تنہائیوں میں کھو گئیں۔ وہ ان خوش قسمت ادیبوں میں سے تھیں جن پر شہرت کا دیوتا پہلے روز ہی مہربان ہو جاتا ہے اور پھر ہمیشہ مہربان رہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا مقالہ "تکنیک کا تنوع" سویرا میں شائع ہوا تو وہ شہرت کا ہفت خواں پل بھر میں طے کر چکی تھیں اور ان کے علم ذوق کی خوشبو تو قلم سے راس کماری تک پھیل چکی تھی۔ چنانچہ بڑے بڑے جغادری نقاد انگشت بدنداں تھے کہ:

"ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی!"

ارض بنگلور سے یہ شعلہ جوالہ اُٹھا، اور اٹھتے ہی ساری ادبی دنیا کو یوں لپیٹ میں لے لیا اور بہت سے پرانے چراغوں کو اپنی روشنی برقرار رکھنے کے لئے مطالعے کا نیا روغن تلاش کرنا ضروری ہو گیا۔ ممتاز شیریں کی شہرت لاٹری میں نکلا ہوا انعام نہیں تھا کہ اپنا وقار جلدی ضائع کر دیتا۔ اس شہرت کے پیچھے برسوں کا مطالعہ، طویل غور و فکر اور تجزیہ و استخراج کی مسلسل ریاضت موجود تھی۔ چنانچہ ممتاز شیریں کے مطبوعہ مضامین کی تعداد اگرچہ کچھ زیادہ نہیں۔ "یا خدا" اور "کشمیر اداس ہے" کے طویل دیباچوں اور "نیا دور" کے "طویل مختصر افسانہ نمبر" کے ابتدائیہ کو مضامین میں شمار کر لیا جائے تو کل تیرہ بنتے ہیں۔ پھر اردو میں لکھتے ہوئے انہیں طویل عرصہ ہو گیا تھا۔ کسی مدیر یا ادارے کی طرف سے لکھنے کی دعوت بھی ملتی تو وہ حسنِ تشکر سے ٹال دیتی تھیں۔ آخر میں نظیر صدیقی انہیں لکھنے پر مسلسل اکساتے

رہے لیکن وہ بوجوہ مائل نہ ہو سکیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے زندہ [illegible] اور خیال افروز مباحث کی بدولت اردو ادب سے کبھی غیر حاضر نہ [illegible] کی گئیں۔ اور ان کی شہرت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی [illegible] صدمہ اردو ادب کے ہر سنجیدہ طالب علم کو ہوا۔ اور اس صدمے کا [illegible] تک نہ مٹ سکے گا۔

ممتاز شیریں کی تنقید کی اولین خوبی ان کا وسیع مطالعہ [illegible] کی گہرائی ہے ان کے ہاں مشرقی وضعداری اور انکساری کی نہایت [illegible] ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ممتاز شیریں نے [illegible] تنقیدی مضامین کی پہلی اور آخری کتاب "معیار" کا انتساب [illegible] کے پروفیسر مہابر کے نام کیا ہے۔ اس انتساب میں وہ معمولی طالب علم [illegible] اور اپنے استاد کے سامنے پوری عقیدت سے سرنگوں ہیں۔ اور اپنی [illegible] نظر کو انہیں کی بالواسطہ عطا قرار دیتی ہیں۔ کتاب کا انتساب بظاہر ایک [illegible] سی بات ہے، لیکن ممتاز شیریں کے انتساب میں ان کی شخصیت کی [illegible] مثلاً مشرقی وضعداری، انکسار، استاد کی تکریم، تلاش، جستجو کی لگن اور [illegible] کی تحسین وغیرہ سب سما گئی ہیں۔ یہی خوبیاں ممتاز شیریں کی تنقید کی [illegible] خوبیاں ہیں جنہیں استعمال کرنے میں انہوں نے کبھی بخل سے کام نہیں [illegible] تنقید کو ایک ایسا اندازِ نظر عطا کر دیا جس کی وجہ سے ممتاز شیریں [illegible] اور شاید خاتم بھی۔ خاتم میں نے اس لئے کہا ہے کہ ممتاز شیریں نے اپنے [illegible] وسیع مطالعے کی نمائش کئے بغیر جس خوبصورت انداز میں تنقید کی [illegible]

...دیا ہے۔ یہ تناظر کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ مغربی ادب سے استفادہ
...ر اسے تنقید میں بے محابا استعمال کرنے کا رجحان گزشتہ ۳۰ برسوں میں
...مقبول ہوا ہے۔ اس قسم کے بیشتر ناقدین کے ہاں مغربی حوالہ بیجا طور
...پر استعمال ہوتا ہے چنانچہ جہاں تنقید نگار عزابت کا شکار ہوتے
...ہے وہ اپنے قاری پر رعب ڈالتا ہے۔ ایلیٹ۔ آئی اے رچرڈ، ڈلٹس
...یداوینگ وغیرہ میں سے کسی ایک کی یا بیک وقت سب کی چوٹ لگا کے
...ے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے میرے ایک نقاد دوست
...حقیقت فرما رہے ہیں۔ کہ جب انہوں نے اپنا گراں قدر پہلا مقالہ حلقہ
...ب ذوق لاہور میں پڑھا تو کسی نے گھاس نہ ڈالی۔ چنانچہ کسی اگلی مجلس کے
...نہوں نے ایک اور مقالہ بہ ترکیبِ خاص تیار کیا اور اسے غیر ملکی ادیبوں
...اور چند حوالوں سے سجایا۔ باوجودیکہ مقالہ خاصا الٹا تھا۔ اور اہل ذوق
...سروں کے اوپر سے پھسلتا جا رہا تھا لیکن یہ اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ صاحب
...ہوں اس محفل میں اپنے دور کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے نقاد شمار
...ان کی یہ شہرت خاصے طویل عرصے تک قائم رہی۔ ممتاز شیریں کے ہاں
...ادب کا حوالہ مشرقی ادب کی فہم و فراست اور تجزیہ و موازنہ کا وسیلہ ہے۔
...وہ اس وسیلے سے نہ صرف مشرقی ادیبوں کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہیں
...نہیں مغربی ادب کے حوالے سے بھی جانچتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے
...س مقابلے میں ممتاز شیریں نے کہیں بھی مشرقی ادیب کو مغربی ادیب کا
...ہندوستانی ایڈیشن قرار دینے کی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ ان کے ہاں قرۃ العین
...در .... قرۃ العین حیدر ہی نظر آتی ہے۔ انڈین ورجینا وولف کا روپ
...نہیں دھارتی۔ سعادت حسن منٹو اپنی تمام تر سادیت کے باوجود سعادت حسن منٹو
...ہی رہتا ہے پاکستانی موپاساں نہیں بنتا۔ ممتاز شیریں کی نظر میں ہر ادیب
...کا اپنا قد اور اپنا انداز ہے۔ اور وہ اس کو اسی پیمانے پر پرکھنے کی کوشش
...کرتی ہیں۔ انہوں نے مشرق و مغرب ادیبوں کے درمیان فن کے حوالے سے وجہِ
...اشتراک و تضاد عمدگی سے دریافت کی ہے اور تقابلی موازنوں میں بہت
...کامیاب نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں جن میں
...کرداروں کی مختلف معنویتیں تلاش کی گئی ہیں۔

"ورجینیا وولف اپنے کرداروں کی نفسیاتی اور ذہنی
کیفیات کا تجزیہ کرتی ہیں۔ لیکن قرۃ العین حیدر
کے افسانوں میں خود لکھنے والی کی کیفیتیں، چھوٹی چھوٹی
یادیں اور بکھرے بکھرے خیالات ہوتے ہیں۔ پھر
منظر نگاری اور ایک رومانی فضا، اور خیالات کا
ایک آزاد تلازم ....

ورجینیا وولف کے افسانوں میں زندگی کے حسن اور غم کا احساس ہوتا
ہے تو قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں زندگی کی بے ثباتی خصوصاً اونچے
طبقے کی بے روح اور کھوکھلی زندگی"

"کبھی کبھی ان پیش کئے ہوئے الگ الگ تاثرات کو ایک باریک
تار جوڑتا ہوا گزر جاتا ہے جیسے کرشن چندر کے "نکڑ" اور احمد ندیم
قاسمی کے "دشمن ہیرا" میں .... "نکڑ" میں مختلف تاثرات ایک
بالکل پتلے تار میں پرو دیئے جاتے ہیں۔ یہ پانچ الگ الگ تاثرات جیسے
ایک مرکز پر جمع ہیں اور وہ مرکز "نکڑ" ہے۔ "نکڑ" ان میں مشترک ہے
اور ایک اور بات، وہی ہلکا سا تار ..... اچانک اجنبیت کا احساس
الزبتھ بوون کے دو افسانوں A SOMMER NIGHT اور A LOVE STORY
میں کتنی آدمیوں کی زندگیوں کو جوڑ کر ایک بڑی تصویر بنائی گئی ہے۔ یہ تصویر
مکمل نہیں، بلکہ مختلف مقامات سے جڑی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اور یہ
آدمی ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن ایک چیز ہے، پرانا
"وہ شے جسے آپ ہر تصویر میں دیکھیں گے۔"

آپ نے دیکھا کہ نقاد نے اردو مصنف کو مغربی مصنف کا غلام
بنانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مشرقی اور
اور مغربی ادب کے ساتھ یکساں اور طویل ذہنی سفر کیا ہے اور اس کی جزئیات
کو مطالعے کے وسیلے سے ذاتی تجربے کا جزو بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ممتاز
شیریں کی تنقید میں دودھ اور پانی الگ الگ نظر نہیں آتا۔ بلکہ ایک ایسا
کُل ترتیب پاتا ہے جو معنی خیز اور اثر آفریں ہے۔ اور قاری کو کھٹے ڈکار
لینے پر مجبور نہیں کرتا۔

ممتاز شیریں کا مقالہ "تکنیک کا تنوع" اردو کے اہم ترین مقالوں میں شمار
ہوتا ہے اور ہر کڑے سے کڑے انتخاب میں آسانی سے جگہ پا سکتا ہے۔ اور
یہ مقالہ زیادہ تر فنی نوعیت کا ہے اور اسے ہر لحاظ سے دستاویزی بنانے کے
لئے نقاد نے نمائندہ مثالیں فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اس میں

کوئی شک نہیں کہ اس مقالے میں ممتاز شیریں نے بہت سے فنی مباحث اٹھائے ہیں اور مباحث سے تنقید و اختلاف کی جرأت وہی کر سکتا ہے جس نے کم از کم ممتاز شیریں جتنا مطالعہ ہضم کر رکھا ہو۔

تاہم ممتاز شیریں کا ادبی نقطۂ نظر جانچنے کیلئے یہ مقالہ کچھ زیادہ معاونت نہیں کرتا۔ اکیلے قاری کی نظر ان کے دوسرے اہم نظریاتی مضامین مثلاً "ترقی پسند ادب" "سیاست ادیب اور ذہنی آزادی" اور "پاکستانی ادب کے چار سال" پر جاتی ہے۔ یہ مضامین آزادیٔ وطن کے بعد لکھے گئے۔ اس وقت ممتاز شیریں بنگلور سے ہجرت کر کے پاکستان آ چکی تھیں۔ اور جذباتی سطح سے بلند ہو کر پاکستان ذہنی سطح پر قبول کر چکی تھیں۔ چنانچہ بقول محمد حسن عسکری انہیں بھی خالص ادبی مسائل سے ہٹ کر وسیع تر مسائل کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ یہ وسیع تر مسائل اس نئے وطن کے بارے میں تھے۔ جس کی نمائندگی اور عکاسی کا بارِ گراں تو ایک ادیب کے کندھوں پر تھا۔ لیکن ایک خاص قسم کا ادبی طبقہ نہ صرف اس سے روگردانی کر رہا بلکہ بعض مخصوص مقاصد کے پیشِ نظر منفی رویہ پیدا کرنے اور فرد کو مایوس کر رہا تھا۔ ممتاز شیریں نے اس کے برعکس پاکستان کی تعمیر، ترقی اور استحکام کے تصور کو اہم تصور کیا۔ قوم کے مزاج کو پہچاننے اور اس کے صحت مند عزائم کا ساتھ دینے کی تلقین کی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ممتاز شیریں وہ ممتاز ادیبہ ہے جس نے قومی یگانگت، نظم اور اتحاد کے لئے سب سے پہلے علاقائی ادب کی اہمیت پر زور دیا۔ کہ اس سے علیحدگی کے بجائے یگانگت کا جذبہ پیدا ہونے کا امکان زیادہ تھا؟ آج جب ہم مشرقی پاکستان میں "علیحدگی" کا المیہ دیکھ چکے ہیں اور ہمارے ترقی پسند دوست علاقائی ادب کی اہمیت پر بہت زور دینے لگے ہیں تو بالا خیال ممتاز شیریں کی پیغمبرانہ پیش بندی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ان کے اس قول سے اختلاف کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ کہ جس ادب کی جڑیں قوم کی زندگی میں پیوست نہیں ہوتیں، وہ کھوکھلا اور کمزور ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جن ادیبوں نے زیادہ تر غیر ملکی نظریات کو پاکستانی عوام پر ٹھونسنے اور انہیں جبراً اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی ہے آج وہ بھی اپنا اور اپنے ادب کا رشتہ پاکستانی زمین، کلچر اور تہذیب کی جڑوں کے ساتھ استوار کرنے کی تدبیر کر رہے ہیں۔ نتیجتاً آج جس ادیب کو بھی عظیم اور اہم ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے پہلے اس کا رشتہ پاکستانی کلچر کی جڑوں کے ساتھ جوڑا جاتا ہے اور پھر اس کی شخصیت، فکر اور فن کا سراغ ان جڑوں کے حوالے سے لگایا جاتا ہے

ممتاز شیریں نے پاکستانی ادب کے مسائل کو نہ صرف ادیب کی فطری آزادی سے پیش کیا۔ بلکہ وہ اپنے نظریات کو منوانے اور پاکستانی ادب کی اصطلاح کو مقبولِ عام بنانے میں بھی بڑی ثابت قدم نکلیں اور شدید ترین ذاتی مخالفت کے باوجود انہوں نے اپنی آواز کو "ڈھنڈورے کے شور" میں دبنے نہیں دیا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے ادب برائے زندگی کے نعرے کو فروغ دینے کے لئے "ادب برائے ادب" کے نظریے کو اس کی معنوی گہرائی میں جھانکے بغیر ذہنی افیون قرار دیا اور اس کی سب سے زیادہ تکذیب کی۔ ممتاز شیریں کی نظر میں زندگی کے بغیر ادب کا ہر تصور نامکمل ہے۔ انہوں نے صاف الفاظ میں کہا کہ

"ادب برائے ادب کا فقرہ بہت ہی گمراہ کرنے ہے"

یہ بات اس حقیقت سے عیاں ہے کہ کوئی ادب بھی زندگی سے کٹ کر خلا میں تخلیق نہیں ہو سکتا۔ یہ اپنا مواد زندگی معاشرہ اور عوام سے حاصل کرتا ہے۔ اور تخلیقی عمل سے اس پر ادب پارے کا عظیم محل تعمیر کرتا ہے اس تخلیقی تشکیل کے لئے ممتاز شیریں ادیب کی ذہنی آزادی کی حامی اور ادبی ریاضت کی متقاضی ہیں۔ چنانچہ ان کا یقین ہے کہ

"ادیب کا کام دھڑے بندی اور افترا پردازی نہیں جیسے نعرے لگانا اور گالی گلوچ پر اتر آنا نہیں ادیب کا کام لکھنا ہے یہی اس کی سب سے بڑی ریاضت ہے۔ لیکن ذہنی آزادی کے بغیر یہ کام انجام نہیں پا سکتا"

جب ادب پیدا نہیں ہو سکتا جب تک ادیب بے ساختگی سے آزادی سے نہیں لکھتا۔ ادبی تخلیق ناممکن ہے۔ ادبی تخلیق کو ذہنی ایمانداری سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تخیل قید میں بارآور نہیں ہو سکتا۔ جب ذہنی آزادی فنا ہو جاتی ہے۔ ادب مر جاتا ہے۔" اور اپنے اس خیال کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے نپولین کے زمانے کے فرانسیسی ادب، ہٹلر کے زمانے کے نازی ادب، میسولینی کے زمانے کے اطالوی ادب اور سٹالن کے زمانے کے روسی ادب کی عمدہ مثالیں فراہم کی ہیں۔ خود ہمارے سامنے ایوب کے زمانے کا ادب ہے۔ جو گلڈ کی سرپرستی کے باوجود مقبول نہ ہو سکا اور آج ادبا اس سے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔ ادیب کی ذہنی آزادی پر مختلف

حکومتیں تو احتساب کرتی ہی ہیں۔ مگر ادب بقول آندرے ژید ہمیشہ غیر جانبدار ہوتا ہے اور ہر ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ لیکن ممتاز شیریں کے عہد کا اور خود ہمارے عہد کا المیہ یہ ہے کہ پاکستان میں یہ حملہ ادیبوں کی ایک جماعت کی طرف سے ہوا۔ صلہ چنانچہ حقیقت کے اس اظہار میں جو کرب موجود ہے، وہ ممتاز شیریں کی زبان سے ملاحظہ کیجئے

پاکستان میں تین چار افراد نے یا اثر ذرائع اظہار پر عمل تیک دار اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس خیال کو جسے ان کی خوشنودی حاصل نہیں اظہار کا موقعہ نہیں ملتا۔ بالفرضِ محال کسی طریقے سے ایک دبی سی آواز اٹھائی بھی جائے تو یہ ان کے ڈھنڈورے کے شور میں سنائی نہ دے سکے گی، اور دب کر رہ جائے گی۔ یہ حملے کی منفی نوعیت ہے۔

اب براہ راست ذہنی آزادی پر حملہ ایک اور طرف سے ہو رہا ہے اس گروہ کے افراد رہائی تو عقلیت اور سائنسی تجزیے کی دیتے ہیں لیکن اپنا DOGMA منوانے پر اس قدر مصر ہیں کہ اس سے ہٹ کر کسی کو سوچنے یا لکھنے نہیں دیتے۔ یہ لوگ انسانی فکر پر پہرا بٹھا کر انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکنا چاہتے ہیں۔ بحث و تمحیص کے یہ قائل نہیں کیونکہ دلیلیں ان کے کام کی نہیں۔ دشنام طرازی ان کا شیوہ ہے۔ لیکن آزادی تحریر و تقریر کے لیے سب سے زیادہ شور و غوغا انہیں کی طرف سے بلند ہوتا ہے۔ یہ آزادی اپنے لئے مانگتے ہیں دوسروں کے لیے نہیں اور اپنے لئے بھی یہ آزادی صرف جھوٹ اور افترا پھیلانے کی آزادی ہے۔ کسی نے سر مو اختلاف کیا نہیں کہ فوراً خود پسندی، انحطاط پسندی، زوال پسندی، رجعت پسندی غرض ہر طرح کے لیبل لگ گئے۔ یہ الفاظ طوطے مینا کی طرح رٹے جاتے ہیں۔ لیکن محض ان الفاظ کا رٹنا نہ دوسروں کو انحطاط پرست اور زوال پسند بناتا ہے نہ انہیں ترقی کی منازل پر پہنچاتا ہے۔ اصل بحث سے توجہ اور اپنی علمی بے مائیگی کو چھپانے کے لئے ان الفاظ کا نقاب اوڑھ لیا جاتا ہے...... یہ بڑی قابلِ افسوس بات ہے کہ ذہنی آزادی کے سب سے بڑے شعوری دشمن وہی ہیں جن کے لئے آزادی سب سے زیادہ معنی رکھتی ہے۔ پبلک ان باتوں سے اثر انداز نہیں ہوتی۔ براہ راست شعوری حملہ ادیبوں کی طرف سے ہی ہو رہا ہے۔"

معاف کیجئے اقتباس کچھ طویل ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے بغیر وہ جبر سامنے نہیں آ سکتا جو پاکستان میں ادیب نے ادیب کے خلاف روا رکھا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ممتاز شیریں نے جسمانی آزادی کو ذہنی آزادی پر فوقیت نہیں دی۔ اور تسلیم کیا ہے کہ کئی بڑے ادیبوں اور بڑے آدمیوں نے نظر بندی اور جسمانی قید کے دوران بڑی کتابیں لکھیں۔

ممتاز شیریں نے اس جبر کے خلاف آواز اٹھائی ہے، جو انفرادی ذہن کو بیرونی احتساب کے زیر نگیں کر دیتا ہے اور آزاد سوچ کو "یہ لکھنا چاہیئے اس پر لکھنا چاہیئے اور یوں لکھنا چاہیئے۔" کا پابند کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ ادیب کے لئے سیاسی اور سماجی شعور کو لازمی قرار دیتی ہیں۔ لیکن ادب کو سیاست سے ہم آہنگ کر دینا ادب کے لئے مہلک تصور کرتی ہیں کہ اس سے زندگی سیاسی پروگرام کی غلام بن جاتی ہے۔ ادیب سیاست اور اس کے تقاضوں کو زندگی پر فوقیت دینے لگتا ہے اور حد یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان معاشرتی اور انسانی تعلقات بھی ایک بنے بنائے نظریے کی تقلید میں ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ پاکستان میں یہ جبر ایک طویل عرصے سے موجود ہے اور ادیب نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی بجائے اس جبر کے ساتھ

صلہ: یہاں مجھے بے اختیار مسعود مفتی یاد آ رہے ہیں۔ ایک محفل میں محمد طفیل مدیر نقوش نے اعتراض اٹھایا کہ سرکاری احتساب کی بنا پر پاکستانی ادیب آزادی سے نہیں لکھ سکتا۔ مسعود مفتی نے کہ ان دنوں لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے کہا "آپ کسی ایک ادبی تخلیق کا حوالہ دیجئے جو گزشتہ دس سالوں میں سرکاری احتساب کی زد میں آئی ہو۔ جواب خاموش تھا کہ اعداد و شمار اس معاملے میں معاونت سے قاصر ہے۔ اس پر مسعود مفتی صاحب نے کہا کہ احتساب دراصل ادیبوں نے عائد کر رکھا ہے۔ اور مثال اپنے ایک افسانے "دو خون" کی دی جو طویل عرصے تک اسلئے نہ شائع نہ ہو سکا کہ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق اس کی اشاعت سے افسانہ نگار، مدیر اور ناشر سب احتساب کی زد میں آ جائیں گے۔ مفتی صاحب کے احتیاط اور انکار کے باوجود یہ افسانہ ناظر زیدی نے ادب لطیف میں شائع کیا اور بہت مقبول ہوا۔ (انور سدید)

تعاون کرکے اپنے لئے مادی منفعت کی راہ ہموار کی ہے۔ اس سب کے باوجود ممتاز شیریں کو پاکستانی ادب پر اعتماد ہے اور وہ امید کی کرن سے مایوس نہیں ہوئیں۔ ان کا یہ اعتماد اس جملے سے صاف عیاں ہے۔

"آج پاکستان میں کوئی ایسا ادیب نہیں ہوگا جو اپنے
معاشرے کی بہتری کا خواہاں نہ ہو اور اس مقصد کے لئے
اپنے اپنے طریقے سے عمل پیرا نہ ہو۔"

چنانچہ وہ ادب کو کسی مخصوص ڈگر پر چلانے کے بجائے ادب میں وسعت، جامعیت گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے پر زور دیتی ہیں۔ اور ادب کو واٹر ٹائیٹ کمپارٹمنٹ (WATERTIGHT COMPARTMENT) بنانے کی بجائے اس کا ناطہ براہ راست ہمہ جہت اور متنوع زندگی کے ساتھ جوڑتی ہیں۔

"ادب کو وسیع ہونا چاہیئے تاکہ داخلی، خارجی، انفرادی، اجتماعی، لمحاتی ابدی اور روایاتی حدود سے نکل کر ان سب کو اپنے دامن میں لے کر زندگی کی ترجمانی کرے۔ زندگی جو اس لمحے ہمارے سامنے ہے۔ زندگی جو ازل سے ہے۔"

اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہ جہاں ادیب کی ذہنی آزادی کی بھی علمبردار ہیں۔ وہاں وہ آندرے ژید کے اس قول کی ہم نوا بھی ہیں کہ

"ایک بڑا ادیب ہمیشہ NON CONFORMIST ہوتا ہے اور وہ بہاؤ کے خلاف جاتا ہے...." ادیب کی آزادی اور انفرادیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ممتاز شیریں ادب کے افادی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتیں۔ البتہ وہ ادب کو مقصد کا تابعِ فرمان بنا کر اسے پروپیگنڈے کی پست سطح پر گرانا ہرگز پسند نہیں کرتیں۔ انہیں خدشہ یہ ہے کہ مقاصد کے پرچار کے لئے پروپیگنڈہ بھی ادب میں شامل ہوتا جا رہا ہے۔" چنانچہ وہ ادیب کو مشورہ دیتی ہیں کہ مقصدِ فن پارے کے پردے میں ڈھکا نہیں تو کم از کم اس طرح گھل مل جائے کہ اس کا اثر تو ضرور ہو۔ اور مقصد آپ کو گھورتا ہوا نظر نہ آئے"...... ممتاز شیریں کا ایمان ہے کہ "پروپیگنڈے کی سطح پر گرائے بغیر بھی ادب میں افادیت کا عنصر لایا جا سکتا ہے"

ممتاز شیریں کو بالعموم ترقی پسند تحریک کا مخالف سمجھا جاتا ہے چنانچہ ان کے نظریات کی مخالفت بھی ترقی پسند حلقے نے ہی کی اور انہیں برملا رجعت پسند کہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ممتاز شیریں نے اس تحریک کو مقصدیت

افادیت پسندی اور نظریہ پسندی کے حوالے سے اہمیت نہیں دی۔ لیکن ممتاز شیریں کا اختلاف کسی کٹ ملا کا سنگلاخ اختلاف نہیں۔ اس کے لئے ان کے پاس متوازن اندازِ نظر اور معتدل دلائل کی وسیع دنیا ہے اس صحت مند اختلاف کے باوصف وہ اس تحریک کو ایک زبردست تحریک تصور کرتی ہیں۔ رومانویت، فرادیت اور مثالیت کے برعکس وہ حقیقت نگاری کو اس وسیع اور عالمگیر تحریک کی عطا قرار دیتی ہیں۔ وہ اس بات کا برملا اعتراف بھی کرتی ہیں کہ اس تحریک کے زیر اثر ہندوستان میں بھی اچھا ادب پیدا ہوا جو کسی بھی ملک کے ترقی پسند ادب کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے انہوں نے بیشتر ترقی پسند مصنفین کی تخلیقات کی تحسین بڑی فیاضی سے کی ہے۔ مثال کے طور پر "تکنیک کا تنوع" "رجحانات کا دائرہ" "طویل مختصر افسانہ" اور "مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر" جیسے مضامین میں انہوں نے پریم چند کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، مہندر ناتھ، سجاد ظہیر، پریم ناتھ در، رامانند ساگر، حیات اللہ انصاری، اختر حسین رائے پوری، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کو ان کی تخلیقات کے حوالے سے بے پناہ داد دی ہے۔ یہ داد عام روش کے نقادوں کی طرح محض تاثرات پر مبنی نہیں۔ بلکہ اس کے پیچھے مطالعہ تجزیہ اور استخراج کا ایک جہانِ معنی آباد ہے۔ اسلئے اس کا تاثر گہرا اور دیرپا ہے میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ ترقی پسند افسانے کو خود اپنے حلقے سے آج تک ایسا متوازن اور وسیع النظر نقاد نصیب نہیں ہوا جو اسے عالمی افسانے کے تناظر اور پس منظر میں رکھ کر اس کی خوبیوں سے ممتاز شیریں سے بہتر اجاگر کر سکتا۔ ہمارے محترم اور معمر برآوردہ ترقی پسند ادیبوں نے ممتاز شیریں جیسی بالغ نظر نقاد کو مطعون کر کے احسان ناشناسی کا ثبوت دیا ہے۔

ممتاز شیریں کے مضامین کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ تو تحریک سے اختلاف کی وجہ ترقی پسندوں کی ضرورت سے زیادہ مقصد پسندی ایک سنگلاخ نظریے کی جابرانہ تقلید اور کھلی ریاکاری ہے۔ اس زمانے میں جب ترقی پسند شعراء "یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر" کا راگ الاپ کر دہر خزینہ کی نوید سحر کی نفی کر رہے تھے۔ ممتاز شیریں نے ارض وطن کی اہمیت اجاگر کرنے اور اس کے ساتھ پیار کا جذبہ بڑھانے کی تلقین کی۔ یہ مثبت آواز ڈھول کی اس صدا سے الگ تھی جو ترقی پسند ادبا کا تمام حلقہ بیک زبان اٹھا کر ہیجانی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ چنانچہ مقصد کی منزل پر پہنچنے کے لئے جب ایک

گئے ہیں" فارمولے کے مطابق غیر معیاری تخلیقات معرضِ وجود میں آنے لگیں اور انہیں اعلےٰ ادب تسلیم کرنے پر اصرار ہونے لگا اور ہندوستانی فسادات جو نسلی تعصب اور انسانی بربریت کا بدترین مظہر تھے۔ ادبی سیاست اور مصلحت کی نذر ہو گئے۔ تو ممتاز شیریں یہ سوال اٹھائے بغیر نہ رہ سکیں کہ

"آخر انسان کو ہمیشہ حیوان کے روپ میں ہی کیوں پیش کیا جائے"۔

"ادب میں صرف جنسی بدعنوانیوں کو ہی کیوں موضوع بنایا جائے"؟

"خدا کو پرانے نظام کے ساتھ کیوں وابستہ کیا جاتا ہے"؟

"خدا کو گالیاں دینے سے نئے نظام کی تعمیر میں کیا مدد ملتی ہے؟"

"پرانے نظام کی ہر چیز کو کیوں فرسودہ قرار دیا جائے"؟

"مذہب کا بلاوجہ ٹھٹھہ اڑانے کی ضرورت کیا ہے"؟

"ادب میں عریانی اور فحاشی کو کیوں فروغ دیا جائے"؟

ممتاز شیریں کو بجا طور پر خدشہ تھا کہ انسانی کردار کی سیاہ تصویریں پیش کرنے سے زندگی اور انسانی فطرت سے نفرت کا رجحان فروغ پائے گا۔ اور پھر آنے والے بہتر دور کی امید کہاں ہوگی؟ ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند ادبا نے ممتاز شیریں کے اٹھائے ہوئے سنجیدہ سوالات کا کوئی مدلل جواب نہیں دیا۔ بلکہ ممتاز شیریں کے بعد بھی جس کسی نے ترقی پسند ادبا کو تنقید کی کسوٹی میں ڈال کر پرکھنے کی کوشش کی وہ ان کی ذاتی دشمنی کا شکار ہوا۔ نتیجہ وہ انارکی ہے۔ جو آج ادیبوں کے ہر طبقے میں اور پوری زندگی میں راہ پا چکی ہے۔

اردو ادب کی تنقید ایک عرصے تک بالعموم نظم اور بالخصوص غزل کی صنف تک محدود رہی ہے۔ بڑی دیر کے بعد اردو افسانے کو بھی تنقید کی قلمرو میں داخل ہونے کی اجازت تو مل گئی لیکن سید وقار عظیم کے سوا اور کوئی اہم نقاد افسانے کی تنقید کی طرف سنجیدگی سے متوجہ نہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس اہم صنف کے اسرار و رموز، معنویتیں اور امکانات بڑی دیر تک نادریافت رہے۔ افسانہ اصنافِ شعر کے مقابلے میں زندگی کو زیادہ جامعیت اور معنویت کے ساتھ اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ اس کا بنیادی خیال چونکہ کہانی کے تار و پود میں لپٹا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا دائرہ اثر بھی زیادہ وسیع ہے۔ ممتاز شیریں شاید واحد نقاد تھیں جنہوں نے نظریاتی مباحث سے قطع نظر صرف افسانے کی تنقید لکھی۔ اور درسی طریقہ تنقید کو استعمال کرنے کے بجائے اپنا اسلوبِ تنقید بھی خود وضع کیا۔ ان کے ہاں کہانی کو اور اس کی زد میں آنے والی زندگی کو اور اس زندگی کی نمائندگی کرنے والے کرداروں کو زیادہ اہمیت ملتی ہے۔ وہ کسی ایک منفرد افسانہ نگار کا مطالعہ کرنے کے بجائے کسی ایک موضوع پر لکھی جانے والی بے شمار کہانیوں کا مطالعہ کرتی ہیں اور اس مطالعے کے جوہر کو افسانوں کے حوالے سے بیان کر ڈالتی ہیں۔ اس لحاظ سے افسانے پہ ان کی تنقید مغربی اور مشرقی افسانے کا پیرہن (PANDRAMA) ہے جس میں بے شمار افسانے نگار اپنے قدِ تخلیق کے مطابق آتے ہیں۔ اور زندگی کو اپنے رنگوں میں دکھانے کے بعد رخصت ہو جاتے ہیں۔ ممتاز شیریں کے نزدیک اہمیت افسانہ نگار کو حاصل نہیں بلکہ اُس افسانے کو حاصل ہے جو جیتی جاگتی زندگی کا حقیقت پسندانہ اور فنکارانہ بیانیہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قراۃ العین حیدر، احمد علی، غلام عباس، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، عزیز احمد، انتظار حسین وغیرہ بڑے افسانہ نگاروں کو ہی بحث کا موضوع نہیں بنایا، بلکہ پریم ناتھ در، صمد شاہین، صلاح الدین اکبر اور جاوید خٹک وغیرہ کی تخلیقات کو بھی پوری اہمیت دی ہے جن کا افسانے کے دیس میں محض جزوی سا اضافہ ہے۔ یہ ممتاز شیریں کے مشرب کی وسعت ہے۔ کہ انہیں تنقید میں لسانی یا سیاسی وفاداری منظور نہیں بلکہ انہوں نے تخلیق کو اس کی اہمیت اور معیار کے حوالے سے پرکھنے کی غیر جانبدارانہ کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کے قرطاسِ تنقید پر ترقی پسند اور رجعت پسند ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اور وہ ہر ایک پر اپنے سجے ہوئے باوقار اور پُرسکون لہجے میں عملی تنقید کرتی جاتی ہیں۔

ممتاز شیریں کے اہم کارناموں میں منٹو کی تنقید بھی شامل ہے منٹو ہمارے ادب کا اہم اور متنازعہ فیہ افسانہ نگار ہے۔ عام طور پر اسے ایک جنس نگار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اور اس کی بے رحم حقیقت نگاری کے اعتراف سے پہلے اس پر فحش نگاری کا الزام عائد کر دیا جاتا ہے۔ ممتاز شیریں کی منفرد عطایہ ہے کہ انہوں نے ان الزامات کا اثر لئے بغیر منٹو کے باطن میں پرورش پانے والے انسان کے تدریجی ارتقا کا جائزہ لیا۔ یہ دریافت خالصتاً

ممتاز شیریں کی ہے کہ منٹو کے ابتدائی افسانوں میں فطری انسان کا اور آخری
افسانوں میں نامکمل انسان کا تصور موجود ہے۔ فطری انسان جنگل کے انسان کے
مماثل ہے اور صرف نفسانی اور حسی پہلوؤں سے ہی واقف ہے۔ ہر چند وہ فطری
طور پر معصوم ہے اور اس کی جبلتیں بے ضرر ہیں۔ لیکن اس کی خواہشات آزاد
ہیں اور وہ ان کے [illegible] غیر فطری بند نہیں باندھ سکتا۔ چنانچہ بار بار
سماجی اقدار قیود اور بندھنوں کو توڑتا ہے اور اپنی ہر خواہش کی تسکین کا وسیلہ
تلاش کرتا ہے۔ بو، ٹھنڈا گوشت اور ساڑھے تین آنے وغیرہ ایسے ہی افسانے ہیں
جو انسان کے ابتدائی گناہ کے انکار سے پیدا ہوتے ہیں۔ دوسری طرف نامکمل
انسان اچھائیوں برائیوں، پستیوں اور بلندیوں کا مرقع ہے۔ یہ گھڑی کے پنڈولم
کے مترادف ہے۔ اور گناہ و ثواب کے دو انتہائی سروں کے درمیان ہر وقت لٹکا رہتا
ہے۔ اور کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ نہیں سکتا۔ بابو گوپی ناتھ اس موڑ کی طرف اہم
اشارہ ہے۔ ان دونوں کے پہلو بہ پہلو ایک ایسا ریاکار انسان بھی موجود ہے
جس نے سماج سے سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ اس کی بندشیں اور زنجیریں قبول کر لی ہیں
یہ سیاسی انسان کا روپ ہے اور اس انسان نے اپنی فطری خواہشات اور ترغیبات
کا گلا گھونٹ کر اپنے کردار کو جبر کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ "پانچ دن" کا ریاکار
پروفیسر اور "میرا نام رادھا ہے" کا راج کشور ہے۔ اس کے برعکس بابو گوپی ناتھ
نامکمل انسان کا مظہر ہے۔ ان دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔ سیاسی انسان معاشرے
کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ لیکن فطری اور نامکمل انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے
معاشرے کے ساتھ کلیتہً ہم آہنگ نہیں۔ اولذکر آزادی کی مثال ہے اور موخرالذکر
خوف کی۔ یہ خوف نامکمل انسان میں وہ قوت پیدا ہونے نہیں دیتا جو فطری
انسان کی حیوانیت اور سیاسی انسان کی جھجک پر قابو پا کر اپنی ذات سے بلند ہونے
میں مدد دے اور ایک روحانی وجود کو معرضِ تخلیق میں لا سکے۔ موخرالذکر کی تخلیق
شاید منٹو کا مقصد نہیں تھا یا اس تک رسائی پانے کے لئے منٹو کو موت نے
مہلت ہی نہیں دی۔ منٹو کے داخل تک پہنچنے کے لئے ممتاز شیریں نے جدید
نفسیات کو بھی عمدگی سے استعمال کیا ہے۔ ان کے یہ مضامین تحلیلِ نفسی کی درخشاں
مثال اور منٹو پر نئی اور بے مثل تنقید کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ممتاز شیریں نے
منٹو پر پوری ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ کاش! موت سے پہلے
وہ اپنے اس منصوبے کو بھی تکمیل تک پہنچا دیتیں۔

وزیری پانی پتی

دنیا میں ہر جگہ اور ہر معاملے میں عورت ہدف تنقید بنتی رہی ہے اور مردانہ معاشرے نے تنقید اور تبصرے کے جملہ حقوق صرف اپنے لئے مخصوص کر رکھے ہیں، ایسی صورت میں اگر کوئی خاتون جسارتِ نقد و نظر کا مظاہرہ کرتی ہے، تو اسے انتہائی غیر معمولی شخصیت تسلیم کر لینے میں تامل نہ ہونا چاہیئے اور اگر اس عورت کا پسماندہ روزگار مسلمان قوم سے متعلق ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا نے اسے بطور خاص اس مقصد کے لئے خلق کیا ہے،

ممتاز شیریں بھی ایک ایسا ہی شعلۂ مستعجل تھیں جنہیں قدرت اور ماحول نے تنقیدِ ادب کے لئے مخصوص کر دیا تھا، ممتاز شیریں نے اپنی مختصر عمر میں "تنقید کے" "کار دراز" کو بڑی خوبی سے انجام دیا۔ اور اپنی ژرف نگاہی اور اصابتِ فکر کا معاصر اہل قلم سے لوہا منوا لیا،

ممتاز شیریں کے متعلق کبھی کبھی یہ بات اعتراض کے طور پر کہی جاتی ہے کہ انہوں نے مغربی ادب اور ادیبوں کے جتنے حوالے دیئے ہیں کسی دوسرے نقاد نے نہیں دیئے اور ان کا مقصد دوسروں کو مرعوب کرنا تھا، اول الذکر بات کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ممتاز شیریں کے معیارِ نقد و نظر سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ اس کے بغیر وہ اپنے ـ ـ ـ ـ ـ ـ معیار کے مطابق تنقید ہی نہ کر سکتی تھیں، اس بات کو تسلیم کر لینے سے یہ اعتراض کہ یہ ان کی مرعوب کن کوشش تھی ختم ہو جاتا ہے۔

اردو ادب میں خواتین کی تنقید کی کوئی روایات موجود نہ تھی، لہٰذا ممتاز شیریں کی تنقید ان کے اپنے فطری ذوق اور ادبیاتِ مغرب کے وسیع مطالعے کا نتیجہ تھی، چنانچہ ممتاز شیریں ایک خاتون کی حیثیت سے اردو ادب میں روایت تنقید کی بانی قرار دی جا سکتی ہے،

مغربی ادب کا مطالعہ انسانی اور آفاقی نقطۂ نظر سے ضروری سمجھا گیا تھا۔ اور سمجھا جانا چاہیئے، کیونکہ اس کے بغیر ہم انسانی ذہانت کے ورثے سے محروم ہو جائیں گے، لیکن اس مطالعے کا نتیجہ اپنے ادب سے بیزاری نہ ہونا چاہیئے، اب سے ستّر اسّی برس قبل مولانا الطاف حسین حالؔی نے مغربی کے ادب کے مطالعے اور اس سے استفادے کا اس طرح مشورہ دیا تھا۔

حالؔی اب آؤ پیروئ مغربی کریں۔ بس پیروئ مصحفی و میر ہو چکی

حالؔی نے انگریزی سے ناآگاہی کے باوجود اپنے مقدمۂ شعر و شاعری میں

مغربی شعراء کے نام درج کئے ہیں۔ اور وہ مشرق کی روایات شعر و شاعری سے یکسر بیزار تھے اور ایک انتہا پسند مصلح کی حیثیت سے پیروی مصحفی و میر کا قصہ ہی تمام کر دینے پر تل گئے تھے، لیکن ہندوستان کے ادیبوں نے پیروی مغرب کے معاملے میں تو ان کا مشورہ قبول کر لیا، لیکن اپنے ادب اور ادیبوں سے رشتہ نہیں توڑا، یہ ایک فطری بات ہے کہ آدمی اگر خود سے بیزار ہو جائے تو وہ کسی دوسرے کی شخصیت میں دلچسپی نہیں لے سکتا،

جب یہ امر واضح ہو گیا کہ ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں نے حسب توفیق و مقدرت مغربی ادب سے استفادہ کیا ہے، تو پھر ان کی تخلیقات پر نقد و نظر کے لئے ان کے ماخذ فکر و نظر کی جائزہ کاری بھی امر لازم ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اردو کے ترقی پسند ادب کا جائزہ لے اور گورکی یا شولوخوف کا نام نہ لے، ناول نگاری کا ذکر کرے اور ٹالسٹائی، جیمز جوئس، دستوفسکی وغیرہ کو بھول جائے،

ممتاز شیریں نے مغربی ادیبوں اور ادب کے حوالوں سے کسی کو مرعوب کرنے کی سعی نہیں کی ہے، بلکہ ادب بعض آفاقی مماثلتوں اور مشابہتوں کا جائزہ لیا ہے اور ہند و پاکستان کے ان ادیبوں کا تجزیہ کیا ہے جو مغربی ادب سے استفادہ کرتے رہتے ہیں،

ممتاز شیریں کی سب سے ممتاز خصوصیت ان کی قومی بین الاقوامیت اور بین الاقوامی قومیت ہے، وہ اپنی اس مخلصانہ خصوصیت کو بروئے کار لا کر نقد و نظر کے جوہر دکھاتی ہیں، اس اخلاص کی بدولت ان کی تلخ سے تلخ بات شیریں محسوس ہوتی ہے،

دراصل ماحول اور خارجی عوامل ہر جگہ یکساں نہیں ہو سکتے مثلاً بھوک یورپ کا مسئلہ نہیں ہے، قحط اور وباؤں سے یورپ کا ہر ملک فارغ ہے، لہٰذا ان ملکوں کا مسئلہ اب صرف امن اور جنگ کا مسئلہ ہے، سوئٹزرلینڈ اور سویڈن جیسے ملکوں میں کوئی "ان داتا" لکھنے والا ادیب پیدا نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ ان ملکوں میں قحط کا عذاب ناقابل تصور ہے، اس صورت حال کو ذہن میں رکھتے ہوئے عظیم انسانی اقدار و کردار کی توضیح کرتے ہوئے ممتاز شیریں کتنے خوبصورت انداز میں لکھتی ہیں،

"یہ ایک واقعی اہم ادبی سوال ہے کہ نئے ادب میں انسان کا تصور کیا رہے گا؟ انفرادی طور پر ہر لکھنے والے کا یہ تصور الگ الگ بھی ہو سکتا ہے، لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ کسی خاص دور میں ایک خاص تصور رائج پایا جاتا ہے، چنانچہ ١٩٣٦ء میں نئے ادب کی تحریک سے اب تک ہمارے ادب پر سیاسی انسان حاوی تھا۔۔۔۔۔۔۔ انسانی کردار پر اثر انداز ہونے اور انسانی زندگی کو بنانے میں خارجی ماحول اور مروجہ نظام زندگی کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ لیکن انسان ایسا کچا تو نہیں کہ خارجی ماحول جس طرح ڈھالے ڈھل جائے، وہ اپنی فطرت میں بہت پیچیدہ ہے۔ انسان میں اچھائی برائی، پستی اور بلندی، قوت اور کمزوری ایک ساتھ پائی جاتی ہے، انسان کے اندر ان متضاد پہلوؤں میں تصادم اور اندرونی کشمکش جاری رہتی ہے، انسان کو اپنی اچھائی اور برائی پر خود اختیار ہے، اپنی زندگی کا وہ خود ذمہ دار ہے، انسان کے اندر وہ قوت موجود ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں پر فتح پا سکے، اپنی زندگی آپ بنا سکے، اپنے وجود کی تکمیل میں کوشاں رہے، بلند و بالا اقتدار کے معیار پر اپنے آپ کو جانچنے اور اپنی تکمیل کی جدوجہد کرنے والا انسان بڑے ادب کا انسان ہے"

(پاکستانی ادب کے چار سال)

محولہ بالا سطور میں فلسفہ "وجودیت" پوری شان سے جلوہ گر ہے، یہ صرف سارتر کے مطالعے کا نتیجہ نہیں، بلکہ شیریں کے خود اپنے وجود کی آواز ہے، ادب پر سیاسی گرفت اور نظریہ پرستی

کے ادب کش نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں،

"ادیب اور ذہنی آزادی اور ادب اور سیاست کا تعلق اس دور کے بڑے اہم سوال ہیں، جیسا کہ میں نے اپنے مضمون "سیاست، ادیب اور ذہنی آزادی" میں بیان کیا ہے (TOTALI TARIAN) ملکوں میں ادب کے زوال اور انحطاط کی وجہ ایک مخصوص سیاسی آئیڈیالوجی کا ادب پر مسلط ہونا ہے، جبر و احتساب تخلیقی صلاحیتوں کو فنا کر دیتا ہے، جبر ادب پیدا نہیں کر سکتا، جب تک ادیب بے ساختگی اور آزادی سے نہیں لکھتا، ادبی تخلیق ناممکن ہے تخیل قید میں بار آور نہیں ہو سکتا جب ذہنی آزادی فنا ہو جاتی ہے۔ ادب مر جاتا ہے، جہاں حکومتیں صرف ایک پارٹی کی ہوتی ہیں، اور ادیب کو سیاسی سنسرشپ کے تحت رکھنا چاہتی ہیں، وہاں فن پنپ نہیں سکتا اور ادب میں انحطاط اور پستی کا آ جانا ناگزیر ہے" (پاکستانی ادب کے چار سال)

ادب کے متعلق اس وسیع اور جامع نظریئے کے باوجود ممتاز شیریں، شاید مصلحت پسندی کی بنا پر ادب کو تابع سیاست بنانے کی خواہش مند نظر آتی ہیں، وہ لکھتی ہیں،

"پاکستانی ادب میں قومی احساس اور ملی شعور کا مسئلہ ایسا ہے جس پر پاکستان کی ابتدا ہی سے سنجیدہ ادیب توجہ دلاتے آئے ہیں، "نیا دور"، (۱۴-۱۵) کے اداریئے میں اس بات پر زور دیا گیا تھا۔ کہ پاکستان کے قیام کے بعد اب اس کے استحکام ترقی اور تعمیر کا سوال ہے، اس نوزائیدہ ملک میں نئے مسائل اور نئے تقاضے پیدا ہو رہے ہیں، ہمارے لکھنے والے ان کی طرف توجہ دیں، قوم کے مزاج کو پہچانیں اور اس کے عزائم کا ساتھ دیں، غرض یہ کہ ہمارے لکھنے والوں میں ایک واضح ملی شعور پیدا ہو"

مندرجہ ذیل سطور اگرچہ "نیا دور" کے مدیر شہیر کے زور قلم کا نتیجہ ہیں، لیکن ممتاز شیریں نے اس انداز سے ان کا ذکر کیا ہے کہ "یہ بھی میرے دل میں ہے" کے مصداق نظر آتی ہیں۔ اسی مضمون میں انہوں نے دو مزید ادیبوں کی آرا نقل کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس نقطۂ نظر پر انتظار حسین اور آفتاب احمد نے یہ اضافہ کیا کہ پاکستانی ادب صرف وہی نہیں ہے، جو پاکستان کی سرزمین میں پیدا ہو بلکہ وہ جو یہاں کے نئے تقاضوں، نئے حالات اور نئے ماحول کی عکاسی کرے کیونکہ پاکستان کے قیام سے کوئی نئی قوم تو نہیں بنی ماحول تو پہلے ہی موجود تھی اور پاکستان در اصل قوم کے تہذیبی وجود کے تحفظ کے لئے بنا تھا، ہندی مسلمانوں کی تہذیب تو آٹھ سو سال پرانی ہے اور اردو ادب ہند اسلامی کلچر کا سب سے وقیع مظہر ہے، اس لئے اردو ادب کی روایت پاکستانی ادب کی روایت ہے"

اس قسم کے خیالات غیر حقیقت پسندانہ نعرے بازی اور غیر منطقی مفروضات کا نتیجہ تھے انتظار حسین اور آفتاب احمد ان نعروں اور مفروضات کا حشر دیکھنے کے لئے موجود ہیں، ممتاز شیریں بھی اپنے آیام علالت میں مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنتے ہوئے دیکھ چکی تھیں۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

در اصل ادب کو پابند اشتراکیت کیا جائے یا پابند ملائیت و قومیت نتیجہ ایک ہی ظاہر ہو گا، یعنی "ادب کی موت"، کیا آج کے حالات میں جن کا شعور و ادراک بعض لوگوں کو اس دور میں بھی حاصل تھا، جب پاکستان وجود میں آیا تھا، کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اردو ادب کی روایت پاکستانی ادب

کی روایت ہے، یا قوم کا وہ تہذیبی وجود، واقعی موجود تھا جس کے تحفظ کے لئے (بقول انتظار حسین اور آفتاب احمد) پاکستان بنا تھا۔

اردو دراصل برصغیر کی سب سے بڑی زبان ہے اور جب تک برصغیر دو یا تین ملکوں میں تقسیم نہیں ہوا تھا، اردو کی جامعیت مسلّم تھی اور آج بھی اس ملک میں جہاں تقسیم سے قبل کے ارباب سیاست کے نزدیک اردو کا خاتمہ یقینی تھا، اردو ترقی کے تمام مدارج طے کر رہی ہے، جبکہ تحفظ اردو کے لئے وجود میں آنے والے ملک پاکستان میں اردو عبرت انگیز حالات کا شکار ہو گئی اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد یہ دعویٰ یکسر آغوش فنا میں پہنچ گیا ہے، کہ مسلمانوں کی ایک مشترکہ تہذیب اور زبان ہے جن کے تحفظ کے لئے پاکستان بنایا گیا ہے،

میں ممتاز شیریں کے متعلق اس مضمون میں موجودہ لسانی اور سیاسی حقائق کی تلخی کو شامل نہیں کرنا چاہتا، مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ نعرے کبھی آئیڈیل نہیں بنتے، جب حقائق سامنے آتے ہیں تو زبانیں گنگ اور آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں، نیز یہ کہ اگر ادب، مذہب اور قومیت سے چھوٹا ہے تو وہ ادب نہیں ہے اور اس قسم کے شہوانی نعروں سے کہ بقول جمیل الدین عالی کہ

جس نے بنگلہ نار نہ دیکھی وہ نہیں پاکستانی

۱۹۴۷ء میں وجود میں آنے والے پاکستان کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔

ممتاز شیریں نے دراصل ایک "ادبی دباؤ" کے تحت اس قسم کی آراء کی تائید کی ہے، ورنہ ممتاز شیریں کی آفاقیت اور انسانیت ان کے مضامین، تیکنیک کا تنوع ناول اور افسانے میں، رجحانات کا دائرہ، طویل مختصر افسانہ، مغربی فسانے کا اثر اردو افسانے پر، منفی ناول کی ایک مثال، ترقی پسند ادب، سیاست ادیب اور ذہنی آزادی، منٹو کا تغیر اور ارتقاء، منٹو کی فنی تکمیل، جیسے وقیع مضامین سے پوری طرح واضح ہے"

تقسیم ہند اور فسادات وغیرہ کے ادب پر بھی انکی تنقید کم وقعت کی حامل نہیں ہے، لیکن وہ ان عوامل کا تجزیہ نہ کر سکیں، جن کے لئے بڑے ذہن (جو یقیناً ان کے پاس تھا) کے ساتھ بڑی جسارت (جو منفی طور پر ان کے پاس نہ تھی) کی ضرورت تھی اور اگر وہ اس جسارت کا مظاہرہ کر کے حقیقی تجزیہ کرتیں تو شاید ان کی نگارشات بھی ان کے ساتھ مدفون ہو جاتیں، کیونکہ پاکستان اور پاکستانی قومیت کے تمام مخلص اور غیر مخلص علمبردار کم سے کم اس دور میں حقائق سے متعارف ہونے پر آمادہ نہیں ہو سکتے تھے،

بہرحال نئے ادب، ترقی پسند ادب، ملکی اور غیر ملکی ادب کی اصطلاحوں سے قطع نظر، ممتاز شیریں ایک بڑی ناقدہ تھیں، جو بڑے ادب، آفاقی ادب اور انسانی ادب کی تمام اقدار کا نہایت واضح اور غیر مبہم شعور رکھتی تھیں اور مجھے یقین ہے کہ فکر و شعور کی جو شمعیں اور مشعلیں ممتاز شیریں نے روشن کی ہیں وہ اس وقت بھی ایوان ادب کو منور کرتی رہیں گی۔ جب نفرت و عصبیت کے سیاسی نظریات اپنی موت آپ مر جائیں گے۔

ممتاز شیریں کی — تحریریں

- دعائے سیدالاستغفار
- عکسِ تحریر (اردو، انگریزی)
- منٹو کے بہترین افسانوں کی فہرست
- چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم

غیر مطبوعہ تخلیقات

خود نوشت : ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

خطوط : زینت جہاں کے نام

مضامین : ادب میں انسان کا تصور۔ منٹو کے کردار۔ ظلمت نیمروز کا دیباچہ

افسانے : اک زلیخا نے یوسف کا دامن بھی جلا۔ مجرم کون؟

مطبوعہ تخلیقات

- کفّارہ
- انگڑائی
- نغمے کی موت

دعائے سیّد الاستغفار

ممتاز شیریں

اے اللہ تو ہی میرا رب مالک و مولا
ہے۔ تیرے سوا کوئی مالک و معبود
نہیں۔ تو نے ہی مجھے پیدا کیا اور وجود
بخشا۔ میں تیری بندی ہوں، اور جہاں
تک مجھ عاجز و ناتواں سے ہو سکے گا تیرے
ساتھ کئے ہوئے عہد و میثاق اور اطاعت و
فرمانبرداری کے وعدہ پر قائم رہوں گی
تیری پناہ چاہتی ہوں، اپنے عمل و کردار
کے شر سے۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ تو نے
مجھے نعمتوں سے نوازا اور اعتراف کرتی
ہوں کہ میں نے تیری نافرمانیاں کیں
اور گناہ کئے۔ اب میرے مالک و مولا
مجھے معاف کر دے اور میرے گناہ بخش
دے۔ تیرے سوا گناہوں کو بخشنے والا
کوئی نہیں۔

۴۸۴
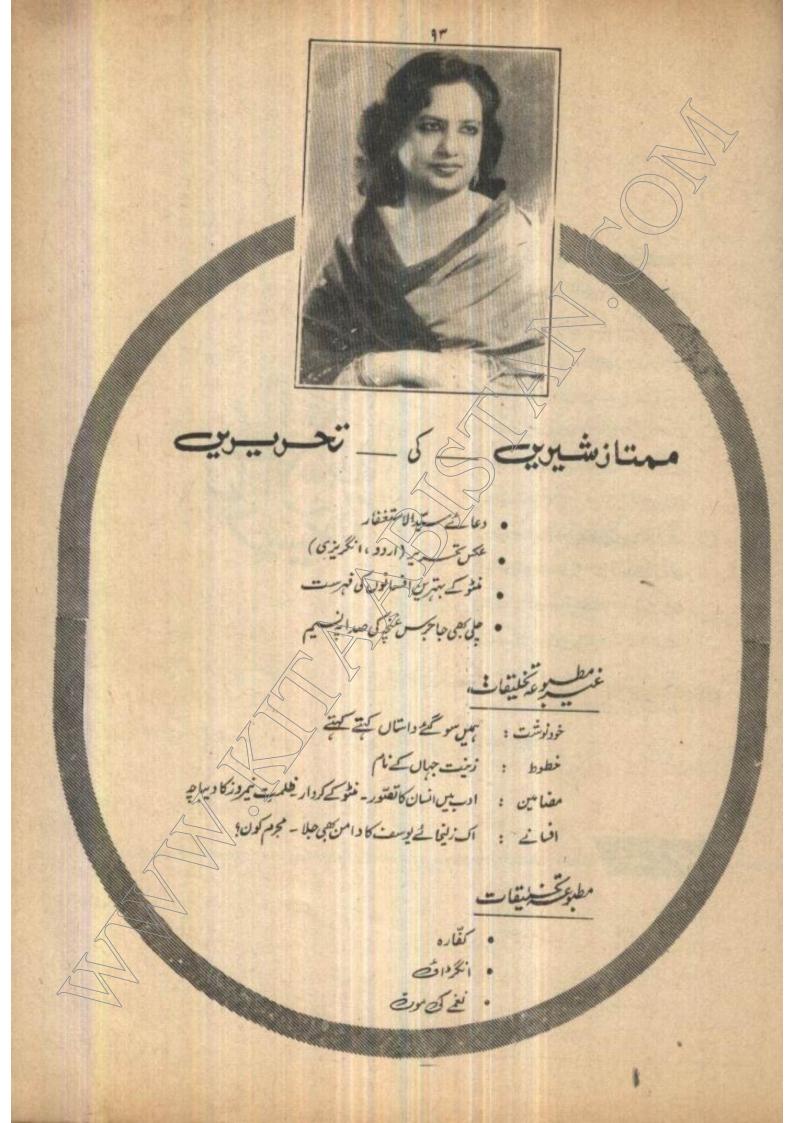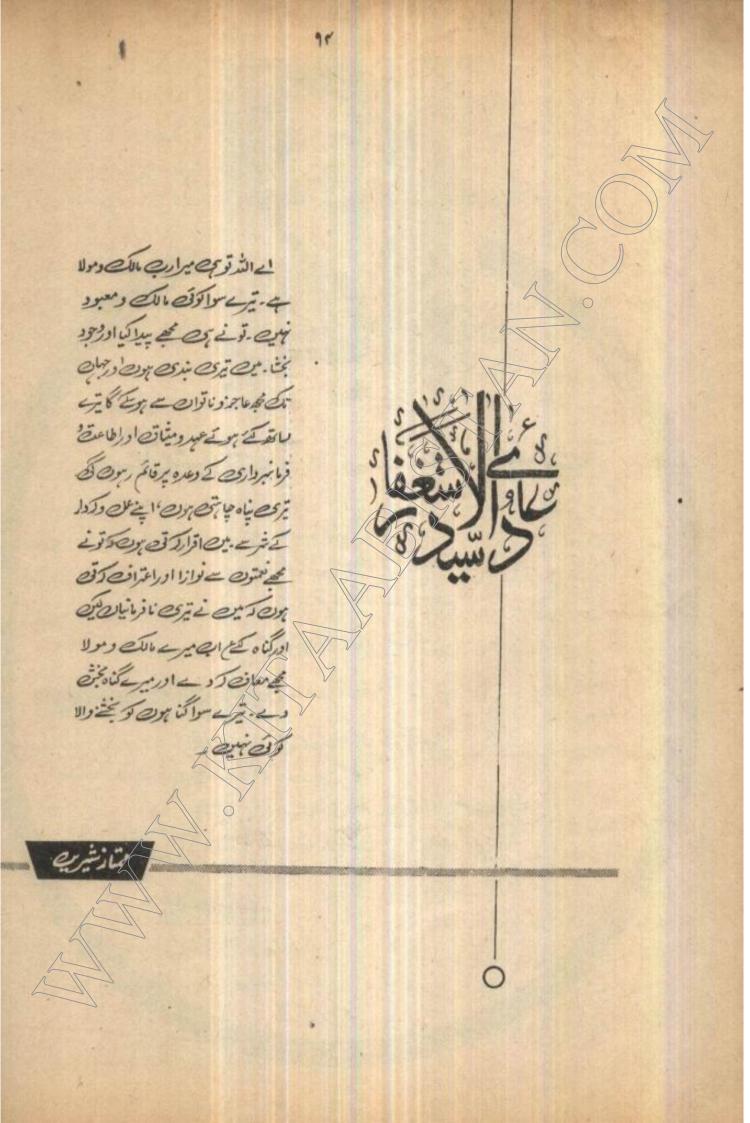
59, Sector G-6/3
Islamabad
1st August 1968

My dear Zeenath,

I am sorry I didn't reply to your kind letter so long. Now I have sat down to write to you at least a short letter. I am also sending you, enclosed herewith, the long promised photographs. Could you believe why I couldn't send them to you all these days although the copies were ready long ago?

Cheers Love,

Shami.

۲۸۶

66, Sector G6/3
Islamabad

اسلام آباد ۱۷ مارچ ۱۹۷۲ء

مکرمی، سلام مسنون

آپ کا خط مل گیا تھا۔ دس پندرہ دن کے بخار سے بری ہوئے تھے۔ بہت بہت شکریہ

لکھنا میں نے تاحال عرصے سے چھوڑ رکھا ہے۔ ترک کر جانے کے بعد تقریباً

۱۹۶۳ سے کچھ نہیں لکھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کے بعد رسالوں میں بھی میری کوئی تحریر نہیں چھپی۔

اس لیے آپ سے بھی معذرت خواہ ہوں۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

بہترین اور نمائندہ

افسانے

ممتاز شیریں

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم

پیدائش	بنگلور ۱۹۲۵ء
شادی	۲۳؍اگست ۱۹۴۲ء
پہلا افسانہ	"انگڑائی" (ساقی دہلی میں چھپا - ۴۲ء)
دوسرا افسانہ	"آئینہ" نیا دور بنگلور میں چھپا
نیا دور کی ادارت	بنگلور ۱۹۴۴ء تا ۱۹۴۷ء تک
نیا دور کی ادارت	کراچی ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۳ء تک
افسانوں کا پہلا مجموعہ	"اپنی نگریا" (مکتبہ جدید) ۱۹۴۷ء
ناول "دی پرل" کا ترجمہ	"در شہوار" (مکتبہ شعور) ۱۹۵۳ء
افسانوں کا دوسرا مجموعہ	"میگھ ملہار" (لارک پبلشرز) ۱۹۶۳ء
تنقیدی مضامین کا مجموعہ	"معیار" (نیا ادارہ) ۱۹۶۴ء

غیر مطبوعہ تخلیقات

نوری نہ ناری	منٹو کے فن سے متعلق کتاب
FOOT FALLS ECHO	انگریزی افسانوں کا مجموعہ
FROM HAVEN TO ASLERM	ایملی برونٹے کے متعلق کتاب
مضامین کا ایک مجموعہ	مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں۔
تراجم کا ایک مجموعہ	جو مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں۔

وفات : ۱۱ مارچ ۱۹۷۳ء

ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ممتاز شیریں کی یہ تحریر ان کی آپ بیتی کا باب اول ہے۔ اس کا آغاز انہوں نے ۱۹۶۴ء کے اوائل میں کیا تھا جن دنوں وہ ترکی میں مقیم تھیں۔ یہ چند صفحات ان کی شخصی و ادبی زندگی کے آغاز اور اس پر مرتب ہونے والے ان اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں جو ان کے بچپن، جوانی اور پھر ازدواجی زندگی کے دوران رونما ہوتے رہے اس لحاظ سے یہ تحریر نہایت اہم ہے کہ اس میں ہمیں ممتاز شیریں کے ذوقِ تربیت سے لے کے ان کی ادبی شخصیت کی تکمیل کا پسِ منظر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ ملتا ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ اپنی زندگی کے اس فسانے کو وہ اسی طرح ادھورا چھوڑ گئیں جس طرح خود موت نے ان کی زندگی کو اپنے فطری انجام تک نہ پہنچنے دیا اور وہ کچے سوت کی طرح اچانک ٹوٹ گئیں۔ یہ فسانہ کیوں نامکمل رہا؟ ان کے شوہر ڈاکٹر صمد شاہین کا کہنا ہے کہ اس آپ بیتی کے مرکزی کردار ان کے نانا ٹیپو قاسم خان جن کے کردار کا ممتاز شیریں کی زندگی پر گہرا اثر رہا ہے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی موت نے انہیں ایسا بددل کیا کہ جیسے بجھ سی گئیں ہوں۔ اس کے بعد اس تحریر کو جہاں چھوڑا تھا وہیں پر رہنے دیا اور مزید لکھنے کا یارا نہ ہوا۔ اب ان کی موت کے بعد یہ اوراق ڈاکٹر صمد شاہین کی وساطت سے ہمیں ملے ہیں جنہیں ہم پہلی مرتبہ شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں اس کرم فرمائی کے لیے ہم ڈاکٹر صمد شاہین کے بے حد ممنون ہیں۔

ـــــ ایڈیٹر

ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے...

میری زندگی کے ۳۵ سال یوں گزرے کہ معلوم ہوتا تھا مجھ پر کچھ بیتی ہی نہیں۔ میری زندگی میں ایسے کوئی نشیب و فراز نہیں آئے۔ کوئی ٹھوس اور تلخ تجربے نہیں ہوئے۔ کبھی تنہا بڑھ کر دنیا سے ٹکر لینے کا موقعہ نہیں ملا۔ ماں باپ کے گھر۔ پھر شادی کے بعد۔ شوہر کے ساتھ میری زندگی بڑی محفوظ مضبوط سہاروں کے ذریعہ گزری۔

زندگی صرف حادثات۔ واقعات اور ٹھوس تجربات پر مشتمل نہیں ہوتی۔ کسی فرد کی حیاتاتی اور ذہنی نشوونما۔ کردار اور رویہ میں غیر محسوس تبدیلی سیاحت اور دوسری تہذیبوں کا اثر۔ مذہب و اخلاق کا تصور، زندگی (اور میری زندگی بھی) ان سب کا مرکب ہے۔

بس ایک پرسکون، ہموار، خوشگوار اور متوازن زندگی تھی کہ بیتی جا رہی تھی۔ اب پچھلے تین سال سے میری زندگی پر غم کا سایہ پڑا ہے کہ یکے بعد دیگرے عزیز ہستیاں مجھ سے چھن گئی ہیں اور میں خود موت کی وادی سے واپس آئی ہوں۔ وقت ایک ایسا مرہم ہے کہ زخموں کو مندمل کر دیتا ہے اور روزمرہ کی عام زندگی میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ بڑے بڑے حادثات کے بعد بھی انسان کو اپنے معمول پر واپس لے آتی ہے۔

سلسلہ روز و شب اصل حیات و ممات ---- روز و شب یونہی بیت جاتے ہیں لیکن زندگی کے اس بے رنگ معمول میں ایسے ڈرامائی لمحات اور کیفیات بھی آتے ہیں جب شعور احساس تیز اور بلند ہوتا ہے۔ یہ لمحات ماہ و سال پر بھاری ہوتے ہیں اور ایسے لمحے میری زندگی میں بھی آئے ہیں جب وقت ایک اندرونی حقیقت بن گیا ہے اور ساری زندگی کی شدت ان لمحوں میں سمٹ آئی ہے۔

عرصہ دراز کی بات ہے۔ جنوبی ہند کے ایک چھوٹے سے شہر ہندوپور میں ہیضہ کی وبا یوں پھیلی کہ آن کی آن میں سینکڑوں موتیں واقع ہو گئیں۔ ہر گھر سے نوحے بلند ہونے لگے اور اس شہر کے سب سے بڑے گھر میں ایک گیارہ سالہ لڑکا بے سدھ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ بچے کی حالت دیکھ کر ماں کو ضبط کا یارا نہ رہا۔ ماں روتی ہوئی مسجد کی طرف دوڑی۔ آنسو بھری آنکھیں آسمان کی جانب اٹھائیں اور دامن پھیلا کر خدا کے حضور میں صدق دل سے یہ دعا مانگی۔

پاک پروردگار، موت و حیات تیرے ہاتھ میں ہے
میری زندگی میرے بچے کو بخش دے۔ میں اپنے
بچے کی جان کے عوض اپنی جان کی بھینٹ
دیتی ہوں۔

یہ دعا لبوں سے نکلی ہی تھی کہ ماں نڈھال ہو کر بستر سے لگ گئی۔ آہستہ آہستہ اس کی حالت غیر ہوتی گئی اور بچے کی طبیعت سنبھلتی گئی حتیٰ کہ چند دنوں میں وہ پوری طرح صحت یاب ہو گیا اور ماں موت کی نیند سو گئی۔

جنوبی ہند کے ایک غیر معروف شہر کے ایک معزز گھرانے کی ماں کی یہ قربانی آل سس ٹس کی اسطور نہیں بن سکی اور نہ شہنشاہ بابر کی قربانی کی طرح تاریخ کے صفحات میں مرتسم ہوئی۔ لیکن ماں کے ایثار کی یہ کہانی اس علاقہ میں زبان زدِ عام تھی اور یہ سچی کہانی میں بچپن سے سنتی آئی ہوں کیونکہ وہ ماں جس نے اپنے بچے پر سے جان نچھاور کی تھی میری نانی تھیں اور وہ بچہ جس کے لیے یہ قربانی دی گئی میرے نانا ابا تھے جن کے زیرِ سایہ میری پرورش ہوئی اور جو میری زندگی پر اثر انداز ہونے والوں میں سب سے پہلا اور سب سے بلند مقام رکھتے ہیں۔

مدتوں بعد اس شہر میں طاعون کی وبا آندھی کی طرح آئی۔ بے شمار جانیں ضائع ہوئیں۔ گھر کے گھر خالی ہو گئے، ساری بستی ویران ہو گئی۔ لوگوں نے شہر چھوڑ کر بہت دور میدانوں میں خیمے لگا کر پڑاؤ ڈال دیئے۔ نفسا نفسی کا عالم تھا کسی کو کسی کی خبر نہ تھی سب اپنی اپنی جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔ ایسے میں ایک گھر کی بہو کو یہ بیماری لگی تھی۔ بن ماں باپ کی بچی تھی ساس نندیں بھی چھوڑ کر کیمپ میں چلی گئیں۔ صرف ایک نند بیمار کے ساتھ رہ گئی کہ وہ اپنی بھاوج کو اس حال میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ نند بھاوج کا رشتہ کشیدگی، رنجش اور آپس میں جلن کا رشتہ ہوتا ہے۔ نند بھاوج کی محبت کا یہ مثالی نمونہ تھا کہ ایک نند نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر بھاوج کی اس تندہی سے تیمارداری کی کہ دن کو دن نہ سمجھا رات کو رات نہ سمجھی اور لبِ مرگ مریضہ کا سر زانو پر لیے بیٹھی رہی اور بھاوج نے اس کی گود میں دم توڑ دیا۔

یہ دوسری نیک اور نڈر بی بی جنہوں نے اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر طاعون جیسی مہلک، متعدی بیماری میں مبتلا مریضہ کی تنہا دیکھ بھال کی تھی، میری نانی اماں تھیں۔

یہ اگلے وقتوں کی نیک بی بیاں تھیں۔ سوچتی ہوں کہ میں ان دو نیک نڈر بی بیوں کی نہایت بزدل نواسی ہوں۔ میرا اپنا تجربہ اس سے بالکل برعکس تھا۔ آج سے ٹھیک تین سال پہلے جب میں خود موت سے ہمکنار تھی ایک اجنبی ملک میں، اپنے وطن اور عزیزوں سے ہزاروں میل دور، ایک ماہر امریکن ڈاکٹر نے گھنٹوں موت سے مقابلہ کر کے مجھے بچا لیا میری مسیحائی کی گئی۔ رات دن ایک کر کے نہایت جانفشانی اور تندہی سے میری تیمارداری کی گئی حتیٰ کہ میری زندگی کے لیے ایک اور زندگی کی پیش کش کی گئی اور ایک ننھی سی جان مجھ پر بھینٹ چڑھا دی گئی۔

گو اس وقت دو زندگیوں (ماں اور بچے کی) میں سے ایک کے انتخاب کا سوال نہیں تھا اور نہ یہ میرے اختیار میں تھا تاہم اگر یہ انتخاب میرے سامنے اور اختیار میرے ہاتھ میں ہوتا تو کیا میں اپنے بچے کے لیے اپنی جان کی قربانی دے سکتی تھی، نہیں۔ یقیناً مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ جب لوگ پرسہ دینے کے لیے آتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے آپ کی جان بچ گئی۔ آپ کی زندگی زیادہ قیمتی تھی" تو میں احساسِ ندامت میں ڈوب ڈوب جاتی تھی۔

میرے لیے ایک زندگی کی پیش کش کی گئی اور میری پرنانی اور نانی اماں نے اوروں کے لیے اپنی زندگی کی پیش کش کی تھی!

ہندوپور میرا آبائی وطن ہے۔ یہ شہر صوبہ میسور کی سرحد پر واقع ہے ان دنوں مدراس پریذیڈنسی میں تھا اور اب آندھرا پردیش میں شامل ہے میرے آباؤ اجداد باہر سے آتے تھے جنوبی ہند میں بس گئے تھے۔ ہندوپور کے نواح میں ان کی زمینداریاں تھیں اور ہندوپور میں ان کے باغات تھے ہمارے پرنانا ٹیپو خان شہر کے اکابرین میں سے تھے۔ ان کی موت کے بعد کچھ ایسے خاندانی جھگڑے آن پڑے کہ ہمارے نانا جان ٹیپو قاسم خان بدل

صلہ یہ مضمون اوائل جنوری۔ فروری ۱۹۷۴ء میں لکھا گیا۔

ہو کر میسور چلے آئے کہ یہاں "اپنوں سے دور" ایک نئی دنیا بسائیں گے۔

میرے ابا جان قاضی محمد عبدالغفور لڑکپن میں یتیم ہوگئے تھے۔ نانا ابا

قاضی محمد عبدالغفور

نے انہیں اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا۔ بنگلور بھیج کر بنگلور کے سینٹ جوزف کالج میں انہیں تعلیم دلوائی تھی اور اپنی بیٹی کا ان سے بیاہ کر دیا تھا میری امی نور جہاں اکلوتی بیٹی تھیں اور نانا ابا اور نانی اماں انہیں دور نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا امی کو لے کر ابا جان بھی نانا جان کے ساتھ ہی میسور چلے آئے اور یہاں ملازمت اور مستقل سکونت اختیار کرلی۔

یوں میسور میرا وطن بن گیا۔

دنیا کے مختلف ملکوں اور حسین شہروں کی سیر و سیاحت کرنے اور ان میں سے بعض میں قیام کرنے کے باوجود مجھے اب بھی میسور سے اتنا ہی پیار ہے۔ چھوٹا سا صاف ستھرا، خوبصورت شہر، معتدل اور خوشگوار آب و ہوا، حسین باغ، مہاراجہ میسور کا عالیشان محل اور صرف چند میل دور پر وہ بہت بہشت بروئے زمین یعنی کرشنا راج ساگر، رنگین فواروں اور چکا چوند کرنے والی روشنیوں کے ساتھ برنداون گارڈنز جو دریائے کاویری کے بند سے متصل شالامار گارڈنز کی طرز پر بنائے گئے ہیں اور شالامار سے زیادہ حسین ہیں ہر سال میسور کا دسہرہ، وردنتی اور راج محل کے دربار کی رونق ۔۔۔ یہ تھا میسور اور کسی شہر آرزو، کسی بہشت گم گشتہ، کا تصور میرے ذہن میں وابستہ ہے تو وہ شہر میسور سے ہے۔

میسور کا ماحول نہایت خوشگوار تھا۔ ریاست میسور دیسی ریاستوں میں سب سے ترقی یافتہ "موڈل سٹیٹ" سمجھی جاتی تھی۔ مہاراجہ میسور سری کرشنا راج وڈیر (موجودہ مہاراجہ میسور کا چچا) نہایت رعایا پرور اور عدل گستر فرمانروا تھے اور مسلمانوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ دیوان میسور سر مرزا اسمٰعیل کے سیاسی تدبر کا شہرہ تھا۔ ہندو مسلمان یہاں آپس میں رفاقت سے رہتے تھے۔ چھوٹی سی اقلیت تھے لیکن مسلمانوں نے اپنی قومی انفرادیت کو برقرار رکھا تھا۔ یہ سلطان ٹیپو کی سرزمین تھی اور مسلمان یہاں سرخرو اور سربلند تھے۔

مسلمانوں کے ذہن میں اپنے تاریخی ماضی کا تصور بسا ہوا تھا اور میسور ہمارے لیے سلطان ٹیپو کی سرزمین تھی۔ میسور سے صرف آٹھ دس میل کے فاصلہ پر ٹیپو سلطان کا دارالسلطنت سرنگاپٹن واقع ہے۔ سرنگاپٹن کوئی خرابہ نہیں۔ سویا ہوا شہر معلوم ہوتا ہے جہاں ٹیپو کی خوابیدہ روح کا احساس چھپا ہوا ہے۔ گھٹا چھاتی ہے تو اب بھی یوں لگتا ہے جیسے اس آخری رات کی طرح (۴ مئی ۱۷۹۹ء کی) سلطان شہید کی یاد میں بادل آنسو بہانے لگیں گے۔ گمنام گنبد جس کے نیچے حیدر علیؒ اور سلطان شہید محو خواب ہیں۔ دریا دولت باغ جہاں سرو و صنوبر کے درمیان سلطان کا سادہ محل ہے جس کی دیواروں پر میسور کی جنگوں کے نقوش رقم ہیں اور دریائے کاویری کا رومان پرور سنگم، سرنگاپٹن کے یہ سارے تلازمات میسور کے تصور کے ساتھ میرے شعور کا ایک حصہ ہیں۔

میں بہت چھوٹی سی تھی لیکن بچپن کی بعض یادیں بہت واضح ہوتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ غالباً دسہرے کے موقع پر ایک شورش و ہنگامہ برپا ہوا تھا اور چیلنج دیا گیا تھا کہ مہاراجہ صاحب اب کے سر مرزا اسمٰعیل کو ساتھ لے کر نکلیں گے تو انہیں جوتوں کے ہار پہنائے جائیں گے۔ جلوس کی آمد آمد تھی۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے دلوں میں متضاد جذبات موجزن تھے۔ سب کی نگاہیں بے تابی سے محلسرا کی جانب لگی تھیں۔ اتنے میں مہاراجہ کی سواری نکلی۔ وہ حسب معمول ایک نہایت سجے سجائے ہاتھی پر سونے کی عماری میں رونق افروز بڑی شان سے سر مرزا اسمٰعیل کو اپنے پہلو میں بٹھائے نکلے۔ مسلمانوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ غیر مسلموں کے چہرے مرجھا گئے لیکن انہیں ہمت نہ ہوئی کہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنائیں۔ جوتیاں تھامے ہوئے ہاتھ نیچے ہوگئے جوتیاں نہ برسیں، پھول ہی پھول برسے مسلمانوں

کے ہاتھوں ہے۔

ویسے جنوبی ہند میں اور خاص طور پر ریاست میں ہندو مسلمان آپس میں رفاقت سے رہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں فسادات کے زمانے میں بھی ریاست میسور میں امن و امان تھا۔ ریاست بھر میں بہت کم وارداتیں ہوئی تھیں جو نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یہ رفاقت کسی "مشترکہ کلچر" یا ایک دوسرے میں ضم ہونے کی بنا پر نہ تھی۔ مسلمان یہاں چھوٹی سی اقلیت میں تھے لیکن اپنی قومی انفرادیت سختی سے قائم کیے ہوئے تھے۔ مسلمان یہاں سرخرو اور سربلند تھے۔ یہ سرزمین سلطان ٹیپو کی سرزمین تھی۔

میسور میں ہمارا گھر ـــــــ یعنی وہ ایک گھر جس سے اپنے گھر کا تصور وابستہ ہے، جہاں میرے بچپن اور نوجوانی کے دن گذرے۔ عیدگاہ محلے میں ہے۔ عیدگاہ سے بہت قریب اونچائی پر پرانی وضع کا یہ تنہا بنگلہ تھا۔ بڑے بڑے ستونوں اور قوسوں والا بہت بڑا ہال۔ برآمدے اور بہت سے کمرے جن کی ترتیب عجب بے ڈھنگی تھی اونچی دیواروں والا بڑا سا کامپاؤنڈ اور تینوں جانب کمپاؤنڈ کی دیواروں کے ساتھ ساتھ اونچے اونچے درخت پیچھے صحن میں مختلف پھلوں کے درخت اور سامنے چمپا چنبیلی کی بیلیں کمان بناتی تھیں۔ بھرا ہوا گھر ان افراد پر مشتمل تھا۔ نانا جان، ابا جان، امی ہم چار بہنیں اور دو سب سے چھوٹے بھائی۔ بھائی بہنوں میں میں سب سے بڑی تھی۔

چونکہ "پہلوٹھی کی بچی" تھی مجھے ابا امی نے نہیں نانا نانی نے لاڈ پیار، ناز و نعم سے پالا۔ ابا نو عمر تھے اور لاپرواہ سے اور امی میری پیدائش کے وقت خود بھی بچی تھیں۔ پندرہ سال کی چھوٹی سی لڑکی۔ نانی اماں نے مجھے اپنے ہاتھوں میں لیا اور محبت سے پالا پوسا۔ نانی اماں سے ایک بڑھی عورت کا تصور ابھرتا ہے۔ لیکن میری نانی جوان اور حسین تھیں۔ ان کے مزاج میں نفاست تھی اور کپڑے پہننے کا انہیں بڑا سلیقہ تھا۔ سفید یا ہلکے پیشل رنگوں کے کپڑے پہنتی تھیں۔ کشیدہ کاری کیے ہوئے جو ان پر بہت سجتے تھے۔ ان کی تصویر میرے ذہن میں اب بھی تازہ ہے۔

نانی اماں خلیق، ملنسار اور مہمان نواز تھیں۔ ساتھ ہی جہاندیدہ اور تجربہ کار بھی۔ اس کے برعکس میری امی بہت ہی معصوم، ناتجربہ کار، گوشہ نشین خوشحال گھرانے کی اکلوتی اولاد۔ انہیں دنیا جہاں سے محفوظ رکھا گیا۔ نہ باہر کہیں آنا جانا، نہ لوگوں سے ملنا جلنا، ہنسنا بولنا۔ مکمل (RECLUSE) بن کر ساری زندگی انہوں نے یونہی گذار دی۔ اب کہ وہ بیوہ ہو گئی ہیں۔ نانا جان کی خدمت گذاری میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں اور یہی گویا ان کی زندگی کا "مشن" ہے۔

میری امی کا تصور میرے لیے ہمیشہ بہن کا سا رہا۔ ان کا سلوک بھی ہم سے بہنوں کا سا تھا۔ ہم بلا جھجک دل کی باتیں انہیں بتا دیا کرتے تھے حتیٰ کہ شادی بیاہ کے معاملوں میں اپنے انتخاب کا ان پر اظہار کر دیا کرتے تھے۔ میں اپنی ماں کو آپا کہا کرتی تھی اور نانی اماں کو اماں کہ وہ سچ مچ میری ماں تھیں۔

میں چھ سات سال کی تھی کہ یہ محبوب ہستی جسے میں ماں سمجھتی تھی مجھ سے چھن گئی۔ نانی اماں کی موت میرے بچپن کی سب سے غمگین اور گہری یاد ہے۔ اس چھوٹی عمر میں میں پہلی دفعہ موت کی حقیقت سے دوچار ہوئی گو موت کے راز کو سمجھنے کا مجھ میں ادراک نہ تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کے بے جان جسم کو دیکھتی رہی، جنازے کے ساتھ گئی ان کے محبوب آم کے باغ میں انہیں دفن ہوتے دیکھا۔ رات رات بھر نانا جان کی آہ و فغاں سنی۔ ان کی تڑپ اور بے پناہ کرب و اضطراب دیکھا۔ نانا جان اور نانی اماں کا مثالی جوڑا تھا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اس زمانے میں ان کی محبت کی شادی ہوئی تھی۔

جب ان کا انتقال ہوا نانی اماں کی عمر بیالیس تینتالیس سال کی ہوگی۔ نانا جان کی عمر بھی اس وقت کچھ زیادہ نہ تھی لیکن انہوں نے لوگوں کے مجبور کرنے کے باوجود دوبارہ شادی نہیں کی اور ان کی چھوڑی ہوئی ایک نشانی اپنی اکلوتی بیٹی اور نواسیوں نواسوں کے لیے (یعنی ہمارے لیے) اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔

اپنی موت سے بارہ دن پہلے نانی اماں میسور سے ہندو پور جانے کے لیے بے قرار ہو اٹھی تھیں گویا ایک ندائے غیب تھی کہ انہیں بے اختیار اپنی جانب کھینچ رہی تھی اور اپنے آبائی وطن کی مٹی انہیں نصیب ہوئی۔

وطن کی مٹی کی کشش کتنی زبردست ہوتی ہے۔ چاہے کوئی ساری

عمر باہر گزار دے۔ آخر میں یہ مقناطیسی کشش اپنی جانب کھینچ ہی لیتی ہے اور اپنی مٹی وطن کی مٹی میں مل جاتی ہے۔ میری اپنی زندگی ایک مستقل سفر بن گئی ہے۔ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف مغرب سے مشرق اور مشرق سے مغرب کی طرف۔ نہ جانے کہاں کس دیارِ غیر میں موت آئے گی اور کونسی مٹی نصیب ہوگی۔ بہرحال ساری زمینیں اللہ کی ہی ہیں اور کبھی یوں محسوس ہوتا ہے ساری دنیا ہی اپنا وطن ہے۔

میرا وطن کونسا ہے؟ ہندوپور جہاں میرے بزرگ رہتے آئے ہیں اور جہاں میں پیدا ہوئی یا میسور جہاں میں پلی بڑھی، تعلیم حاصل کی شادی کی بچپن اور نوجوانی کا زمانہ گزرا اور جہاں اب بھی میرے نانا جان، امی، بہنیں بھائی سبھی رہتے ہیں یا پاکستان جس کی تقدیر سے میں نے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا ہے اور جو میرا روحانی وطن ہے۔

ہمارے آبائی وطن ہندوپور کی مٹی نے ایک اور ہستی کو جو میرے قریب تھی یا قریب ہونی چاہیئے تھی اپنی آغوش میں لے لیا۔ یہ میرے اباجان تھے ابھی ایک سال کا عرصہ بھی نہیں ہوا کہ پچھلی عید الفطر کے دو ہفتہ بعد ۱۵ مارچ ۱۹۶۳ء کو میرے اباجان رحلت فرما گئے۔

موت ہمیشہ بے درد نہیں ہوتی۔ یہ قیدِ حیات و بندِ غم سے آزادی کا پیام لاتی ہے۔ آخری عمر میں اباجان کی زندگی کچھ ایسی حسرتناک تھی کہ موت ان کے لیے رہائی کا باعث بنی۔ طویل بیماری نے دل، جگر، پھیپھڑے سب تباہ کر دیئے تھے۔ تفکرات اور پریشانیوں میں گھرے ہوئے وہ زندگی سے بیزار تھے۔ میں نے دل کڑا کر کے سوچا شاید موت ان کے لیے رحمت تھی۔

اباجان کی موت کی صرف ایک اطلاع۔ ایک منحوس خبر مجھ تک پہنچی۔ میں اس وقت ڈھاکہ مشرقی پاکستان میں تھی۔ سینکڑوں میل دور۔ نہ ان کا آخری دیدار کر سکی۔ نہ ان کی کوئی خدمت مجھ سے ہو سکی۔ یہ سعادت میری سب سے چھوٹی بہن نجمہ نسرین کو نصیب ہوئی۔ جو ان کی سب سے چہیتی بیٹی تھی اور جس کے گھر میں اباجان نے اپنے آخری دن گذارے تھے میری چھوٹی بہن نجمہ نسرین نے مجھے یہ اطلاع دی تھی اور اپنے سادہ جملوں میں ابا کے آخری دنوں۔ آخری سفر، ان کی موت اور تجہیز و تکفین کی تصویر کھینچی تھی۔

میری بہن کے قلم میں اظہار کی قوت نہیں لیکن اس کے خط میں بے پناہ خلوص اور سچا درد و کرب تھا۔ ایک ایسا معصومانہ خلوص جو شاید اپنے اندر نہیں پاتی SOPHISTICATION نے مجھ پر تصنع کا ایک ہلکا سا ملمع چڑھا دیا ہے...... میری بہن نے اپنے سادہ جملوں میں ابا کے آخری دنوں، آخری سفر ان کی موت اور تجہیز و تکفین کی ایسی تصویر کھینچی تھی کہ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا میں ڈاکٹر ژواگو کا آغاز اور انجام پڑھ رہی ہوں بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں اور اس حقیقی المیے کے مرکزی کردار میرے اپنے ابا ہیں۔

اباجان کی چونسٹھ سالہ زندگی کا بیشتر حصہ میسور اور بنگلور میں گذرا تھا۔ لیکن مرنے سے صرف دو دن پہلے وہ بضد ہو گئے تھے کہ ہندوپور جائیں گے۔ ہندوپور میں ان کا کوئی نہ تھا۔ ماں باپ، بہن بھائی سب انتقال کر چکے تھے اور میسور میں ان کی بیوی۔ بیٹے بیٹیاں (سوائے میرے) سبھی موجود تھے لیکن ایک بے نام آواز تھی کہ انہیں بلا رہی تھی۔ وطن عزیز کی مٹی انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ٹرین میں اپنے آخری سفر پر روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے کمپارٹمنٹ کی کھڑکی کھول لی اور لیٹے لیٹے ہی باہر نظریں جمائے رہے۔ انہیں ہر لمحہ یہ اندیشہ ستاتا رہا کہ کہیں غفلت میں آنکھ نہ لگ جائے اور ایسے میں ہندوپور کا اسٹیشن نہ نکل جائے۔ رات بھر وہ جاگتے رہے اور ٹکٹکی باندھے کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے۔ ہندوپور کا اسٹیشن آ گیا تو ان کے بے جان لبوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ نمودار ہوئی ان کی منزل آ گئی تھی۔ آخری منزل!

اپنے نرم اور حساس ظاہر کے پس پردہ شاید میں بہت سخت دل ہوں۔ میں نے باپ کی موت کا وہ سوگ نہیں منایا جو ایک بیٹی کو منانا چاہیئے۔ میں نے باپ کی موت کو اس طرح محسوس نہیں کیا جس طرح دو سال پہلے اپنے نوزائیدہ بچے کی موت کو محسوس کیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ طویل جدائی ہو۔ پاکستان آنے کے بعد، پندرہ سال میں اپنے ماں باپ سے دور رہی ہوں اور اس دوران میں شاذ ہی چند ہفتے اباجان کے ساتھ گذارے ہوں گے۔ اس پندرہ سال کے طویل عرصے میں ہم دو ہی مرتبہ ہندوستان گئے تھے اور وہ بھی قلیل مدت کے لیے۔ لیکن کیا یہ طویل زمانی و مکانی فاصلہ بھی باپ بیٹی کے اتنے قریب اور گہرے رشتہ کے نشان دھندلا سکتا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں اس حقیقت کو

ابھی طرح سمجھ گئی تھی کہ موت اباجان کے لیے ایک تکلیف دہ زندگی سے نجات کا باعث تھی۔ اس میں خدا کی مصلحت تھی اور ہمیں صبر و شکر سے کام لینا چاہیئے۔

اباجان میرے لیے ایک دوست تھے۔ وہ آزاد خیال اور وسیع المشرب واقع ہوتے تھے اور ہم پر کسی قسم کی پابندی لگانے کے قائل نہ تھے۔ وہ مجھے پڑھنے لکھنے سے نہیں روکتے تھے۔ کتابیں کہیں سے مانگ تانگ کر چھپ چھپ کر پڑھنے کی مجھے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ اچھی ادبی کتابیں وہ خود لا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب میں نو برس کی تھی وہ میرے لیے مرزا محمد سعید کی کتابیں۔ شرر اور راشد الخیری کے ناول اور منشی پریم چند کی ساری کتابیں لے آئے تھے۔ اس دور کے معیاری ادبی رسائل بھی منگواتے تھے۔ یوں مجھ میں بچپن ہی سے ادب سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔

ابتدائی تعلیم بھی میں نے کسی کانونٹ یا سکول میں نہیں بلکہ گھر پر اباجان ہی سے حاصل کی تھی۔ چنانچہ میری ابتدائی ذہنی اور ایک حد تک ادبی تربیت کے ذمہ دار اباجان ہیں اور میری مذہبی اور اخلاقی تربیت ناناجان کے زیر سایہ ہوئی۔ یوں تو اباجان، امی، نانی اماں اور ناناجان ان سب نے اپنے اپنے طور پر میری پرورش اور تربیت میں حصہ لیا ہے اور ان سب کی متضاد کرداری خصوصیات میری شخصیت میں غیر محسوس طور پر گھلی ہوئی ہیں۔ سب سے غالب اثر میری زندگی پر اور خصوصیت سے ابتدائی نصف زندگی پر ناناجان کا رہا ہے۔

ناناجان کو ہم جان بلاتے تھے اور وہ حقیقتاً ہمارے گھر کی اور سب کی "جان" تھے۔ بہت ہی نیک۔ شریف النفس۔ ثقہ۔ وضع دار بزرگ تھے۔ میرے نانا ابا۔ ٹیپو قاسم خان، سوتی کپڑے کی گول ٹوپی، سفید کرتہ اور سفید دھوتی یا پاجامہ میں ملبوس، سفید براق داڑھی۔ نورانی چہرہ جو رنگ کی صباحت سے زیادہ ایک باطنی نور کا آئینہ دار ہے۔ یوں لگتے ہیں جیسے تاجکستان، روسی ترکستان اور ازبکستان کی تصویروں میں سے باہر نکل آئے ہوں۔ کہتے ہیں کہ جوانی میں وہ بڑے جامہ زیب تھے۔ ولایتی کپڑے پہنتے تھے۔ پھر خلافت کی تحریک میں انہوں نے مستعدی سے حصہ لیا تھا اور اپنے سارے ولایتی کپڑے "نذر آتش" کر دیئے تھے۔ اس وقت سے وہ یہی سادہ لباس زیب تن کئے رکھتے ہیں۔ بڑے ثقہ وضع دار بزرگ

نانا ٹیپو قاسم خان

ہیں۔ ناناجان جوانی ہی میں اہل حدیث فرقہ میں شامل ہو گئے تھے۔ لہٰذا پیوریٹن قسم کے عقائد رکھتے تھے۔ ہم سب کی زندگی بھی سخت پیوریٹن نوعیت کی تھی۔ فاتحہ، نیاز کوئی رسم و ریت روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ ہم سب ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ قرآن کی باقاعدہ تلاوت اور صوم و صلواۃ کے پابند تھے۔ فروعی مسئلوں کے پیچیدہ باریکیوں میں گئے بغیر ہم نے مذہب اسلام کی سادہ پاکیزگی کو اپنایا تھا۔

خواہ کوئی مذہبی پابندی ہو یا روزمرہ کے معمولات میں پابندی یا اخلاقی حدیں ——— ہمیں یہ بالکل احساس نہ ہوتا تھا کہ ہم پر کوئی دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ ہم بخوشی اس راستہ پر چل رہے تھے اور نانا ابا کی تعلیمات اور نصیحتوں کو سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ شرافت اور سادگی کی زندگی بسر کرنا کبھی جھوٹ نہ بولنا دوسروں کی دل آزاری نہ کرنا۔ کسی کی برائی اور غیبت نہ کرنا۔ امارت اور شہرت یا کسی بھی بات پر غرور نہ کرنا یہ سارے اصول جو اسلامی اصول تھے غیر محسوس طور پر ہماری زندگی کے معمول میں شامل ہو گئے تھے۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے۔ سچ بولنا۔ حتیٰ کہ اپنے آپ سے سچ بولنا کتنا مشکل مرحلہ ہے لیکن ان دنوں واقعی ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے تھے۔ ٹیپو قاسم خان کی نواسی اور جھوٹ بولے ناممکن سی بات تھی۔ ہم تینوں بہنیں کبھی خلوت میں بھی کوئی بیہودہ

باتیں نہ کرتی تھیں۔ عجب سادہ اور پاکیزہ زندگی تھی۔ اس وقت نیکی اور بدی کا میرے پاس سفید و سیاہ کا تصور تھا۔ کوئی درمیانی رنگ نہیں تھا اور نیکی اور پرہیزگاری کی زندہ مثال میرے لیے نانا ابا تھے۔

میرے اس دورِ معصومیت میں جب میری زندگی سادہ اور پاکیزہ تھی، مجھے چند ایسے تجربات پیش آئے اور میں نے ایسے وژن خواب کی صورت میں دیکھے ہیں جن کی نوعیت MYSTIC قسم کی ہے۔ میں ان دنوں اکثر عجیب خواب دیکھا کرتی تھی۔ میری امی کی ایک پھوپھی تھیں، عائشہ خانم جنہیں ہم بھی عاشو پھوپھی بلایا کرتے تھے۔ وہ اکثر ہمیں ایسی باتیں بتایا کرتی تھیں کہ جب خدا کے کسی نیک بندے کو موت آتی ہے تو موت کا فرشتہ نہایت حسین شکل میں اپنے دائیں پنکھ پر جنت لیے آتا ہے اور جب وہ کوئی بد روح قبض کرنے آتا ہے تو اس کی شکل نہایت ڈراؤنی ہوتی ہے اور اس کے بائیں پنکھ پر دہکتی دوزخ ہوتی ہے۔ وہ ہمیں قیامت کے آثار اور روزِ حشر کے قصے بھی سنایا کرتیں۔ کچھ ان کی باتیں ذہن میں رہ گئی تھیں اور قرآن شریف کے وہ حصے پڑھ کر جن میں قیامت کا ذکر ہے میں مسلسل کئی دن قیامت کے NIGHTMARISH خواب دیکھتی رہی کہ سورج سوا نیزے پر ہے، چاند اور سورج کا نور ماند پڑ گیا ہے آسمان پگھلے ہوئے تانبے کا سا ہو گیا ہے۔ سورۃ القیامت، سورۃ المعارج، سورۃ تکویر اور انفطار وغیرہ کے سارے مناظر سامنے ہیں خوف کی کپکپی طاری ہے اور میں سجدہ ریز ہو گئی ہوں۔ عجب خدا ترسی کا عالم تھا۔ پھر اچانک یہ سب کچھ نظروں سے غائب ہو گیا اور ہر طرف نور ہی نور چھا گیا۔ مجھے احساس ہوا یہ نورِ الٰہی ہے جو خیرہ کن ہونے کے باوجود انتہائی طمانیت بخش ہے۔ پھر برسوں بعد آج سے تین سال پہلے جب حقیقت میں میں نے موت کو اپنے بہت قریب محسوس کیا تھا مجھے اس طمانیت بخش نور کی، اس نفسِ مطمئنہ کی جستجو تھی (اس کیفیت کو میں نے اپنے افسانہ "کفارہ" میں بیان کیا ہے۔)

انہیں دنوں میں نے ایک اور خواب میں آنحضرت صلعم کو دیکھا کالی کملی والے بزرگ میرے قریب آئے۔ انہوں نے مجھے بتایا وہ رسول اللہ صلعم ہیں۔ گیسوئے دراز، نورانی چہرے کا وہ جمال کہ دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ دستِ مبارک میرے سر پر رکھا اور مجھے دعائیں دیں کہا کہ میں بہت اچھی لڑکی ہوں اور تاکید کی کہ آئندہ بھی اسی راہ پر قائم رہنا۔ رسول ﷺ کا دیدار اس وقت ہوا تھا جب میری زندگی واقعی سادہ اور معصوم تھی۔ اب کسی شدید کشمکش کے موقع پر میں اس دستِ مقدس کے لمس کو یاد کرتی ہوں اور گھبرا کر سوچتی ہوں کہ کیا اب بھی مجھ میں وہ اچھائی ہے؟ اور کوئی خاطر خواہ تسکین بخش جواب نہیں پاتی۔

نہیں معلوم میرے تخیل کی شدت اور ارتکاز سے یہ ظہور ہوا تھا یا خداوند تعالےٰ کا کرم تھا کہ میں نے یہ وژن دیکھے اور روحانی (ELATION) محسوس کیا، عقیدہ راسخ تھا، شکوک و شبہات دل میں جگہ نہ پاتے تھے۔ میں سادگی سے ہر بات پر ایمان لے آتی تھی اب میں خود اپنے بچوں کے "استہفامیہ دماغ" دیکھتی ہوں اور ان کو اس کم سنی میں، ایمان و عقل، جبر و اختیار، تقدیر و تدبیر کے سے مسئلوں پر خاصے انٹلکچوئیل انداز میں بحث کرتے سنتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔

یہ میری نوجوانی کا وہ دور تھا جب میری زندگی "محفوظ" (SHELTERED) تھی۔ میں نے زندگی کی پیچیدگیاں نہیں دیکھی تھیں دنیا کی ترغیبوں اور برائیوں کا سامنا نہیں کیا تھا۔ اب میرے لیے نیکی اور بدی کا سیاہ اور سفید کا تصور کئی رنگوں میں بٹ گیا ہے۔ اب باہر کی دنیا دیکھ کر اور مختلف ملکوں اور تہذیبوں کے درمیان رہ کر یہ محسوس کیا ہے کہ مختلف قوموں کی اخلاقی قدریں جدا ہیں۔ ان کی حد بندیاں الگ ہیں۔ ادب کے وسیع مطالعے نے یہ سمجھایا ہے کہ انسانی فطرت بہت پیچیدہ ہے۔ نیکی اور بدی کا مرکب اور جن لوگوں میں بعض برائیاں ہیں وہ دوسری حیثیت سے اچھے بھی ہو سکتے ہیں۔

گراہم گرین نے کہا ہے:-

"IT IS EASY TO SYMPATHISE
WITH THE UNJUSTLY CONDEMNED
THE DIFFICULT THING IS TO SYMPATHISE
WITH THE JUSTLY CONDEMNED."

شاید یہ کچھ یہ وسیع المشربی اور رواداری کا جذبہ مجھ میں پیدا

ہو گیا ہے۔ میرے شوہر شاہین کہتے ہیں کہ "نیکی اور بدی کے اس مرکب تصور کو اور اس "رواداری" کے جذبہ کو تم ادب کی حد تک ہی محدود رکھو ورنہ زندگی کے لیے اور خصوصیت سے اپنی ذاتی زندگی کے لیے تمہارے نانا ابا کی دی ہوئی تربیت اور ان کی قائم کی ہوئی حدیں ہی ٹھیک ہیں۔" شاہین خود بھی بہت پڑھے لکھے ماڈرن اور آزاد ہونے کے باوجود ثقہ پیورٹن اصولوں کے پابند ہیں۔ نماز روزے کے خواہ وہ پابند نہ ہوں انہوں نے بھی ایک پاکیزہ زندگی بسر کی ہے۔

نانا ابا کی تعلیمات تو اسلام کی تعلیمات ہی تھیں پھر ان سے کیسے روگردانی کی جا سکتی تھی؟ اپنے زمانے کے اعتبار سے وہ روشن خیال بزرگ تھے۔ شادی بیاہ کے معاملوں میں انہوں نے لڑکیوں کی اپنی مرضی کا خاص خیال رکھا۔ وہ لڑکیوں کی اعلےٰ تعلیم کے حامی تھے۔ ہم سب بہن بھائیوں کو انہوں نے گریجویٹ ہونے تک کالجوں میں تعلیم دلوائی بلکہ میرے چھوٹے بہن بھائیوں کو ابتدائی تعلیم کے لیے کونونٹ میں داخل کر دیا۔ جب میری باری تھی تو انہوں نے کہہ دیا تھا:۔

"جس عمر میں کونونٹ کی لڑکیاں میٹرک یا
سینئر کیمبرج کرتی ہیں۔ ہماری تاج بیٹا تو اس
عمر میں بی اے کرے گی"۔

اور ہوا بالکل یہی اور ان کی بات صحیح ثابت ہوئی۔ چنانچہ مجھے ابتدائی تعلیم کے لیے کسی کونونٹ یا سکول میں داخل نہیں کرایا گیا۔ گھر پر امی پھر ابا جان نے تعلیم دی اور ایک بڑی جماعت میں ایک نیم انگریزی اسکول میں داخل کرایا گیا وہاں سے ڈبل پروموشنز لے کر میں بہت جلد مہارانی ہائی اسکول آ گئی۔ پھر وہاں سے مہارانی کالج۔ مہارانی ہائی سکول اور مہارانی کالج لڑکیوں کے لیے بہترین تعلیمی ادارے تسلیم کئے جاتے تھے۔ میسور یونیورسٹی کا معیار تعلیم بہت اونچا تھا اور اتنا سخت گیر کہ وہاں انٹرمیڈیٹ اور بی اے میں برسوں میں کوئی ایک فسٹ کلاس نکل آتا تھا۔ وہاں کا سیکنڈ ڈویژن ہی فسٹ ڈویژن کے برابر سمجھا جاتا تھا اور پھر کسی نے ریاست بھر میں کوئی رینک (درجہ) بھی حاصل کر لیا تو سمجھو ذہانت کی سند مل گئی بی۔ اے کرنے کے بعد میسور یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کا میرے لیے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم تھی جس کے نانا ابا سخت مخالف تھے۔

نانا ابا کی تعلیمات تو اسلام کی تعلیمات ہی تھیں پھر ان سے روگردانی کیسے کی جا سکتی تھی؟ ہم پر کسی دباؤ کا احساس نہ تھا اور نہ ہم میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ عنفوان بلوغیت کی اس قید و بند نے میرے سائیکی "PSYCHE" پر اثر ڈالا ہو اور میری شخصیت اس طرح نہ ابھر سکی ہو جس طرح کہ ایک آزاد فضا میں اس کے ابھرنے کا امکان تھا۔ تاہم مجھے اس وقت یہ مطلق احساس نہ ہوا تھا کہ یہ قید و بند میرے لیے مضر ہے اور نہ کسی قسم کی گھٹن اور فرسٹریشن کا احساس تھا (آزاد زندگی میں اور طرح کے فرسٹریشن اور جذباتی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں) شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے گھر کا ماحول خوشگوار تھا۔ میرا ہائی سکول اور کالج کا کیریئر بہت اچھا رہا۔ عزیز سہیلیوں کے درمیان کالج کی زندگی ——— (STIMULATING) اور فرحت انگیز تھی۔ پردے کی پابندی بھی پابندی معلوم نہ ہوتی تھی کیوں کہ میسور اور بنگلور میں پردے کا رواج عام تھا (یہاں عورتیں اور لڑکیاں برقعے نہیں پہنتی تھیں — تانگوں پر پردے اور کاروں میں بلائنڈز لگے تھے) اور سبھی معزز گھرانوں کی تعلیم یافتہ لڑکیاں پردہ کرتی تھیں۔

نانا جان کا یہ رویہ درست ہی تھا کہ کم از کم بیاہ ہونے تک لڑکیوں کو ایک حد میں رکھا جائے۔ اس کے بعد ان کے شوہروں کی مرضی پر منحصر ہے جس قدر چاہیں آزادی دیں۔ اب نانا جان میری بے پردگی کا برا نہیں مانتے اور نہ ہی انہیں میرے افسانوں اور مضامین پر کوئی اعتراض ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اب وہ بھی وسیع المشرب ہو گئے ہیں یوں بھی اپنے زمانے کے اعتبار سے وہ روشن خیال بزرگ تھے۔ چنانچہ جب میں نے مہارانی کالج بنگلور سے بی۔ اے کر لیا تو پھر کئی سال بعد میں نے کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔

کالج کی زندگی کا دور، زندگی کا بہترین دور ہوا کرتا ہے۔ میری زندگی میں اور بھی پررونق اور مسرتوں سے معمور دور آئے ہیں لیکن اس زمانے کی اور نوخیزی کی سادہ مسرتوں کی بات ہی اور تھی۔ میں کالج میں پروفیسرز اور لیکچررز کی "فیورٹ" تھی۔ ہمارا کالج سٹاف ان دنوں بہت اچھا تھا (اب وہ بات نہیں رہی) پروفیسرز اور لیکچررز مرد اور عورتیں سب آکسفورڈ، کیمبرج، لندن، جرمنی کے پڑھے ہوئے علمی قابلیت رکھتے تھے۔ میں لڑکیوں میں بھی ہردلعزیز تھی (یہ بات میرے حق میں اچھی ثابت نہ ہوئی کہ میں گھر پر بھی سب کی چہیتی لاڈلی تھی بچپن ہی سے "CHILD PRODIGY" سمجھی جاتی تھی اور سکول کالج میں بھی تحسین کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ چنانچہ مجھ میں "نارسیت" اور خود پسندی پیدا ہو گئی) میری بڑی اچھی سہیلیاں تھیں، معزز گھرانوں کی مسلمان ہندو اور عیسائی لڑکیاں بہترین اور گہری دوستیاں اسی زمانے میں ہوا کرتی تھیں۔

میری بہترین اور سب سے عزیز دوست ("انگوائی" کی زرینہ اور "آئینہ" کی زینی) مرزا مہرین غازی تھیں۔ ایرانی نژاد تھیں اور سر مرزا اسمٰعیل کی رشتہ کی بھانجی لگتی تھیں (آجکل وہ اپنے میاں کے ساتھ تہران میں رہتی ہیں) وہ مجھ سے اکثر کہا کرتیں۔

ممتاز تم کالج کی سب سے ذہین لڑکی ہو اور تمہارے نانا جان ہیں کہ ایسی لڑکی کو سات پردوں میں چھپا رکھا ہے اس کے باوجود شہر بھر میں تمہارا شہرہ ہے۔ تمہارے نانا جان نے تمہیں اس قدر قید و بند میں نہ رکھا ہوتا تو نہ جانے تم کیسے چمکتیں، تمہاری پرسنلٹی کیسے ابھرتی۔ ان دنوں بھی جب میں بنگلور کے مہارانی کالج سے بی۔ اے کر رہی تھی اور ہوسٹل میں مجھے آزادی میسر تھی میں نے کوئی ایسی بات نہ کی تھی جو میرے نانا ابا کو ناگوار گزرتی گو وہ بنگلور میں موجود نہ تھے لیکن غائبانہ طور پر ان کی موجودگی کا احساس چھایا رہتا تھا۔

صرف ایک مرتبہ انہوں نے کہا تھا "تاج بیٹیا (وہ میرے پیدائشی نام ممتاز محل کی مناسبت سے مجھے پیار سے تاج بلایا کرتے تھے یا جنوبی ہند کے دستور کے مطابق "تاجماں") اللہ تعالےٰ نے تمہارے قلم کو اظہار کی قوت بخشی ہے اسے اصلاحی کاموں کے لیے وقف کرو۔ افسانوں اور تنقید پر اسے کیوں ضائع کرتی ہو"؟ میں نے جواب دیا "نانا جان ادب بھی اصلاح کا ایک ذریعہ ہے اس کا اثر غیر محسوس طور پر زیادہ گہرا اور دیرپا ہوتا ہے"۔ یہ جواب سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ اب سے تین سال پہلے جب ہم بنکاک سے واپسی پر میسور گئے تھے۔ نانا ابا خود افسانوی انداز میں اپنی سوانح لکھ رہے تھے۔

انہیں میرے شوہر سے کوئی شکایت نہیں تھی اگر شکایت تھی تو بس اتنی کہ وہ مجھے نہ صرف پاکستان لے گئے بلکہ دنیا جہاں میں جانے کہاں، کہاں لیے گھوم رہے ہیں۔ دس دس سال تک "بچی" کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ بے چارے نانا ابا! انہوں نے کتنی محنت سے ہمیں پالا پوسا، ہم سے کتنی محبت کی۔ ان کی اس بے اندازہ محبت کا جواب میرے پاس کیا ہے؟ لیکن وہ اب بھی میرے لئے دنیا بھر میں دو چار محبوب ترین ہستیوں میں سے ہیں اور اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ عزیز ہیں اور آج تک ان کی شخصیت کا اثر میری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔

نانا ابا کی ثقاہت، پاکیزگی اور پرہیزگاری، ابا جان کی دیتے لشرولی لبرل خیالات، آزاد اور بے فکر زندگی، عیش کوشی اور آرام طلبی، امی کی سادگی، معصومیت، دنیا سے بے پروائی اور ناتجربہ کاری، صبر و قناعت اور گوشہ نشینی اور نانی اماں کا خلق، ملنساری، ہردلعزیزی خوش ذوقی اور نفاست یہ سب متضاد اثرات اور خصوصیات غیر محسوس طور پر میرے کردار اور شخصیت میں گھلے ہوئے ہیں لیکن یوں کہا جا سکتا ہے کہ میری ابتدائی نصف زندگی پر نانا ابا کا اور بقیہ نصف (نصف سے کچھ زیادہ) زندگی پر میرے شوہر صمد شاہین کا اثر سب سے غالب رہا ہے۔ ○

بی اے ہونے تک میرے سترہ سال پورے ہوتے تھے اور نانا جان کے خیال میں شادی کے لیے یہ بالکل مناسب عمر تھی چنانچہ اسی عمر میں اسی سال ۲۳ راگست ۱۹۴۲ء کو میری شادی صمد شاہین سے ہو گئی۔ میرا بیاہ بغیر کسی رسم و ریت کے نہایت سادہ انداز میں ہوا۔ نانا ابا سادگی پسند تھے رسومات کے قائل نہ تھے اور جو نانا ابا کی رائے تھی، وہی ابا، امی کی بھی رائے تھی نہ مجھے مایوں بٹھایا

ممتاز شیریں اور صمد شاہین

گیا نہ مہندی کی رسم ہوئی نہ جنوبی ہند کے دستور کے مطابق "شکرانے" کی رسم۔ حتیٰ کہ آرسی مصحف کی رسم بھی ادا نہیں کی گئی۔

میری شادی گویا مشرق کی "طے ہوئی" اور مغرب کی "محبت کی شادی" کے بین بین درمیانی نوعیت کی تھی۔ یعنی دونوں گھر والے بھی رضامند تھے اور ہم دونوں کی اپنی مرضی اور پسند بھی تھی اور میں نے ایک خالص مشرقی لڑکی کی طرح اپنے ہونے والے شوہر سے محبت کی تھی۔ ہمارے ٹھیٹ مشرقی گھرانے میں مغربی انداز کی "کورٹ شپ" کا کوئی دخل نہ تھا لیکن نانا ابا نے اس بات کی اجازت دیدی تھی کہ ہم دونوں ——— یعنی شاہین اور میں کسی "شاپرون" کی موجودگی میں ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔

صمد شاہین کی عمر اس وقت ۲۵، ۲۶ سال کی تھی۔ سجیلے، جامہ زیب اور وجیہہ نوجوان تھے، طرحدار شخصیت کے مالک (اور اب بیس اکیس سال بعد بھی ان میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور نہ اس طویل قربت نے میرے پہلے تاثر کو ذرا لو ترن میں تبدیل کیا ہے) وہ ابھی طالب علم تھے پونا اور بمبئی میں ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کے لیے ٹرمز ڈال رہے تھے۔ ابھی شادی کا ارادہ نہ تھا لیکن جب وہ چھٹیوں میں گھر آئے تو ان کے چھوٹے بھائی صادق سہیل نے انہیں رضامند کرلیا۔ شاہین اپنے چھوٹے بھائی سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ یہ دو بھائی جو چودہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں گویا ایک جان دو قالب ہیں۔ صادق سہیل سب سے چھوٹے ہونے کے باوجود بہت سنجیدہ، ذمہ دار، دور اندیش اور دانشمند ہیں اور خاندان اور گھر کے سارے معاملوں میں انہیں کا دخل ہے۔ چنانچہ وہی میرے لیے پیام لے آئے تھے اور سارے انتظامات اور امور انہوں نے طے کیے تھے۔

جب نانا ابا نے منظوری دیدی، اس رشتہ کو منظور کرلیا اور بات پکی ہوگئی تو انہوں نے مجھے بلا کر کہا "تاج بیٹی تمہارے لیے یہ انتخاب بہت موزوں رہے گا۔ تم دونوں کا جوڑا بہت اچھا ہے۔ تم لکھنے پڑھنے کی شوقین ہو اور صمد بھی تمہارے ہم ذوق ہیں۔ بات طے کرنے سے پہلے میں نے تمہارا ارادہ بھی معلوم کرلیا تھا۔ تمہاری امی اور بہنوں کے ذریعہ مجھے علم ہوگیا تھا کہ تم بھی صمد کو بہت پسند کرتی ہو۔ بیٹی ان کی دو باتوں سے میں خاص طور پر متاثر ہوا ہوں ایک تو یہ کہ تمہارے منگیتر نے صاف انکار کردیا کہ ہماری جانب سے کوئی جہیز اور پیسہ حتیٰ کہ زیور بھی نہ دیا جائے۔ آج کل کے نوجوانوں میں یہ بات کہاں ہوتی ہے؟ گو ان کے پاس بھی خدا کا دیا سب کچھ ہے وہ ریاست میسور کے متمول ترین کافی پلانٹرز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اپنے خاص کافی اسٹیٹ ہیں لیکن ان کے کافی کے باغات سے زیادہ مجھے ان کی لائبریری نے متاثر کیا ہے۔ جس لڑکے نے اس عمر میں اتنی بڑی لائبریری جمع کر رکھی ہو، کتابوں کے انتخاب میں جس کا ذوق اتنا اچھا ہو اور اپنی نوجوانی میں لہو لعب اور فضولیات میں پڑے بغیر جس نے پڑھنے لکھنے کو اوڑھنا بچھونا بنایا ہو، ایسا سنجیدہ طبیعت سکالر ٹائپ نوجوان ہی تمہارے لیے بہترین رفیق حیات ثابت ہو سکتا ہے اور تم جیسی ذہین لکھنے پڑھنے کی شوقین لڑکی کے لیے اس گھر میں بہت اچھا ماحول ملے گا۔"

میں حیران رہ گئی کہ نانا ابا اتنے کھلے طور پر مجھ سے میرے ہونے والے شوہر کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور میرا رشتہ طے کرنے میں انہوں نے ان سب باتوں کا اور میری اپنی پسند کا

خیال رکھا تھا۔ بزرگوں کی طے کی ہوئی شادیوں کو دقیانوسی سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بزرگ اپنے بچوں کی آئندہ زندگی کی بہتری کا ہر طرح لحاظ رکھ کر یہ طے کرتے ہیں۔ طرفین کی خاندانی شرافت حسب نسب، سماجی حیثیت، مادی خوشحالی، لڑکے لڑکی کی تعلیم، کردار کی درستی، یہ سب باتیں ان کے پیش نظر ہوتی ہیں۔ (یوں دیکھا جائے تو مغرب کی شادیاں بھی اس اعتبار سے طے کی ہوتی ہیں کہ ان سب باتوں کا لحاظ رکھ کے لڑکے لڑکیوں کو آپس میں ملنے دیا جاتا ہے۔)

شاہین حقیقتاً میرے لیے بہت اچھے شوہر اور موزوں رفیق حیات ثابت ہوئے اور ان کے گھر میں بھی مجھے بہت اچھا ماحول ملا اتنا اچھا کہ مجھے اپنا نے ہر جو صحیح معنوں میں نے ہر تھا چھوٹنے کا غم نہ رہا۔ یہ بھی بھرا پُرا پُر رونق گھر تھا۔ میرے دیور صادق سہیل ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے اور شاہین کے والد (قاضی عبدالکریم) بھی بہت ضعیف ہو چکے تھے (شاہین کی امی اپنے چہیتے بیٹے کے سہرے کا ارمان دل میں لیے ہی اس دنیا سے سدھار گئی تھیں۔) ان کے علاوہ بھتیجوں، نندوں کے بیٹے بیٹیاں تھیں جو میسور، پھر بنگلور میں ہائی سکول اور کالجوں میں تعلیم پا رہی تھیں۔ نوعمر لڑکے لڑکیوں کی موجودگی سے گھر میں بڑی رونق رہا کرتی تھی۔ شاہین کی بھانجیاں، بھتیجے سب مجھ سے دو چار سال چھوٹے تھے اور آپس میں ہم سب دوستوں بلکہ بھائی بہنوں کی طرح رہا کرتے تھے (کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی رنجشیں پیدا ہوتی تھیں تو بہت جلد دور ہو جایا کرتی تھیں) مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں میں اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو چھوڑ آئی ہوں تو ان کے بدل یہاں بھی مجھے چھوٹے بھائی بہنیں مل گئی ہیں۔

شاہین کے خاندان میں یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی لڑکی باہر سے بیاہ کر لایا تھا۔ ان کے یہاں آپس میں ہی شادیاں ہوا کرتی تھیں اور دوسرے سب بھائی عم زاد، خالہ زاد بہنوں سے بیاہے گئے تھے۔ خاندان بھر میں اس کا خوب چرچا ہوا کہ شاہین شہر سے ایک گریجوایٹ پڑھی لکھی لڑکی بیاہ کر لائے ہیں لیکن اس کا کسی نے برا نہیں مانا اور سسرال میں جہاں کہیں بھی گئے بڑی گرمجوشی اور محبت سے میرا استقبال کیا گیا۔

شادی کے ڈیڑھ ایک مہینے بعد شاہین مجھے باری باری اپنی بہنوں اور بھائیوں کے کافی اسٹیٹز (ESTATES) پر لے گئے پھر اپنے اسٹیٹز پر لے گئے۔ ہم دونوں یہ چاہتے تھے کہ شادی کے ابتدائی مہینے شہر سے دور ایک پرسکون، پُرفضا مقام میں گذاریں اور واقعتاً یہ نہایت پُرفضا مقام تھا۔ ویسٹرن گھاٹز میں کوئی پانچ چھ ہزار فیٹ کی بلندی پر یہ کافی کے باغات واقع تھے۔ ان باغات کو گھیرے ہوئے پہاڑیاں تھیں اور جنگل اور ہمارے اسٹیٹز کے عین درمیان شاروں ندی بہتی تھی۔

کافی کے باغات کے علاوہ سنترے اور کیلے کے باغ تھے کٹھل آم اور امرود کے درخت، اناناس اور دوسرے پھلوں کے آرچرڈ چھوٹی الائچی اور کالی مرچ بھی خوب ہوتی تھی جو بڑی قیمت پر بکتی تھی اور دنیا کی بہترین کافی "پی بیری" ہمارے اسٹیٹز پر ہوتی تھی۔

مشرقی بنگال میں سلہٹ کے چائے کے باغات کی طرح، جنوبی ہند کے کافی کے باغات بھی پہاڑوں کی ڈھلانوں پر ہوتے تھے۔ سیکڑوں ایکڑ پر پھیلے ہوئے باغات میں کافی کے پھول لگتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے چیری بلوزم کا موسم ہو۔ پھر کافی کے پودے سرخ سرخ پھلوں کے گچھوں سے لد جاتے تھے۔ پکے سرخ پھلوں کو توڑ کر کھلیانوں میں سکھایا جاتا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے بڑا رومانی لگتا تھا۔ نوخیز عمر اور شادی کے ابتدائی مہینے، ہر بات میں رومانیت ہی رومانیت نظر آتی تھی۔

لیکن یہاں آن کر مجھے مختلف نوعیت کا تجربہ ہوا۔ یہاں میں نے مزدور طبقے کو قریب سے دیکھا یہاں مجھے پہلی مرتبہ براہ راست مزدور طبقے سے واسطہ پڑا۔ اس وقت ترقی پسند ادب کا دور دورہ تھا اور میں نہ صرف اردو کے ترقی پسند ادیبوں کو پڑھا کرتی تھی بلکہ مغربی ادب میں بھی خاص طور پر ۱۹۳۰ء کے ادیبوں کو اور ان تحریروں کو پڑھا کرتی تھی جو نچلے طبقے اور مزدور طبقے سے متعلق تھیں۔ ان کے زیر اثر مجھ میں آسودہ طبقے سے ہونے پر احساس انفعالیت سا پیدا ہو گیا تھا اور اس طبقے سے میں نے جو ہمدردی محسوس کی تھی وہ پُرخلوص ہونے کے باوجود (QAIVE) قسم کی تھی۔ اس طبقے سے مجھے

اب تک اتنی ہی واسطہ رہا تھا کہ گھر کے نوکروں کی مصیبت بھری داستانیں ہمدردی سے سنیں۔ کہیں برسرِراہ شہر کے مزدوروں کو کام کرتے دیکھ کر اپنے اوپر رقت طاری کر لی اور یہاں میں نے اپنے اسٹیٹس پر سینکڑوں مزدوروں کو کافی کے باغات میں اور کسانوں کو اپنے کھیتوں میں کام کرتے دیکھا تو یہ احساس المعالیت اور گہرا ابھر گیا اور یہ اچانک ہوا کہ ہم "دوسرے کیمپ" میں ہیں یعنی خود سرمایہ دار ہیں۔ مزدور عورتیں مجھے "اسٹیٹ کی رانی" کہا کرتی تھیں تو عجب سی ندامت محسوس ہوتی تھی لیکن ایک بات سے اطمینان تھا کہ ہمارے ہاں ان مزدوروں کسانوں کی حالت دوسری جگہوں سے بہت بہتر تھی۔ انہیں مزدوری مناسب دی جاتی تھی۔ ان کے لیے پکے، ہوادار مکانات بنوائے گئے تھے دوائیاں مفت تقسیم کی جاتی تھیں ان کی فریادیں سنی جاتی تھیں ان کے آپس کے جھگڑے چکائے جاتے تھے۔

یہ مزدور سرحد مالابار کے گھاٹی مزدور تھے جو بنگلور سے لائے جاتے تھے۔ ان کی جنسی زندگی آزاد تھی اور آئے دن شکایتیں آتی رہتی تھیں کہ فلاں کی بیٹی کو کوئی اڑا لے گیا۔ فلاں کی بیوی شوہر بچوں کو چھوڑ کر فلاں کے ساتھ رہنے لگی ہے۔ کھلیانوں کے پاس ہمارے اسٹیٹس پر کام کرنے والے مزدوروں کی ایک پوری کی بستی کی بستی آباد تھی ان کے تہوار ہوتے تھے تو گہری رات میں مزدور بستی سے گانے بجانے کی آوازیں گونجتی تھیں۔ بڑے بڑے الاؤ جلتے تھے اور ان کے گرد لوک ناچ ہوتے تھے۔ سارا ماحول اور پس منظر اتنا EXOTIC تھا کہ اس پر ایک کتاب ہی لکھی جا سکتی تھی۔ ان دنوں میں نے ملک راج آنند کی کتاب "TWO LEAVES AND A BUD" پڑھی تھی جو چائے کے باغات کے پسِ منظر میں لکھی گئی تھی اور کافی کے باغات کے پس منظر میں ایک ناولٹ لکھنے کا مجھے بھی خیال آیا ہوا تھا لیکن ہم زیادہ دیر یہاں نہ رہے اور بعد میں بھی ہم شاذ ہی اپنے اسٹیٹس جاتے تھے سارے انتظامات ایک منیجر کے سپرد تھے اور اپنے اسٹیٹس کے ساتھ ہمارے اسٹیٹس کی دیکھ بھال بھی شاہین کے چھوٹے بھائی صادق سہیل کیا کرتے تھے اور ہم شہر ہی میں رہتے تھے۔

یہاں تین چار ماہ رہ کر ہم میسور واپس ہوئے تو شاہین ہائیکورٹ میں ایڈووکیٹ ہو گئے لیکن ان کی پریکٹس برائے نام تھی اور کورٹ کے کیسوں کے مطالعہ میں ان کا جی بالکل نہ لگتا تھا۔ ہماری لائبریری اسٹیٹس پر تھی اور یہاں ہم چن چن کر بہترین کتابیں ساتھ لے آئے تھے اور بس کتابیں تھیں اور ہم تھے۔ دن رات مطالعہ اور ادبی بحث میں گزرتے پھر ہم نے وہ سکیم بنائی جس کی ہم دونوں کو دیرینہ آرزو تھی یعنی ایک معیاری ادبی رسالہ نکالنے کی سکیم۔ شہر میسور میں رسالے کے اجراء کے لیے زیادہ سہولتیں نہ تھیں لہٰذا ہم بنگلور منتقل ہو گئے اور ۱۹۴۳ء میں شادی کے سال بھر بعد ہم نے بنگلور سے "نیا دور" (اور ایک انگریزی ہفتہ وار "میسورین") نکالا بہت جلد شمالی ہند کے اچھے اچھے ادیبوں کا تعاون ہمیں حاصل ہو گیا اور آن کی آن میں "نیا دور" کو جو کتابی صورت میں اردو کا پہلا رسالہ تھا وہ ترقی حاصل ہوئی کہ اس کا شمار ہندوستان بھر کے دو ایک سب سے معیاری ادبی رسالوں میں ہونے لگا۔

"نیا دور" کو ہم نے نہایت محبت اور محنت سے پروان چڑھایا "نیا دور" کے اجراء کے چند مہینوں بعد ہمارے ہاں بچہ پیدا ہوا لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے "نیا دور" بھی اپنا بچہ ہے اب مجھے یہ

صمد شاہین ۔ گلریز اور پرویز

خیال ہوتا ہے کہ شاید میں نے اپنے دو بچوں سے زیادہ "نیادور" پر توجہ دی تھی اور بچے میری ماں، بہنوں، بھتیجے اور بھانجوں میں ہاتھوں ہاتھ پل گئے تھے۔ میں ابھی کمسن تھی، بیس سال کے اندر دو بچوں کی ماں بن گئی تھی اور بچہ میں بچوں کی تخلیق سے اپنی زندگی اور شخصیت کی تکمیل کا شعور ابھی پوری طرح بیدار نہ ہوا تھا لیکن شوہر، دو ننھے بچوں اور "نیادور" کے ساتھ میری ننھی سی دنیا مکمل تھی۔

شادی کے بعد چار سال میسور اور بنگلور میں بڑے اطمینان اور سکون سے گزرے تھے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس آگ کے شعلوں نے ریاست میسور کو صرف چھوا ہی تھا۔ یہاں بظاہر امن و امان تھا بہت کم وارداتیں ہوئی تھیں۔ ہمارے محلے بسون گوڑی میں جو خالص مسلمانوں کا محلہ تھا، یہ خبر پھیلی تھی کہ پاس ہی کے مندر سے سرِ شام سنکھ بجنے کی آواز آتی ہے اور دوسرے محلوں کے ہندو یہاں جمع ہوتے ہیں اور اس مسلمان محلے پر حملہ کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ ایک خوف و ہراس کی کیفیت ہم پر چھائی رہتی تھی۔ تاہم فسادات کی آگ کے بھڑکنے کا یہاں امکان کم ہی تھا۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد ہم نے پاکستان جانے کا ارادہ کر لیا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہم خطرے میں گھرے ہوئے تھے یہ ہماری دیرینہ آرزو تھی اور عرصے سے یہ عقیدہ ہمارے دل میں جاگزیں تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل پاکستان سے وابستہ ہے۔ ہمارے رشتہ داروں میں سے کوئی بھی ہمارے ساتھ پاکستان آنے پر تیار نہ تھے۔ شاہین کے بھائیوں نے انہیں سمجھایا کہ وہ پاکستان میں ایک نئی زندگی کا آغاز کیسے کریں گے؟ زندگی گویا "صفر" سے شروع کرنی ہوگی اور بہت ممکن ہے کہ شاہین اپنی ساری آبائی جائداد، مکانات، کافی اسٹیٹس سب کچھ کھو بیٹھیں لیکن شاہین مصر رہے کہ آبائی جائیداد کھونے کا انہیں افسوس نہیں ہوگا اور پاکستان میں انہیں پچاس روپے کی نوکری قبول ہے۔ چنانچہ دو ہی ہفتے بعد یعنی اگست کے آخر میں وہ پاکستان چلے گئے۔ کراچی کے سندھ مسلم مدرسہ کالج اور سندھ مدرسہ لاء کالج دونوں جگہ انگریزی ادب اور قانون کے لیکچرر ہو گئے۔ پانچ مہینے بعد ۱۹۴۸ء کے آغاز میں وہ واپس آ کر مجھے اور بچوں کو جو اس وقت دو تین سال کے تھے اپنے ساتھ پاکستان لے آئے۔

پاکستان آنا ہمارے لیے نقلِ وطن تھا یا ہجرت! ہم فسادات کی قیامت سے نہیں گزرے تھے اور اپنے رشتہ داروں کو اچھی حالت میں چھوڑ آئے تھے۔ بچھڑے ہوؤں کا خیال کسے نہیں آتا اور اپنے وطن کے گلی کوچے یاد نہیں آتے۔ میں میسور اور بنگلور کے لیے "نوسٹلجیا" محسوس کرتی ہوں اور شاہین کو اگر کوئی مقام بے انتہا عزیز تھا تو وہ ان کا اپنا کافی اسٹیٹ "بیگوڈ" تھا۔ شاہین کی پیدائش اور ہمارے ہنی مون کا وہ پُر فضا مقام، وہ جنگل، وہ باغات، وہ پہاڑیاں ندی اور جھرنے .... شاہین کے بچپن اور نوجوانی کی یادیں یہیں سے وابستہ تھیں اور وہ اس مقام کے لیے "نوسٹلجیا" محسوس کرتے ہیں۔ تاہم پاکستان آنے کے بعد ایک نئی سرزمین میں اپنی ایک نئی دنیا بسانے کا احساس اس نوسٹلجیا پر غالب آ گیا اور ہم نے اپنے آپ کو اس نئے روحانی وطن سے مکمل طور پر وابستہ کر لیا۔

لہٰذا ہجرت کا احساس جلا وطنی کے احساس پر منتج نہ ہوا ویسے "اجنبی" اور "جلا وطن" ہونے کا احساس موجودہ دور کے انسان کے خمیر میں ہے۔ وہ اس دنیا میں خود اپنے وطن میں بلکہ اپنے جسم کی قید میں اپنے آپ کو "اجنبی" اور "جلا وطن" کر سکتا ہے۔

پاکستان آنے کے بعد ہماری زندگی ایک مستقل سفر بن گئی ہے ایک سفر سے دوسرا سفر، مشرق سے مغرب کی طرف اور مغرب سے مشرق کی جانب لیکن پاکستان کا سفر میرے لیے سب سے بڑا سفر تھا گو مکانی فاصلے کے اعتبار سے میں نے اس سے بڑے سفر کیے ہیں۔ کیوں کہ یہ سفر صرف جسمانی نہیں ذہنی، جذباتی اور روحانی سفر بھی تھا۔ ایک نئی زندگی کا آغاز اور ایک نئے ملک سے اپنی ساری وفاداریوں، حب الوطنی اور جذباتی لگن کا وابستہ ہونا ایک اہم تجربہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف اپنا انفرادی تجربہ نہ تھا بلکہ قوم کا اجتماعی تجربہ بھی تھا۔

———— (نا تمام)

زینت جہاں کے نام

شیریں نمبر کے سلسلے میں جب ہم نے ڈاکٹر عمر شاہین صاحب سے مرحومہ کے خطوط کے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ ان کی بھانجی زینت جہاں کے ساتھ ممتاز شیریں کی طویل خط و کتابت رہی ہے لیکن یہ زینت جہاں صاحبہ چونکہ بنگلور (انڈیا) میں مقیم ہیں اسلئے یہ خطوط حاصل کرنا ذرا مشکل ہے چنانچہ ہم نے زینت صاحبہ کا ایڈریس ان سے حاصل کر لیا اور اپنے ایک مہربان اورنگ حسن صاحب مقیم کینیڈا کو اس بارے میں لکھا چنانچہ ان ہی کی وساطت سے یہ خطوط ہم تک پہنچے ہیں۔ جس کے لئے ہم زینت صاحبہ کے ساتھ ساتھ اورنگ حسن صاحب کے بھی شکر گزار ہیں۔ بقول زینت جہاں یہ خطوط ان کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ انہوں نے اپنی پونجی میں سے چند خطوط کے کچھ حصے ہمیں نقل کر کے ارسال کئے ہیں یہ مسودہ ۲۲ فل سکیپ صفحوں پر مشتمل ہے، خطوط کے یہ حصے چونکہ ہمیں بڑی تاخیر سے موصول ہوئے ہیں اس لئے ہم پورے طور پر انہیں شائع نہیں کر سکے بلکہ درج ذیل ٹکڑے ان خطوط کے مختلف اقتباسات ہیں جنہیں دقت نظر کے ساتھ منتخب کیا گیا ہے۔ دوسری باتوں کے علاوہ ان خطوط کے بین السطور میں ایک "بہتی دریا" عورت کے جذبات کی لہر جاری و ساری ہے جو ممتاز شیریں کی زندگی کے ایک اہم گوشے کی نقاب کشائی کرتی ہے۔

——— ایڈیٹر

کراچی ۲۰ فروری ۱۹۶۳ء

میں نے تم کو اپنی کتاب میگھ ملہار تحفۂ عید کے طور پر بھیجی ہے۔

مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہیں میرا افسانہ "کفارہ" پڑھنے کی بڑی خواہش تھی حقیقت میں یہ افسانہ میں نے انگریزی زبان میں THE ATONEMENT کے عنوان سے تخلیق کیا تھا اور اس کا ترجمہ اردو میں کفارہ کی سرخی کے ساتھ کیا۔ انگریزی افسانہ نسبتاً زیادہ موثر ہے۔ یہ کہانی میرے ان اذیت ناک تجربات کی عکاسی کرتی ہے جو مجھے بنکاک میں پیش آئے اور جن کے دوران مجھے اپنے بچے سے محروم ہونا پڑا اور میں مرتے مرتے بچی تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ یہ افسانہ پاکستانی افسانوی ادب کا ایک شہ پارہ قرار پایا اور اسکی تخلیق پر مجھے گلڈ ادبی انعام سے نوازا گیا۔ یہ انعامات صدر ایوب خود تقسیم کرتے ہیں۔ سچ کہو تمہیں یہ افسانہ کیسا لگا؟ بلکہ بہتر ہوگا کہ پوری کتاب کے بارے میں اپنی رائے لکھو ہو سکا تو میں تمہیں انگریزی افسانہ ATONEMENT ضرور بھیجوں گی۔ اسے ایک دیدہ زیب اور اعلےٰ درجہ کے رسالہ کے سالنامہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

کراچی ۲۲ مئی ۱۹۶۳ء

دو روز قبل میں نے تمہیں بذریعہ رجسٹری SCINTILLA میگزین کے سالنامہ کا ایک نسخہ بھیجا تھا جس میں میرا افسانہ "کفارہ" کا اصل ATONEMENT کے عنوان سے شامل ہے۔ تم نے اس افسانہ کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میگزین کی رسید سے مطلع کرو اور یہ بھی لکھو کہ تمہیں یہ اصل انگریزی افسانہ کیسا معلوم ہوا۔

مجھے یہ جان کر خوشی محسوس ہوئی کہ تم میری کہانیوں کو بہت زیادہ پسند کرتی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے بعض میری اپنی زندگی کی عکاس ہیں۔ یہی بات (کفارہ) ATONEMENT پر صادق آتی

ہے جس کا تعلق ایک ایسی اذیت ناک صورتِ حال سے ہے جو مجھے بنگال میں قیام کے دوران پیش آئی۔

کراچی۔ یکم ستمبر ۱۹۶۳ء

تمہارا خط وصول کر کے خوشی ہوئی۔ یہ امر بھی باعثِ مسرت ہے کہ تمہیں میری کہانی کفارہ کا اصل "THE ATONEMENT" پسند آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل انگریزی افسانہ بہت زوردار اور مؤثر ہے۔ تمہاری اور تمہارے حلقۂ احباب کی جانب سے اس افسانہ کی تعریف و توصیف میری حوصلہ افزائی تخلیقی تحریک اور روحانی تاثیر کا باعث ہوئی ہے۔

کراچی۔ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۶۳ء

اب راولپنڈی میں میرے قیام اور سیر و تفریح کے بارے میں سنو۔ اگرچہ وہاں بمشکل ایک ماہ رہی لیکن برابر سفر میں رہی۔ ہم لوگ مری، ایبٹ آباد، ٹیکسلا کے علاوہ اسلام آباد کی سیر کو بھی گئے جو پاکستان کا نیا دارالخلافہ ہے اور راولپنڈی سے صرف چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ راولپنڈی میں ہم ایک بڑے بنگلے میں مقیم تھے جس کے پائیں باغ میں سرو، کھٹا، کرنا، شہتوت کے درختوں کے علاوہ سورج مکھی اور رنگارنگ گلابوں کے جھرمٹ تھے۔

چاندنی میں وہاں کے کھلے سبزہ زاروں میں بیٹھ کر سبز چائے پینے میں کیا لطف آتا تھا! اس قسم کی کتنی ہی دلکش راتیں ہم نے شکور بھائی اور ان کی دختر عزیزہ سے غپ شپ میں گزار دیں۔ یہ میرے ساتھ پشاور سے آئے تھے۔ میں پشاور میں تقریباً تین چار روز مشکور بھائی اور ان کے اہل و عیال کے ساتھ رہی اور وہاں تقریباً تمام قابلِ دید مقامات کی سیر کی۔ یونیورسٹی کا شاندار کیمپس، ہمک ڈیم لنڈی کوتل، تاریخی درہ خیبر اور افغانستان کی سرحد تورخم، کیا تھا جو نہیں دیکھا۔

انقرہ، ۳۱ر مئی ۱۹۶۴ء

جس وقت یہ خط تمہیں موصول ہوگا تم یقینی طور پر اپنی جاگیر سے بنگلور واپس آ چکی ہوگی۔ خوش قسمت ہو کہ چھٹیاں اپنی ریاست میں مناتی ہو۔ بعض اوقات ہمیں خصوصاً شاہین کو اپنے کافی کے باغوں کی یاد بری طرح ستاتی ہے۔ بدقسمتی دیکھئے کہ گزشتہ سال ہندوستان میں ہوتے ہوئے ہم اس قسم کی کسی ریاست یا جاگیر میں نہیں جا سکے۔ اگر زندگی ہوئی، انشاءاللہ تو اگلی مرتبہ ہم مختلف جاگیروں کی سیر کی انتہائی کوشش کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ تم بھی ہمارا ساتھ دوگی۔

آج کل انقرہ کے شہر کو دلکش اور رنگین بہاریں سنوار رہی ہیں۔ رات بھر ہمرنگے درختوں کی برف سے ڈھکی ہوئی شاخوں پر پتیاں پھوٹتی رہی ہیں۔ اب ہر طرف گہرے رنگ کا سبزہ ہے اور تفریح گاہیں نہایت دلکش اور دلربا نظر آتی ہیں۔ شاہین کے دفتر سے واپس آنے کے بعد جلد ہی ہم تین تین چار چار میل کی طویل سیر پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی قزل (ہلال احمر) سکوائر کی طرف جو آتاترک بلواری پر واقع ہے، جا نکلتے ہیں۔ یہ مقام یہاں کا سب سے زیادہ فیشن ایبل شاپنگ سنٹر ہے۔ بعض اوقات طویل سایہ دار اور کشادہ شاہراہوں پر، کبھی کسی پارک میں بیٹھ کر مونگ پھلی یا نمکین پستہ کھاتے ہیں یا شاہین اپنے مخصوص پائپ اور میں اپنے سگریٹوں سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم سرِراہ واقع کیفوں (چائے خانوں) میں شوخ رنگ شامیانوں یا چھتریوں کے تلے جا بیٹھتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں پڑی ہوئی تلخ و شیریں کافی کی چسکیاں لے لے کر گزرتے ہوئے ہشاش بشاش لوگوں کے ہجوم کو تکتے رہتے ہیں۔ پھیکے پھیکے بھورے اور کالے رنگ کے سردیوں کے کپڑوں کی جگہ رنگ برنگے لباس نکل آئے ہیں۔ وزنی اوورکوٹ، دستانوں، جرابوں اور سویٹر کو چھوڑ کر ساڑی میں گھومنا پھرنا کتنا لطف دیتا ہے۔ فرصت کے اوقات کی فراوانی ہے۔ سورج ۹ بجے غروب ہوتا ہے اور ہم ایک یا ڈیڑھ بجے رات تک مطالعہ جاری رکھتے ہیں۔ آج کل میں بے پناہ پڑھ رہی ہوں۔ ترکی کی تاریخ، سیاحت نامے، کمال آتاترک پر مختلف کتابیں۔ انقلاب ترکی اور یشر کمال جیسے اعلےٰ پایہ کے ترک افسانہ نویس کی کتابیں۔ یہیں ام میں رفیق کے چھوٹے بچہ کا رکھ چکی ہوں۔

انقرہ - ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۴ء

اتنی مدت تک تمہارے خط کا جواب نہ دینے پر اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کر رہی ہوں۔ اس تمام عرصہ سوچتی رہی کہ تمہیں خط لکھوں پھر ہر بار یہ خیال آیا کہ کیوں نہ لمبا چوڑا خط لکھوں اور اس طرح التوا ہوتا رہا۔ میں بہت زیادہ مصروف رہی ہوں۔ اپنے گھر اور دوستوں کے گھروں پر کتنی ہی پارٹیاں ہوئی ہیں۔ سرکاری پارٹیاں الگ رہیں۔ باہر کی سفارتی زندگی ہمیشہ ہیجان خیز ثابت ہوتی ہے یہاں تک کہ بے تکلف اور دلی دوستوں کے خطوط کو بھی سرکاری خطوط سے جلد از جلد نمٹنے کی خاطر معرضِ التواء میں ڈال دیا جاتا ہے۔ تبسم نے اپنی منتخب نظمیں مجھے بھیج کر عین نوازش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافِ توقع سب نظمیں اچھی ہیں۔ لڑکی اپنی عمر کے مقابلے میں زیادہ ذہین معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ہر نظم میں کوئی نہ کوئی گہری بات مضمر ہے۔ خاص طور پر نظموں کے آخری اشعار کسی ایسے دلی پیغام کے حامل نظر آتے ہیں جس میں گھمبیرپن اور عمق محسوس ہوتا ہے۔ میں نے اس کی یہ نظمیں اپنے چند دوستوں کو دکھائیں تو انہیں یہ معلوم ہو کر تعجب ہوا کہ ان کی خالق ایک دس سالہ بچی ہے۔ خاص طور پر پرویز نے ان نظموں کی بہت تعریف کی چونکہ وہ خود بھی شعر اور آرٹ کا کچھ نہ کچھ ذوق رکھتا ہے۔

انقرہ - ۱۶ فروری ۱۹۶۵ء

تم نے اپنے خط میں شمالی ہندوستان کے تفریحی سفر کا حال لکھا ہے ہم نے بھی گزشتہ سال اکتوبر، نومبر میں ترکی کے ایک علاقہ کی سیر کی تھی اور اس خط میں اسی سیر کے بارے میں تمہیں تھوڑا بہت لکھ رہی ہوں۔

پاکستان کو واپس جاتے وقت ہم نے ہندوستان کی بھی سیر کی تھی لیکن دو شہروں کو جہاں پہنچ کر شاید مجھے خوشی حاصل ہوتی جانا نصیب نہیں ہوا۔ وہ شہر ہیں لکھنؤ اور جے پور۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم دہلی، آگرہ، علی گڑھ، چنڈی گڑھ اور امرتسر کے علاوہ اپنے راستے میں پڑنے والے دیگر بہت سے شہروں اور خصوصاً خوبصورت وادی کانگڑہ کی سیر کر سکے۔ ہم نے اپنے قیام کے دوران وہاں بہت کچھ دیکھا اور خاص طور پر تاج محل کے صاف شفاف اور لطیف حسن نے میرے ذہن پر ابدی تاثر چھوڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاج محل کے نظارہ سے روح کو جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ تاج محل کے حسن و لطافت کا جواب نہیں اسے ایک سہانے خواب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یا اسے جذبہ اور روح کا ایک البیلا تجربہ کہا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تاج محل ابدی محبت کی ایک یادگار ہے۔ ہمالیہ کے شاندار جاہ و جلال نے بھی مجھے بڑا متاثر کیا جس کی تحیر انگیز عظمت و رفعت خدائے بزرگ و برتر کی شانِ کبریائی کی شہادت دیتی ہے اور ہم وہاں سے بہت قریب محسوس کرتے ہیں۔

یہاں ترکی میں بھی ہم نے رفیع الشان پہاڑ دیکھے اگرچہ وہ ہمالیہ کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں لیکن پھر بھی یہ اپنے تاریخی پس منظر اور دیومالا کے لئے مشہور ہیں۔

برسا کے مقام پر ہم مشہور و معروف دیومالائی پہاڑ OLYMPUS (اولمپس) کے اوپر تک گئے۔ برسا اس پہاڑ کے دامن میں نہایت سرسبز و شاداب مقام ہے اور اسکی اسی خصوصیت کی بنا پر یہاں کے لوگ اسے "GREEN BURSA" (گرین برسا) کہتے ہیں۔ اولمپس یونانی دیوتاؤں کا استھان ہے۔ ازمیر کے مقام پر ہم PAGASNS پہاڑ کی سیر کو گئے۔ یہ پہاڑ یونانی دیومالا میں شاعری کی علامت ہے۔ ازمیر میں ہومر HOMER رہتا تھا اور یہیں اس پہاڑ پر اس نے اپنی عظیم رزمیہ "ILLIAD AND ODESSY" تخلیق کی تھی۔ سکندر نے یہاں جو قلعہ تعمیر کیا تھا وہ ابھی تک اچھی حالت میں موجود ہے۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ جسے اب مغربی ترک کہتے ہیں وہ عہدِ سلف کی "HELLENIC WORLD"

صڈ : مکتوب الیہ کی بیٹی

ہے۔ ٹرائے آف ہیلن ازمیر کے بالکل قریب ہے اور یہاں پہنچ کر یونانی تاریخ، یونانی دیومالا اور یونانی ادب ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ یوفیسس EUPHESUS ازمیر سے چند میل دور ہے۔ یہاں ہم نے یونانی اور بازنطینی تہذیب کے عظیم الشان کھنڈرات دیکھے۔ یوفیسس اور پرگیمم PERGAMUM میں DIANA کے معبد اور اپالو کے مجسمہ کے خرابے موجود ہیں۔ ازمیر سے اس خط کے لفافہ پر اپالو ہی کے مجسمہ کی تصویر ہے۔ یہیں پر قربانی کی بھینٹ چڑھی "IPHEGINIA" کو دوبارہ زندہ کرکے لے پجارن اور پروہت جا رہے گیا۔ ازمیر سے متصل ہی ——— "AGAMEMNON BATHS" واقع ہیں جہاں ماضی کی تمام روایتیں جیتی جاگتی صورت میں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہاں حسن سنگ مرمر کا ایک پورا شہر ہے۔ جس کے گلی کوچے تک مرمر سے بنے ہیں۔ ایک سقفی بازار "AGORA" کے علاوہ بہت سے معبد، محل اور قحبہ خانے بھی ہیں اور قحبہ خانوں کے راستے مردانہ اور زنانہ اعضائے مخصوصہ سے سجے ہوئے ہیں۔ یہاں قرآن شریف اور انجیل مقدس کے قصص روایات کی تجسیمات بھی دیکھیں۔ "EPHESUS" کو شہر افسوس کہا جاتا ہے۔ یہی وہ شہر گناہ ہے جہاں اصحاف کہف نے بھاگ کر ایک غار میں پناہ لی تھی۔ شہر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر وہ غار ہے۔ جہاں اصحاب کہف (قرآن شریف کے مطابق) تین سو نو سال تک سوتے رہے۔ اس سے آگے "کوہِ عنادل" MOUNT OF NIGHTINGALES ہے۔ ترکی میں اب اسے "بلبل ڈاگ" کہا جاتا ہے۔ اس کی چوٹی پر دوشیزہ مریم نے اپنی زندگی کے آخری سال بسر کئے تھے۔ حضرت عیسےٰ کے مصلوب ہونے کے بعد سینٹ جان نامی مبلغ انجیل مریم کو ایشیائے کوچک لے آئے تھے اور مریم کا قیام وہیں رہا۔ ہم نے دوشیزہ مریم کی مقدس قیام گاہ کی بھی زیارت کی اور اس مکان کے زیریں چشموں کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی بھی پیا۔ اس پانی کی شفا پذیری مشہور ہے۔ ہم نے یہاں کچھ دیر قیام کیا اور یہاں کے متین اور مقدس ماحول سے روحانی تسکین حاصل کی۔

برسا اور ازمیر دونوں خوبصورت شہر ہیں۔ ازمیر AEGIAN SEA کے آس پاس پھیلا ہوا ہے اور ازمیر کو کوہ پگاسس نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ ایک طرف سمندر اور دوسری جانب پہاڑی سلسلے نے ازمیر کے مناظر میں غیر معمولی دلربائی پیدا کردی ہے۔ ازمیر قدیم سمرنا کا نام ہے جو تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح کا شہر ہے۔ برسا بھی قدیم شہر ہے جو ابتدائی عثمانی ترک سلطانوں کا دارالحکومت تھا۔ ہر سرما میں سرمائی کھیلوں کا انعقاد کوہ اولمپس پر ہوتا ہے۔ ہم نے یہاں بس سے سفر کیا اور راستے میں بہت سے دوسرے شہر بھی دیکھے انقرہ سے ازمیر تک کے تقریباً تمام راستے میں پہاڑی سلسلوں کے علاوہ اناطولیہ کے خشک اور بنجر میدان مرتفع سے بھی گزرنا پڑا لیکن ازمیر کے قریب پہاڑ حیرت انگیز طور پر سرسبز و شاداب تھے جو گھنے درختوں اور مختلف قسم کے چیڑ چنار اور دیگر سہی قامت پیڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ازمیر جیسے تین ہزار سال قبل مسیح کے شہر سے ہم پھر انقرہ جیسے جدید ترین اور ماڈرن شہر کو واپس ہوئے۔

جب ہم رات کے وقت انقرہ میں داخل ہوئے تو اس وقت اس کا روپ سہاگ رات میں سجی ہوئی دلہن کی مانند دکھائی دے رہا تھا اور اس شہر کی ہیروں کی طرح چمکتی ہوئی لاتعداد روشنیاں ہمارے استقبال کو موجود تھیں۔

انقرہ - ۷ مارچ ۱۹٦۵ء

تم نے میرے نانا "جان" کی وفات حسرت آیات پر جس خلوص اور ہمدردی سے تعزیت کا اظہار کیا ہے اس پر تمہارا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ وہ بوڑھے اور کمزور ہی سہی لیکن ہمارے گھرانے کا ایک ستون تھے۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گھر کا ایک ستون گر گیا ہو اور ستون بھی کونسا؟ مرکزی ستون جس سے پورے خاندان کو استحکام حاصل تھا۔ مجھے اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ زندہ ہیں۔ میرا ذہن اس تصور سے مصالحت پر تیار نہیں ہوتا کہ اب جبکہ دوبارہ میسور جاؤں گی تو مجھے وہاں اپنے "جان" نہیں ملیں گے۔ وہ حقیقت میں ہم سب کی جان تھے میں ان سے ماں اور باپ سے زیادہ پیار کرتی تھی اور وہ ہم سب کے لئے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ ان کا ہم پر جو احسان ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے پیارے تھے اور انہوں نے ایک مثالی

پاکیزہ زندگی بسر کی۔ انہوں نے دوسروں کے لئے اتنا کچھ کیا کہ اپنی ساری زندگی ہی ہمارے لئے وقف کر دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی روح کو بہشت کا دائمی سکون نصیب ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر کتنی حیران ہوتی ہوں کہ اپنے عزیز ترین پیاروں کو کھو کر بھی ہماری زندگی کے معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑتا!

شاہین آج شام ایک ہفتہ کے لئے استنبول چلے گئے۔ میں گھر پر بالکل تنہا ہوں۔ اتنے بڑے گھر میں سچ مچ اکیلی! اور اسی لئے تم سے باتیں کرنے میں دل بستگی اور تشفی سی محسوس ہو رہی ہے۔ خط درحقیقت بہت بڑی نعمت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ سامنے بیٹھا ہے۔ اگرچہ میں تنہائی سے تھوڑی سی خوفزدہ ہوں پھر بھی دوسری رہائش گاہوں کا شور اور روشنیاں اس بات کی علامت ہیں کہ میں زندہ انسانوں سے متصل ہی ہوں۔ ہماری رہائش گاہ شہر کے بالکل وسط میں ہے اسی لئے ہر چیز آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے۔ یہاں گوشت، سبزی، پھلوں اور ڈرائی کلیننگ کے علاوہ دوسری دکانیں بھی موجود ہیں جہاں سے ہر چیز مل جاتی ہے۔ ہر روز میں اشیائے خورد و نوش خود ہی خریدتی ہوں۔ اب تک میں کھانے، پکانے، صفائی، کپڑے اور برتن دھونے کا کام خود ہی کرتی تھی لیکن اب میں نے ایک ترک ملازمہ کا انتظام کر لیا ہے جو صفائی کا کام کرتی ہے اس سے مجھے بڑی مدد ملتی ہے اگرچہ وہ شام ۵ بجے چلی جاتی ہے اور تنخواہ کا بھی تو کچھ نہیں صرف ۱۲۵ سے ۱۵۰ روپے تک دینا پڑتے ہیں۔ یہاں نوکر بڑی مشکل سے ملتے ہیں اور ہمیں اپنے آپ کو مغرب کے انداز پر ڈھالنا پڑتا ہے جہاں عورتیں گھر کا سارا کام کاج خود کرتی ہیں۔ اگرچہ یہ ہم جیسے لوگوں کے لئے بڑا مشکل ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہم سارا کام نوکروں سے لینے کے عادی ہیں۔ ایک طرح سے یہ اچھا بھی ہے اور اس طور میں اپنے آپ کو بار آور مشقتوں کا کچھ نہ کچھ حامل پا رہی ہوں۔

مجھے کھانا پکاتے وقت ایک نئی لذت محسوس ہوتی ہے ترکی کے کھانے بھی ہمارے کھانوں سے تقریباً ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً سیخ کباب، کوفتہ وغیرہ۔ ان کی بہت سی سویٹ ڈشیں بھی ہمارے شاہی ٹکڑوں، فرنی، چاول کی کھیر اور سیویوں جیسی ہیں۔ یہاں کی دوسری میٹھی چیزیں بھی بڑی لذت بخش ہیں لیکن گاڑھے شیریں محلول میں ڈوبی ہونے کی وجہ سے نہایت میٹھی ہوتی ہیں۔ عجیب بات ہے کہ مسلمان خواہ کسی ملک سے بھی تعلق رکھتا ہو اس کے کھانے پکانے کے طریقے تقریباً ایک جیسے ہیں۔ ترک لوگ بڑے اچھے مسلمان ہیں اور پاکستانیوں سے سچی محبت کرتے ہیں۔ جس کسی سے ہم ملتے ہیں اور جہاں کہیں ہم جاتے ہیں نہایت گرمجوشی سے ہمارا استقبال ہوتا ہے۔ ہوٹل کے ملازمین، دکاندار یہاں تک گلی کوچوں میں پھرنے والے معمولی لوگ بھی ہمارا خیر مقدم کرتے ہیں اور ہمارے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتے ہیں۔

ہمارے پڑوسی بھی نہایت اچھے اور کار آمد لوگ ہیں۔ خوش قسمتی سے ان میں سے کچھ انگریزی بول لیتے ہیں۔ زبان کی یہاں مشکل ہے کیوں کہ بہت کم ترک انگریزی جانتے ہیں۔ میں تھوڑی بہت ترکی زبان سیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں نے گنتی کے علاوہ سبزیوں پھلوں، مسالوں اور دوسری ضروریات زندگی کے نام سیکھ لئے ہیں۔ دکانداروں، گوشت فروش اور ملازمہ وغیرہ سے بھی اس زبان میں کام چلا لیتی ہوں۔ لیکن شاہین ابھی اس سے آگے نہیں بڑھے ہیں کہ "شکریہ" "آپ کیسے ہیں"؟ یا "اچھا رخصت" وغیرہ! ان کی فرانسیسی کا بھی یہی حال تھا۔ "QUEST QUE SE" سے آگے کبھی نہیں بڑھے البتہ بچوں نے اور میں نے کچھ نہ کچھ فرانسیسی جلد سیکھ لی تھی۔ ہماری رہائش گاہ آرام دہ اور اچھی طرح آراستہ ہے۔ ہم سجاوٹ کی تمام چیزیں پاکستان سے منگا رہے ہیں۔ ان میں وہ اشیاء بھی شامل ہیں جو ہم نے بنکاک میں خریدی تھیں اور ریشم اور سنگ مرمر کی وہ خوبصورت چیزیں بھی جو پاکستان میں خریدی تھیں۔ مجھے امید ہے کہ ان اشیاء سے ہماری رہائش گاہ نہایت عمدہ طور پر سجائی جائے گی۔ ہر کمرہ میں نہایت خوبصورت قالین بچھے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ سونے کے کمرے اور برآمدے بھی قالینوں سے آراستہ ہیں۔ علاوہ ازیں خوشنما جھاڑ اور فانوس بھی ہیں۔ غرض کیا کچھ نہیں ہے۔ ان دنوں انقرہ کا موسم بھی خوب ہے۔ زبردست برف باری کے بعد کئی دن سے سورج چمک رہا ہے ویسے ہماری رہائش گاہ سنٹرل ہیٹنگ کی وجہ سے گرم رہتی ہے۔ ہاں یہاں

فرج، کپڑے دھونے کی مشین، صفائی کی مشین لگیں کے جو لیے غرض
ہر ماڈرن سہولت موجود ہے۔

انقرہ

نہیں معلوم کہ انطالیہ کی تفریح کے بارے میں اب میں تمہیں
تفصیل سے لکھ سکوں گی یا نہیں۔ اس تفریح کی یادیں دھندلی پڑ چکی
ہیں لیکن پھر بھی میرا ارادہ ہے کہ اپنے ان محسوسات کو کسی وقت مضمون
یا انشائیہ کی صورت میں قلم بند کروں۔

انطالیہ کی سیر نے بڑا لطف دیا۔ اس کا قدرتی حسن لاجواب اور
سکون بخش ہے۔ بحیرہ روم کے نیلگوں پانی کا نظارہ قابل دید ہے جو کنارے
کے پاس فیروزی پھر آگے ہلکا نیلا اور رفتہ رفتہ بیچ سمندر میں گہرا
نیلا دکھائی دیتا ہے پس منظر میں "TOURUS" کا پہاڑی سلسلہ ہے
جو ایک حسین مرقع سے کم نہیں اور اس کا سایہ دن کے مختلف اوقات
میں اس سمندر کے پانی کو عجیب عجیب رنگ بخشتا ہے ایسا دکھائی دیتا
ہے جیسے یہ پہاڑ سراسر سمندر ہی سے اٹھے ہوں۔ ہم نے بہت سے
تاریخی مقامات اور کھنڈرات بھی دیکھے مثلاً "ASPENDOS" یہیں
وہ مقام ہے جہاں سے قلوپطرہ غروب آفتاب کا نظارہ کیا کرتی تھی،
MANARGAT کے جگمگاتے آبشار اور بحیرہ روم کے کنارے آباد
خوبصورت شہر ALANYA بھی دیکھا۔ یہ شہر سمندر سے صاف صاف
ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں ہم نے دو تین خاندانوں میں کچھ
دوست بنائے اور ان کی مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوئے
جب کبھی وہ ہمارے پاس آئے ہم نے بھی ان کی خوب خوب تواضع
کی۔ اب بھی ANTALYA کے ایک خاندان کی تین لڑکیاں چند روز
سے ہمارے پاس ٹھہری ہوئی ہیں۔ وہ یہاں یونیورسٹی میں داخلہ کا
امتحان دینے آئی ہیں ان کی گپ شپ اور قہقہوں سے آج کل ہمارا
گھر گونج رہا ہے یوں میرا دل بہل گیا ہے۔

شاہین ایک سیمینار میں شرکت کی خاطر تقریباً ایک ماہ کے لئے
آکسفورڈ گئے ہیں اس سیمینار میں سنٹو اور نیٹو کے اہم اور ذمہ دار
افراد شریک ہو رہے ہیں۔

وینس جسے اطالوی زبان میں وینیزیا VENEZIA کہا جاتا
ہے نہایت خوبصورت، رنگین اور دلکش شہر ہے۔ ہم یہاں سینٹ مارکو
میں ٹھہرے جو سارے وینس میں خوبصورت ترین جگہ ہے۔ PIATZA
SAN MARO میں سدا سیکڑوں سیاحوں کی سیر گشتی کی وجہ سے
گہما گہمی رہتی ہے جو عموماً کبوتروں سے دل بہلاتے نظر آتے ہیں۔
وینس میں سڑکیں نہیں ہیں صرف نہریں اور پل ہیں۔ ایک جگہ سے
دوسری جگہ جانے کے لئے صرف کشتی یا خوبصورت سی ناؤ استعمال
کی جاتی ہے اس ناؤ کو GONDOLA کہا جاتا ہے۔ یہاں بسیں
کاریں اور ٹیکسیاں بالکل نظر نہیں آتیں۔ یہ سب کچھ نہایت رومان پرور
نظارے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وینس چھٹیاں گزارنے کے لئے
بہترین مقام ہے۔

انقرہ - ۲۹ نومبر ۱۹۶۵ء

تمہیں یاد ہوگا کہ انطالیہ سے بھیجے ہوئے گزشتہ خط میں
تم نے ہمارے مہمانوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس سے قبل بھی
میں لکھ چکی ہوں کہ یہ مہمان اکتوبر سے دوبارہ ہمارے ساتھ دو ہفتے سے
زیادہ قیام کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ اس مرتبہ تمام بہنیں نہیں
آئیں بلکہ سب سے بڑی بہن اور ان کی والدہ آئی ہیں۔ اس بات
پر افسوس ہے کہ اسے انقرہ یونیورسٹی میں داخلہ نہیں مل سکا اور بے
نیل و مرام انطالیہ واپس ہونا پڑا۔ اس کی چھوٹی ہمشیرہ کو اساتذہ کے
تربیتی کالج میں داخلہ مل گیا ہے اور وہ ہاسٹل میں مقیم ہے۔ میں نے
شاید ان کے نام تمہیں نہیں لکھے تھے۔ سب سے بڑی ترکان اس سے
چھوٹی مژگان، پھر خندان، سیہان اور سب سے چھوٹی جانان ہے۔
ان کے دو بھائی آلتان اور گورگان ہیں۔ اور والدہ کا نام خدیجۃ الکبریٰ
ہے۔ باپ کا ڈیڑھ سال قبل انتقال ہو چکا ہے اور ان بچیوں میں
سے تین جنہوں نے میٹرک تک تعلیم مکمل کر لی ہے ملازم ہیں اور نہایت
خندہ پیشانی سے اتنے بڑے خاندان کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔
انہوں نے اپنے والد اور ان کی والدہ نے اپنے شوہر کی وفات کے
سانحہ پر جس قوت برداشت کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

یہ لوگ کپیاڈوسیا اور انطالیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور انقرہ اور استنبول کے ترکوں کے درجے کے سوفسطائی نہیں ہیں لیکن پھر بھی اوسط درجے کے طرزِ زندگی کے حامل ہونے کی وجہ سے انہیں بڑی حد تک ماڈرن کہا جا سکتا ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کا طرزِ رہائش نہایت اعلیٰ ہے۔ ان کی رہائش گاہیں نہایت صاف ستھری اور جدید سہولتوں سے آراستہ ہوتی ہیں خصوصاً فرنیچر، قالینوں کا جواب نہیں پھر ان کی خوراک بھی صحت بخش ہے) ان کا خاندان آٹھ افراد پر مشتمل ہے اور ان کے انطالیہ کے مکان میں صرف تین کمرے ہیں یعنی ایک ڈرائینگ روم اور دو سونے کے کمرے ڈرائینگ روم میں ایک بڑا اور خوبصورت دیوان (تخت) پڑا ہے جس پر کشن رکھے ہیں اور ان سب پر جھالر بھی لگی ہوئی ہے رات کے وقت کشن اور کور ہٹا کر انہیں سونے کے لئے پلنگ بنا لیا جاتا ہے۔ ماں اور بیٹیوں کی بڑی خواہش ہے کہ ہم لوگ انطالیہ میں دوبارہ ان کے مہمان بنیں اور کم از کم دس دن ٹھہریں۔ وہ وثوق سے کہتی ہیں کہ ہم میں سے تین کو الگ کمرے بھی دے سکتی ہیں۔

لڑکیوں کو ان معنوں میں ماڈرن کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہائی سکول اور کالجوں میں پڑھتی ہیں۔ مغربی لباس میں "JEANS" تک پہنتی ہیں۔ بحرِ روم کے دلفریب ساحل پر تیراکی کرتی ہیں اور جدید ترین موسیقی اور رقص سے واقف ہیں۔ وہ ہماری موسیقی کو جنون کی حد تک چاہتی ہیں اور لتا منگیشکر کی تو پرستش کرتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ بڑی حد تک مذہبی قسم کے لوگ ہیں۔ انہوں نے بقر عید پر بھیڑوں کی قربانی دی تھی۔ رمضان کے دوران وہ تمام روزے رکھنے کے علاوہ نماز بھی پڑھتی ہیں۔ البتہ نماز کی سختی سے پابندی نہیں کرتیں۔ دیکھا جائے تو اس سلسلے میں ہم کون سے پابند ہیں۔ نئی نسل عربی رسم الخط سے واقف نہیں اسی لئے نوجوان عربی زبان میں قرآن شریف نہیں پڑھ سکتے لیکن انہیں نماز کی آیتیں یاد ہوتی ہیں۔ انقرہ اور استنبول کے نوجوان نسبتاً زیادہ سوفسطائی ہیں۔ بظاہر وہ غیر مذہبی سے نظر آتے ہیں لیکن انہیں ٹٹولا جائے تو وہ ہم سے کم زیادہ بہتر مسلمان ثابت ہوتے ہیں۔ ترک سیدھے سادے ہیں۔ ان میں ریاکاری اور زمانہ سازی نام کو نہیں۔ بڑے بامروت مخلص اور خوش اخلاق لوگ ہیں۔

لو۔۔۔ میں نے تمہیں ترکوں اور ان کی نئی نسل کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔ تم نے اپنے گزشتہ خط میں ہماری انطالیہ کی مہمان بچیوں کے بارے میں استفسار کیا تھا نا؟

انقرہ۔ ۸ راکتوبر ۱۹۶۶ء

یہ تمہاری نوازش ہے کہ ترکی میں زلزلہ آنے کی وجہ سے تم ہمارے بارے میں اس قدر فکرمند ہو۔ یقین کرو کہ زلزلہ مشرقی ترکی میں آیا تھا اور انقرہ اس سے کسی طور پر بھی متاثر نہیں ہوا۔ یہ زلزلہ ایک اندوہناک سانحہ تھا۔ ہم نے اپنے کچھ کپڑے سوئیٹر، چمڑے کے جیکیٹ، کوٹ، پتلونیں اور جوتے وغیرہ ایک بڑے سے تھیلے میں بند کر کے متاثرین کے لئے بھیجے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم نے کچھ نقد رقم بھی بھیجی ہے۔

اٹلی کے شہر روم اور نیپلز ہم نے بارہ سال قبل بھی دیکھے تھے لیکن اس مرتبہ روم نئے روپ میں تھا اس شاندار اور عظیم تاریخی شہر نے کچھ زیادہ ہی متاثر کیا۔ روم کا ذرہ ذرہ اسکی گزشتہ عظمت کے گن گاتا ہے۔ نیرو کے COLLOSSEUM سے اور جولیس سیزر، آگسٹس اور طروجان کے فورم کے کھنڈرات سے اب بھی ماضی کی شان و شوکت جھلکتی ہے اور ان جگہوں کو دیکھتے ہی ذہن ایک دم ماضی کی داستانوں میں کھو جاتا ہے۔ کبھی خیال آتا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں انطونی نے سیزر کی میت پر اپنی مشہور عالم تقریر کی تھی اور کبھی کچھ کبھی کچھ۔

فلورنس بھی ایک خوبصورت قدیم شہر ہے۔ اس شہر کو احیائے آرٹ کا گہوارہ کہنا چاہیئے۔ یہاں اور روم میں ہم نے کلاسیکل آرٹ، پینٹنگز اور مجسموں کے ایسے بے شمار نمونے دیکھے جنہیں ان کے دور کا شاہکار کہا جا سکتا ہے میں نے MICHEAL ANGELO کے مجسمہ DAVID سے زیادہ بے عیب مجسمہ اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھا۔ اسی بت ساز کا MOSES کا مجسمہ اور

سینٹ پیٹرز کیتھڈرل میں دوشیزہ مریم کی گود میں CHRIST (حضرت عیسٰی) والا مجسمہ بھی قابل تعریف ہے۔ CISTIN نامی گرجا کی چھت پر مائیکل اینجلو نے جو پینٹنگز کی ہیں وہ بھی شاندار ہیں ان تصویروں میں آدم اور حوا کی تخلیق دکھائی گئی ہے۔ آدم کو دانۂ گندم کھانے کی ترغیب دینا، آدم کا دانۂ گندم کھانا اور جنت سے نکالا جانا ان نقاشیوں کے موضوعات ہیں اس کے علاوہ ہمیں ——
MICHEAL ANGELO، RAPHAEL اور BERNINI CELLINI جیسے مصوروں کے مشہور زمانہ شاہکار دیکھنے کا بھی موقعہ ملا ہم نے RAPHAEL کی مشہور پینٹنگز MADONNS BOTICELLIS VENUS کے چربے بھی خریدے۔

آرٹ کے اتنے زیادہ حسن پاروں سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم وینس پہنچے۔ یہ شہر خود حسن کا مرقع ہے۔ سارا شہر سمندری نہروں سے مزیّن ہے۔ انسان نے بھی اس شہر کے حسن کو فروغ بخشنے میں بہت محنت کی ہے۔ روم کی عظیم اور رفیع الشان عمارتوں کے مقابلہ میں وینس کی عمارتیں اپنی نزاکت اور نفاست کی وجہ سے ایسی نظر آتی ہیں جیسے ہاتھی دانت سے تراش کر بنائی گئی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ وینس تعطیلات سے لطف اندوز ہونے کے لئے بہترین مقام ہے۔ اور یہ شہر نہایت رومان پرور، خوبصورت اور دلکش ہے۔ ویانا بھی ایک نفیس اور خوبصورت شہر ہے۔ یہاں کے HAPSBURG سلاطین کا محل SCHONBRUNNE لاجواب ہے۔ شاید میں نے اپنی ساری عمر میں تعمیری آرٹ کا ایسا شاندار نمونہ نہیں دیکھا۔

آسٹریا کی شہرت اس کے قدرتی حسن کی وجہ سے ہے یہاں کی سرسبز و شاداب پہاڑیاں، وادیاں، گھاٹیاں خوب خوب دعوتِ نظارہ دیتی ہیں۔ یہاں آٹھ سو پارک اور پبلک گارڈن ہیں ان میں سے بعض تو صرف نادر گلابوں کے لئے مخصوص ہیں۔

ہنگری کا شہر بڈاپسٹ رقبہ اور دل آویزی میں ویانا پر فوقیت رکھتا ہے۔ بڈا اونچی پہاڑیوں پر پھیلا ہوا ہے اور اس کے محلات گرجوں اور زرق برق پارلیمنٹ ہاؤس کا عکس دریائے ڈینوب کے نیلے پانی میں پڑتا ہے۔ پسٹ دریا کے دوسرے کنارے پر میدان میں آباد ہے۔ یہاں ہم نے ہنگری کا لذیذ ترین طعام نوش کیا اور وجد آور موسیقی سنی۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ ویانا بھی موسیقی کے لئے مشہور ہے۔ روم اور فلورنس میں مصوروں کا راج ہے تو ویانا اپنے موسیقاروں سے آباد ہے۔ FRANZ LISTZ، MOZART، BEETHOVEN یہاں کے مشہور موسیقار ہیں اور STRANSS بھی جن کو رقص کا بادشاہ کہنا چاہیئے کیوں کہ اسی نے رقص کی مشہور دھن BLUE DANUBE ترتیب دی تھی۔

یوگوسلاویہ کا بلغراد اور بلغاریہ کا صوفیہ بھی دلکش شہر ہیں۔ ان شہروں میں بھی وسیع چوڑا ہے اور سایہ دار شاہرا ہیں ہیں لیکن یورپ کے دوسرے خوبصورت شہر دیکھنے کے بعد ان دو شہروں کا حسن زیادہ متاثر نہیں کرتا۔

البتہ دنیا کے ایک قدیم ترین اور عظیم الشان دارالحکومت استنبول کا جواب نہیں۔ اس شہر کے مختلف نام رہے ہیں۔ بازنطینیہ، نیا روم، قسطنطنیہ، استنبول وغیرہ اسے مہا آنند (روحانی مسرت) کا استھان کہنا چاہیئے۔ یہی وہ شہر ہے جہاں دو سمندر اور دو براعظم بحیرۂ اسود اور بحیرۂ مارمورا کے مقام پر ملتے ہیں۔ ان دونوں سمندروں کو خوبصورت باسفورس ملاتا ہے۔ یہ شہر دو براعظموں پر پھیلا ہوا ہے۔ ایک طرف ایشیا ہے اور دوسری جانب یورپ۔ سات پہاڑیوں پر آباد یہ شہر اور اسکی ہزاروں مسجدوں کی فضا میں دور تک پھیلے ہوئے شاندار گنبد، بلند اور نفیس مینار ایک عجب روح پرور نظارہ پیش کرتے ہیں۔ یہی شہر ہے جو کبھی اسلام کے لئے باعث فخر تھا اور سلطنت عثمانیہ کا دارالخلافہ تھا۔ استنبول نے ہمیں بہت ہی متاثر کیا۔ ہم تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ شاید ہی استنبول جیسا کوئی اور شہر ہو۔ یورپ کے دوسرے شہر اگرچہ وسیع اور شاندار ہیں لیکن وہ صرف شہر ہیں اور استنبول اپنے تنوع کی وجہ سے ایک چھوٹی سی دنیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ استنبول بے مثال شہر ہے۔

استنبول جیسے بارونق اور آباد شہر سے اب ہم صاف ستھرے جدید اور پرسکون شہر انقرہ کو واپس آ چکے ہیں۔ سیر و تفریح کی ہیجان

خیزیاں ختم ہو چکی ہیں اور زندگی ایک بار پھر معمول پر آ چکی ہے۔

———— ترجمہ: مسٹر نعمانی

اسلام آباد۔ ۷ر اپریل ۱۹۶۷ء

ہم نے گھر بدل دیا ہے اور پھر نئے گھر میں منتقل ہو رہے ہیں تمہیں معلوم ہی ہے کہ یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ انقرہ سے کراچی، کراچی سے اسلام آباد اور خود اسلام آباد میں بھی ہوسٹل سے پہاڑیوں کے نزدیک ایک ٹاپ کے گھر میں اور وہاں سے شہر کے وسط میں ایک دوسرے گھر میں —— ہم مسلسل حرکت میں رہتے ہیں خواہ ہم ملک سے باہر نہ بھی ہوں ایسا لگتا ہے جیسے "ہمارے پاؤں میں چکر ہے"۔

اسلام آباد کی خاص کشش اس کی تازہ ہوا، سبزہ اور دیہی علاقے کا فطری حسن ہے جس کے ساتھ اسے ایک جدید شہر کی تمام سہولتیں بھی مل گئی ہیں۔ فطرت یہاں اچھوتے حسن کے ساتھ موجود ہے۔ ہر طرف سے مری کی خاکستری رنگ کی پہاڑیوں سے گھرا ہوا اسلام آباد نہایت خوش منظر ہے چنانچہ اس کے مختلف حصوں کو بھی رومانی اور داستانی قسم کے نام دیئے گئے مثلاً روپ پھلواری، گلشن، سنبل، کہسار، آب پارہ۔

بازار کا نام آب پارہ ہے اور ایک دوسرا مسقفی بازار بھی ہے جو کہ ترکی مسقفی بازاروں کی طرح ہے۔ اسلام آباد بعض بہت عمدہ اور ٹھوس قسم کے تعمیری کمالات کے ساتھ ترقی کی جانب گامزن ہے مثلاً سیکرٹریٹ، گورنمنٹ ہوسٹل وغیرہ اور گورنمنٹ ہوسٹل تو ایک جدید طرز کا لال قلعہ معلوم ہوتا ہے۔ جگہ جگہ مغل طرز کے باغات، ایرکنڈیشن مسجدیں اور ہر قسم کی آمدنی کے لوگوں کے لئے نہایت آرام دہ اور جدید طرز کے مکانات، ایک طرح سے اسے معجزانہ تخلیق کہنا چاہیئے۔ ایک خالی بیابان میں تین سال کے اندر ایک پورے شہر کا آباد ہو جانا کمال ہی تو ہے! لیکن ابھی پوری زندگی یہاں نہیں آئی ابھی کچھ وقت لگے گا۔

خصوصاً بیرون ملک سے واپسی پر یہاں کی سوشل زندگی میں بوریت محسوس ہوتی ہے۔ باہر کی سفارتی سرگرمیوں میں مراعات اور سوشل لائف کی تو کیا بات ہے میں اب بھی ترکی اور وہاں کے شاندار لوگوں کو یاد کرتی ہوں

———

اسلام آباد ۱۹ر مئی ۱۹۶۷ء

یہاں زندگی بے مزہ اور بے کیف ہے۔ وقت گزرتا ہی نہیں یہاں میرا باغ کی رکھوالی کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ ہم زیادہ تر اپارٹمنٹوں میں رہے ہیں یا فلیٹوں میں اور اب پہلی بار ہمیں گھر کے ساتھ باغیچہ نصیب ہوا ہے کاش کہ آپ اور حنیف بھائی یہاں ہوتے اور باغبانی میں میری رہنمائی کرتے۔ عمدہ اور نادر قسم کے پودے حاصل کرنے میں تمہارے ذوق اور علم سے فائدہ اٹھاتے لیکن اپنے گھر کے باغ میں پھول اگانے کا اور لطف ہوتا ہے اور کسی عارضی قیام گاہ میں جو اپنی نہ ہو پھول اگانا اور ہوتا ہے بہرحال ایک خاص حد تک اس میں بھی لطف آتا ہے۔ گھر کے سابق مکین کے چھوڑے ہوئے باغ میں پھول تو معمولی سے ہیں لیکن بہت اچھے آگے اور پیچھے بڑے بڑے چمن ہیں۔ کچھ گلاب کی چیڑیاں گیندے اور کچھ چھوٹے پھول موجود ہیں جن کے نام مجھے نہیں آتے اور جن کے مختلف رنگ ہیں۔ میں پھولوں کو صبح سویرے پانی دیتی ہوں۔ میں ساڑھے چار بجے اذان کی سریلی اور روح پرور آواز کے ساتھ جاگتی ہوں جو کہ ایک نہایت خوبصورت تاج محل کے نمونے کی بنی ہوئی ایک چھوٹی اور بے مینار مسجد سے آتی ہے اور ہمارے گھر کے بالکل سامنے ہے پانچ بجے صبح کی نماز پڑھتی ہوں اور پھر صبح کی سہانی فضا میں باغ میں نکل جاتی ہوں اور پودوں کو پانی دینا شروع کر دیتی ہوں اس میں مجھے بڑا لطف آتا ہے۔ پہاڑی کے دامن والے گھر میں میری واحد خوشی پہاڑی کے سلسلے اور پھولوں کے باغات کے ساتھ ساتھ چہل قدمی تھی۔ (اکثر اس سے مجھے اپنی کالج کی زمینیں یاد آتی تھیں) جہاں کی ہوا مہکتے ہوئے پھول کی خوشبو سے بھری ہوتی تھی اور آم کے بور کی نشیلی خوشبو اور بے شمار رنگ رنگ کے پرندے درختوں پر زور زور سے چہچہاتے تھے اور کوئل کی کوک اور پپیہے کی پی کہاں سنائی دیتی تھی۔

———

اسلام آباد ۲۷ر اپریل ۱۹۶۸ء

...... میں اس مضمون کی نقول حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو میرے بارے میں مشہور روزنامہ جنگ میں شائع ہوا تھا اور چاہتی تھی کہ یہ مضمون تمہیں اور اپنی بہنوں کو اور صادق بھائی کو مطالعے کے لئے

بھیجدوں، مجھے دو فالٹو کاپیاں ملی ہیں جس میں سے ایک میں تمہارے پاس بھیج رہی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ پاکستان ٹائمز کے عید نمبر میں چھپنے والے اپنے مقالے کی زائد کاپی حاصل نہ کر سکی یہ مضمون" ترکی میں رمضان اور میٹھی عید" پر تھا۔ میں نے صادق بھائی سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی کاپی تمہیں دیدیں۔ یہ ایک ہلکا پھلکا مضمون ہے جو کہ سرسری طور پر لکھا گیا ہے لیکن جن ترکوں نے بھی اسے پڑھا وہ اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہمارے نہایت اچھے دوست کرنل کان دوریان نے مجھے انقرے سے لکھا کہ ترکی میں جس نے بھی اس مضمون کو پڑھا اس سے متاثر ہوا اور اس مضمون میں ترکوں سے جن خلوص اور محبت کا اظہار کیا گیا ہے اس سے وہ بھی آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے ان کو خط میں لکھا کہ جو محبت ترکوں کو ہم سے تھی اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں۔

آج کل اسلام آباد کا موسم بہت اچھا ہے۔ ابھی تک بہار ہے اور عجیب عجیب پھول کھلے ہوئے ہیں اور ٹھنڈے زمردیں چمن نظر آتے ہیں۔ ہمارے باغ میں پینوٹیا، کچھ گلاب، ڈاایانتھس اشرفی یال پاکس وغیرہ ہر طرف اگ رہے ہیں اور ان میں رنگا رنگ کے پھول ہیں۔ پچھواڑے سبزیوں کے باغ سے ہم نے بہت سی مولیاں اور سلاد لگایا ہے اور اب ٹینڈے اور بھنڈی (یہ ایک نئی سبزی ہے جو کہ انگورہ میں نہیں ملتی) خربوزے، ٹماٹر، کدو وغیرہ کا وقت ہے۔

اسلام آباد۔ ۱۹/ اپریل ۱۹۶۹ء

آج کل موسم نہایت اچھا ہے موسم بہار کی بارشیں ہو رہی ہیں اور ہر طرف حقیقی بہار ہے ہمارے شاندار چمن میں بھی کہیں کہیں رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ میرے کمرے کے پاس ایک چمبیلی کی بیل ہے جس سے رات کو ہلکی ہلکی خوشبو آتی ہے۔ کئی رنگوں کے گلاب ہیں کچھ پینیریاں فلاکس وغیرہ ہیں لیکن ایک اور ماہ گزر جائے تو اسلام آباد گرمی سے ابلنے لگے گا، میں دعا کرتی ہوں کہ گرمی ذرا ٹل جائے کیوں کہ میں گھر کا تمام کام کاج خود کر رہی ہوں، ہمارا خانساماں جو کہ ہمارا واحد ملازم ہے ڈھائی ماہ کی طویل چھٹی پر گیا ہے اور میں کوئی دوسرا خانساماں رکھنا نہیں چاہتی۔ میں سودا سلف بھی خود لاتی ہوں جو کہ درحقیقت

اسلام آباد میں ایک خوشگوار کام ہے۔ یہ سقفی بازار میں جو نہایت ستھرا ہے اور جہاں دکاندار نہایت مہذب اور باادب ہیں اور خاص گاہکوں پر خاص توجہ دیتے ہیں ——— میں ہمیشہ خاص اور چہیتے گاہکوں میں شمار ہوتی ہوں۔ انقرہ میں بھی اور یہاں بھی۔ اس چھت سے ڈھکے ہوئے بازار میں گوشت اور سبزی سے لے کر کپڑوں تک اور چاندی کے زیورات تک کوئی بھی چیز مل جاتی ہے یہ مارکیٹ ہمارے گھر سے صرف چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے اور صبح یا شام سیر کے لئے نہایت خوشگوار منظر پیش کرتی ہے۔ خریداری، صفائی، ——— اور کپڑے دھونے اور کھانا پکانے میں صبح و شام بسر ہو جاتے ہیں۔ شاہین تین بجے دفتر سے آتے ہیں اور جب ہم کھانا کھاتے ہیں تو پونے چار بج چکے ہوتے ہیں اور پھر ہم تھوڑی دیر آرام کر کے ساڑھے پانچ یا چھ بجے شام کی چائے پی لیتے ہیں اور لمبی سیر کو نکل جاتے ہیں۔ دوستوں سے مل لیتے ہیں اور واپس آکر آدھی رات تک کتابیں پڑھتے ہیں۔ کوئی اچھا پروگرام ہو تو کسی ہمسائے کے گھر میں ٹیلی وژن دیکھ لیتے ہیں۔

سب سے سریلی آواز آذان کی ہے جو سنبل کے علاقے والی مسجد سے آتی ہے جس کی تصویر میں نے تمہیں بھیجی ہے مسجد کی تصویر سے اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ حقیقتاً کتنی خوبصورت ہے۔ یہ سادہ خوبصورت اور بہت جدید قسم کی مسجد ہے۔ ہاں تم درست کہتی ہو اسلام آباد ایک خوبصورت جدید شہر ہے جس میں دیہاتی اطراف کے حسن اور جدید عمارات اور رہائش گاہوں کا امتزاج ملتا ہے اور زندگی کی تمام جدید سہولتیں میسر ہیں۔ جو چیز اس کو خوش منظر بناتی ہے وہ اردگرد کی پہاڑیاں ہیں۔ کچھ فاصلے پر ایک بند ——— راول بند اور راول جھیل واقع ہے، یہ وہ جگہ ہے جس سے راولپنڈی کا نام نکلا ہے۔ سفارت خانے اور سفارتی دفاتر راول جھیل کے قریب ہی آئندہ کسی وقت بنائے جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اسلام آباد کی عمارتیں فرداً فرداً بھی بہت خوبصورت اور پُراثر ہیں۔ سیکرٹریٹ کے بلاک، گورنمنٹ ہوسٹل، ہوٹل شہرزاد وغیرہ ان میں خوبصورتی یہ ہے کہ ان میں جدید طرز تعمیر کو ہمارے اپنے ہاں کے نقشوں اور نمونوں سے ملا دیا گیا ہے۔ مثلاً مختلف رنگوں اور نمونوں میں مغل طرز کی جالیاں زیادہ

ترسفید مغل بارہ دریاں، محرابیں ہر جگہ پر اسلامی اور مغل طرزِ تعمیر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، ہر طرف مغل باغات ہیں گویا کہ چھوٹے چھوٹے شالامار ہیں۔ رہائشی مکانات نہایت اچھے ہیں اور ہر آمدن کے لوگوں کی ضروریات کے مطابق ——— بنائے گئے ہیں۔

اور ان میں جدید سہولیات مثلاً گیس اور بجلی سے پانی گرم کرنے کے گیزرز، چھت کے پنکھے لگائے گئے ہیں۔ چھوٹے بنگلے جن میں جگہ کو بڑے مفید طریقہ سے استعمال کیا گیا ہے اور بڑے بڑے چمن بنائے گئے ہیں۔ پرائیویٹ مکانات جن کو سفارت خانوں، سیکرٹریوں اور وزیروں نے کرایہ پر لیا ہوا ہے جن کے کرائے فی ماہ چار ہزار، تین ہزار یا اس سے بھی زیادہ ہیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ہر شاندار بنگلہ کسی نئے طرز کا ہے۔ مجموعی طور پر اسلام آباد نہایت پرشکوہ معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اسے حصہ بہ حصہ دیکھیں تو مجموعی طور پر یہ کسی اچھے منصوبہ بندی سے تیار کئے ہوئے شہر کا نقشہ نہیں پیش کرتا جس یونانی انجنیئر نے اس کا نقشہ بنایا ہے اس کا کہنا ہے کہ یہ مستقبل کا شہر ہے اور اس لئے اس کا کوئی "مرکز" نہیں۔ یہ قطعوں میں تعمیر ہوا ہے اور ہر قطعے میں اپنے خاص ٹائپ کے کوارٹروں کے ساتھ ساتھ اپنی مسجد اور اپنی مارکیٹ بھی ہے۔ مستقبل کے شہر کے بارے میں ہر تعمیرات کا جو بھی خیال ہو میں تو چاہتی ہوں کہ اسے وینس کی طرح دائروں میں بنایا جاتا یا قدیم روم کی طرح اس کے زیادہ ہجوم والے بازاروں میں بڑے بڑے چوک بنائے جاتے جن میں بُت، فوارے، باغات ہوتے جہاں لوگ گذرتی ہوئی ٹریفک کے خطروں سے بچ کر بیٹھ سکتے اور ٹریفک کا نظارہ کر سکتے یا پھر اسے پیرس یا کسی دوسرے فرانسیسی شہر کی طرح بنایا جاتا۔

بہرحال یہ بہت پیارا شہر ہے شیشے کی طرح صاف وسیع میدانوں، سبزہ زاروں، ہواؤں اور سکون کا گہوارہ۔ کم از کم فی الحال تو ہمارا دل کراچی جانے کو نہیں چاہتا۔ بے پناہ آبادی۔ گرد و غبار شور اور غلاظت والا کراچی۔ دیکھئے کب تک ہم اسلام آباد میں ٹھہر سکتے ہیں اور اگر ہمیں یہاں سے جانا ہو تو خدا نے چاہا تو پھر ہم ملک سے باہر جانے کو ترجیح دیں گے۔

اسلام آباد — ۵ فروری ۱۹۷۰ء

میں یوم منظوریٔ پاکستان ٹائمز کا ایک تراشہ اس خط کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ تصویر میں تم مجھے بائیں سے دوسرے نمبر پر دیکھ سکتی ہو میں تمہیں وہ تصویر بھی بھیج رہی ہوں جس کا میں نے عرصے سے وعدہ کیا تھا۔

پیاری زینت اس بات کا امکان ہے کہ ہم اقوام متحدہ کے ہیڈکوارٹرز میں متعین ہو کر نیویارک چلے جائیں تاہم ابھی تک اس بات کا یقین نہیں ہے لیکن اگر احکامات آجائیں تو ہو سکتا ہے کہ ہم بہت مختصر نوٹس پر چلے جائیں اسلئے میں تم سب کے خطوط جلدی جلدی حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ تم سے، عالم سے، انجمہ سے اور صادق بھائی سے۔

ہم نے "السٹریٹیڈ ویکلی" کا عید نمبر بھی دیکھا۔ جب تم نے مجھے قرۃ العین کے مقالے کا لکھا تو شاہین یہ نمبر میرے لئے دفتر سے نکلوا کرلے آئے۔ قرۃ العین جیسا کہ تم جانتی ہو میری ہم عصر اور ذاتی دوست ہے، ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے میں اسکی قدر کرتی ہوں اور بلاشبہ وہ جدید اردو ادب میں نہایت بلند مقام رکھتی ہے۔ مجھے اس کی کہانیاں اور سوانحی مضامین جو ویکلی میں چھپا کرتے ہیں پسند ہیں لیکن عید نمبر کے مضمون کے بارے میں میرا خیال جدا ہے اس نے اکثر اپنی مرابوط کلچر والی تھیم کو دہرایا ہے خصوصاً یہ کہ ہندو مسلمان مشترکہ تہذیبی وراثت رکھتے ہیں میں یہاں اس سے اختلاف رائے کا ذکر نہیں کر رہی جو کہ ہمارے درمیان ہے۔ میں تو سری کے برِّاعظم کا جو تجزیہ نراد چودھری نے کیا ہے اس کو زیادہ ترجیح دونگی۔ مقالہ بجائے خود ناہموار اور بے تناسب ہے اور اس میں بے حد وسیع بنیاد پر ایک معمولی نکتہ ثابت کرتے ہوئے اپنے "علم" کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (شاہین یہ الزام مجھ پر بھی لگاتا ہے) جو کہ فرضی ہے۔ سنجیدہ چیزوں کو ہلکے انداز میں پیش کیا گیا ہے جیسے "اسرائیلی کبھی کبھار مندر میں ناچنے والی لڑکیوں سے چھیڑ خانی کرتے تھے اور ان کے خدا نے ان پر قہر نازل کیا"۔ یا "آئیے بے چارے صوفیوں کے پاس چلیں"۔ یہ ایسی صریح غلط بیانیاں ہیں جیسے "فاطمہ محمدؐ کی اکلوتی بیٹی تھیں" وغیرہ اس طرح تاریخی حقائق بھی غلط بیان کئے گئے ہیں۔

شاہین جن کو تاریخ اور اسلامی تاریخ پر کافی عبور ہے اسے ایک کمزور مقالہ سمجھتے ہیں۔ قرۃ العین کے لئے بہتر ہوگا کہ اپنے فن کو ناول نگاری تک محدود رکھے کیوں کہ وہ جب تاریخ میں اپنا راستہ بناتی ہے تو بے شمار خالی جگہیں رہ جاتی ہیں اور تاریخی حقائق تمام تر غلط ہو جاتے ہیں۔

قرۃ العین خود ویکلی کے ایڈیٹروں میں سے ہے اور اس سے اس نمبر کو زیادہ بہتر طور سے ایڈٹ کرنے کی امید تھی۔ اس میں اسلام کے بارے میں صرف ابتدائی قسم کی باتیں کی گئی ہیں اور اگر اس کا مقابلہ آئندہ نمبر یعنی کرسمس نمبر سے کیا جائے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ یہاں عیسائیت کا گہرا ادراک موجود ہے اور اس کی اچھی نمائندگی کی گئی ہے جس کسی نے بھی کرسمس نمبر کو ایڈیٹ کیا ہے اس نے ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے اور اچھا کام کیا ہے۔ عید نمبر کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا۔

اسلام آباد۔ ۲۳ اپریل ۱۹۷۰ء

امید ہے کہ جلد خط نہ لکھنے پر مجھے معاف کرو گی مجھے تمہارا خط وقت پر ملا اور کالج کا رسالہ سٹارٹ بھی جس میں تبسم کا پیارا مضمون ہے۔ تبسم کتنے شگفتہ اور برجستہ انداز میں لکھتی ہے۔ انگریزی میں بھی اس کا طرز بیان بہت اچھا ہے فطری سہل اور زوردار۔ مجھے تو معلوم ہوا کہ اس رسالے میں تمام لکھنے والوں نے اچھی انگریزی لکھی ہے۔ ہمارے زمانے کے مقابلے میں انگریزی کا معیار بلند ہو گیا ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ طلباء انگریزی سکولوں میں پڑھے ہوئے ہیں باتم جانتی ہو کہ ہم اپنے زمانے میں "استثناء" تھے۔ تم بی اے میں انگریزی میں اول آئی تھیں۔ میں بھی یونیورسٹی میں فسٹ آنے والی تھی لیکن انگریزی کے پرچے میں مجھ سے پورا ایک سوال رہ گیا تھا جس کے ۳۳ نمبر تھے اس کو اگر میں حل کرنے کی کوشش کرتی اور صرف ۸ نمبر تک لے لیتی تو فسٹ آجاتی۔ ایک ہندو لڑکی وید بہی جو کلاس میں ہمیشہ سیکنڈ آیا کرتی تھی انگریزی میں یونیورسٹی بھر میں اول آئی اور میں جو اس لڑکی سے ہمیشہ آگے ہی رہتی تھی یہ فاش غلطی سرزد کر بیٹھی مجموعی طور پر میں نے فسٹ ڈویژن لیا اور سوشیالوجی میں سب سے اول آئی لیکن انگریزی میں اول نہ آنے کی کسر پوری نہ ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری اور میری انگریزی اچھی کتابیں پڑھنے سے بہتر ہوئی تھی۔ اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے ہمارے زمانے میں انگریزی میں سیکنڈ ڈویژن لینا بہت بڑی بات تھی۔ فسٹ ڈویژن تو ہوتے ہی نہیں تھے اور ذہین طلباء بھی انٹر اور بی اے میں سیکنڈ کلاس ہی لیا کرتے تھے۔

اسلام آباد۔ ۵ جون ۱۹۷۰ء

اس سال گرمی بہت جلدی شروع ہو رہی ہے۔ ٹمپریچر ابھی سے ۱۰۲ درجہ تک پہنچ چکا ہے۔ موسم بہار کا احساس صرف ایک ماہ کے لئے ہوا تھا اور بس۔ یہاں کی گرمی کس قدر گھٹن پیدا کرنے والی ہے۔ اگر میں دھوپ میں نکلوں تو تمام جسم اور چہرے پر گرمی دانے اور پھنسیاں نکل آتی ہیں اسلئے مجبوراً مجھے گھر میں رہنا پڑتا پڑتا ہے۔ شام کو ہم یا تو دوستوں سے ملاقات کرنے چلے جاتے ہیں یا ہمارے دوست ہم سے ملنے آجاتے ہیں اور ہم اپنے فراخ چمن میں رنگا رنگ گلابوں میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں اور رات گئے تک باتیں کرتے رہتے ہیں انار یا فالسے کا خوب ٹھنڈا شربت پیتے ہیں یا پھر کھانے کے بعد سبز چینی چائے پیتے ہیں۔ ہمارا شام کا کھانا بھی ایک ٹرالی میں لان پر لایا جاتا ہے۔ کباب یا تکوں کا سادہ سادہ سا عشائیہ۔ نہ چاول اور نہ روٹی۔ آدھی رات کے وقت جب ہم اپنے سونے کے کمروں میں جاتے ہیں تو وہ تنور کی طرح تپ رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہمسائے باہر چمن میں ہی سو جاتے ہیں لیکن ہم ایسا نہیں کرتے۔

اب اس وقت دوپہر کے دو بجے ہیں اور میں چھت کے پنکھے کے نیچے ٹیک لگا کر تمہیں خط لکھ رہی ہوں پنکھا گرم ہوا لے رہا ہے۔ میں ٹھنڈا شربت روح افزا پی رہی ہوں۔ یہ وہ مشروب ہے جو اندر سے بھی بدن کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ میں ابھی ابھی آبپارہ مارکیٹ اور ویلفیئر سٹور سے مہینے بھر کا سودا لے کر آئی ہوں میں تم کو

خط لکھ رہی تھی اور پہلا صفحہ لکھا ہی تھا کہ ہمارے ہمسائے مسٹر جاوید جائنٹ سیکرٹری کی اہلیہ مسز جاوید کا فون آ گیا اس نے دفتر سے کار منگوائی ڈرائیور بھی ساتھ تھا انہوں نے کہا اگر چیزیں لینے کے لئے جانا ہے تو آ جائیں میں نے کہہ دیا کہ اچھا۔

اگرچہ ہم کار میں گئے لیکن گرمی نے پھر بھی مجھ پر اثر کیا اور جب میں لکھنے بیٹھی تو جو لکھ رہی تھی اس سے بھٹک گئی جو کچھ میں کہنا چاہتی تھی وہ یہ ہے کہ میں بڑے فکر میں ہوں کہ میرے خطوط آپ تک پہنچتے بھی ہیں یا نہیں میں انہیں باورچی یا چوکیدار کو دے دیتی ہوں کہ ڈاک میں ڈال دے۔ ان میں سے بعض کے جواب مجھے نہیں آئے۔ اگر تمہیں میرے خطوط ملتے ہیں تو براہ کرم جلدی جواب دیں۔ ان میں اتنا پیار اور اتنی کار آمد باتیں ہوتی ہیں کہ نہ پوچھو پھر یہ تم نہایت عمدہ انگریزی میں لکھے ہوتے ہیں اس کے علاوہ میرے لئے تم یہاں اور منگلور کے درمیان واحد رابطہ ہو۔

اسلام آباد۔ ۱۰ اگست ۱۹۷۰ء

میں تمہیں کیا معذرت پیش کر سکتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خط لکھنے کے لئے میں زندہ بھی نہ رہتی۔ پچھلے تمام مہینے میں سخت بیمار رہی ہوں۔ حرارت مسلسل ۱۰۴ سے ۱۰۷ تک رہتی تھی اور اگر کچھ کم بھی ہوتی تھی تو ۱۰۲ تک آ جاتی تھی لیکن نارمل کبھی بھی نہیں ہوئی۔ پورے دس دن اسی حالت میں گزرے چند دن بعد پھر ویسی حالت ہو گئی ایسا لگتا ہے کہ کوئی اندرونی بیماری ہو گئی ہے اور پہلے ڈاکٹر بھی اسکی تشخیص نہیں کر سکے کہ یہ ملیریا ہے یا ٹائیفائڈ اور حرارت کے اس قدر بڑھ جانے کی کیا وجوہات ہیں پہلے وہ مجھے کونین کی گولیاں دیتا رہا پھر جب بیماری کا پتہ لگ گیا تو اس نے نہایت طاقتور قسم کی جراثیم کش ادویات دیں میں نے ۴۴ کیپسول کھائے ہیں لوگ یقین بھی نہیں کرتے۔ جراثیم کش ادویات تو خون تک خشک کر دیتی ہیں میں ابھی تک کمزور ہوں لیکن میں نے سوچا کہ تمہیں ضرور لکھوں کیوں کہ تم بہت پریشان ہو گی کہ آخر میں نے جواب کیوں نہیں دیا۔

تمہیں معلوم ہے کہ ہم امید کر رہے تھے کہ نیو یارک سے ہمیں بلاوا آئے گا لیکن مجھے اچھے وقت پر یاد دلایا گیا کہ بلاوا کسی اور طرف سے آ سکتا تھا میں موت کے منہ سے بچ نکلی ہوں لیکن بڑی سخت جان ہوں نازک ملنے سے بچ کر نکل گئی۔

اتنی بیمار اور پھر اکیلی اور بے یار و مددگار پڑی رہی۔ کوئی ہاتھ پکڑنے یا ماتھے پر ہاتھ رکھنے کو بھی پاس نہیں تھا اور نہ ہی تسلی دینے کے لئے تھا۔ بیماری کے دو ہفتے بعد رحیمہ پشاور سے آئی وہ میری بڑی اچھی رکھوالی کرتی رہی۔ اب چھوٹی بیٹی زرین بھی یہاں ہے گوہر کی بہت ہی پیاری بچی پانچ سالہ بیٹی فریال بھی یہاں ہے۔ اسی بچی کو ہم لے کر پالنا چاہتے ہیں لیکن گوہر کی صرف یہی بچی ہے اگر اس کی ایک بھی اور بیٹی ہوتی تو ہمارا ارادہ تھا کہ اس لڑکی کو بیٹی بنا لیتے۔ میں اس کے فوٹو بھیج رہی ہوں گڑیا کی طرح پیاری ہے حقیقی کشمیری حسن کا نمونہ ہے۔ شہد کی طرح سنہری اور گھنگریالے بال، شہد کی طرح بھوری آنکھیں نہایت صاف رنگ گلاب کی کلی کی طرح چھوٹا دہانہ اور جسم کے ہر خط نہایت شاندار، بچی کا باپ کشمیری ہے۔ کل (۹ اگست کو) ہم نے خیری (ہم اسے خیری کہتے ہیں) کی سالگرہ منائی۔ کل وہ پانچ سال کی ہو گئی۔ میں اس کے لئے انوکھے انوکھے لباس خرید نا پسند کرتی ہوں اور ہر رنگ اس پر اچھا لگتا ہے وہ یہ بھی جانتی ہے کہ کس لباس کے ساتھ کونسا نیل پالش اور کون سا لپ سٹک ہونا چاہیئے اسے حسن کا بہت احساس ہے لیکن بہت ہوشیار اور با اطوار لڑکی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم اسے کسی اچھے انگریزی سکول میں داخل کرانا چاہتے ہیں اور اسکی تعلیمی بنیاد اچھی رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اسے ساتھ نیو یارک بھی لے جائیں لیکن یقین نہیں کہ اس کا باپ اسکی اجازت دے گا۔

ایک اچھی خبر سنو۔ پرویز شاعر ہو گیا ہے اسکی نظمیں لندن میں شائع ہونے والے مجموعوں اور رسالوں میں چھپ رہی ہیں اس نے ہمیں ایک چھپی ہوئی نظم بھیج کر حیران کر دیا اور ساتھ ہی وعدہ کیا ہے کہ کچھ اور بھیجے گا۔ کچھ نوجوان انگریزی شاعروں نے شاعری کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے جس کا نام بیسویں صدی کی شاعری ہے۔ پرویز کی نظم بھی اس میں چھپی ہے۔

جو نظم پرویز نے ہمیں بھیجی ہے وہ ایک رسالے پوئیٹری فورم میں نمایاں طور پر چوکھٹے میں درمیانی صفحے پر چھپی ہے۔ اس میں باقی تمام شعراء انگریز ہیں۔ اس نظم کا عنوان "خط" ہے۔ جب میں اسکی نظم کی ان سطروں پر پہنچی

WILL THIS ONE (LETTER) FIND HIS

MOTHER ALIVE OR DEAD ?

OR IN BETWEEN THE CHIMES?

تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کیوں کہ میری اپنی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ اس کا خط اور اسکی نظم ایسے ہی لمحے میں یہاں پہنچے تھے۔

لیکن یقین کرو کہ میں نے کبھی بھی اپنے بچوں کو اپنی سخت بیماری کے بارے میں نہیں لکھا خواہ مخواہ انہیں کیوں پریشان کروں وہ اتنی دور سے آ تو سکتے نہیں۔ وہ وہیں خوش رہیں جہاں ہیں۔ ہیں پرویز کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ گر یز یورپ میں چھٹی منا رہا ہے اپنے (یونی لیو) نئے کام پر لگنے سے پہلے کچھ سیر و تفریح کرنا چاہتا ہے۔ پرویز نے کنگز کالج میں داخلہ لینے کی غرض سے اپنا کام چھوڑ دیا۔ ہے وہ فلسفے کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔

زینت میں جانتی ہوں کہ یہ خط ایسا اچھا نہیں ہے جیسے کہ میرے پہلے خطوط تھے۔ میں ہیئت ترتیب یا تقدیم و تاخیر کا لحاظ کئے بغیر لکھتی رہی ہوں۔ میں ابھی تک ویسی کمزور ہوں۔ میں اتنی تھکی تھکی ہوں کہ تھوڑی سی محنت بھی مجھے چور چور کر دیتی ہے۔ ——

—— اس کے باوجود میں نے تم کو خط لکھا۔ آخر میں میں تہہ دل سے ان خوبصورت جذبات کے لئے تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کا اظہار تم نے میرے حق میں کیا ہے۔ خاتمہ نہایت خوب تھا کہ "بہن تمہاری طرح کوئی بھی نہیں ہے" جب شاہین نے یہ خط پڑھا تو۔ مجھے بلایا اور کہا کہ "زینت نے جو کچھ تمہارے بارے میں لکھا ہے وہ تم نے پڑھا ہے! کہتی ہے "تمہاری طرح کوئی بھی نہیں"۔ میں نے کہا "زینت نے تو کہا ہے لیکن آپ نے کبھی ایسا نہیں کہا" اور اس نے کہا "تم جانتی ہو کہ میں زیادہ نمائشی خاوند نہیں ہوں۔ میں نے کہا نہیں لیکن میں نے محسوس ضرور کیا ہے"۔ کیا میں اس پر اعتبار کر لوں؟

اسلام آباد۔ ۸ر اکتوبر ۱۹۷۰ء

• اول تو میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اب میں بالکل اچھی ہوں —— اگرچہ پورا علاج نہیں ہوا۔ پہلے مہینے کے بعد حرارت نارمل رہی ہے اگرچہ بیماری کا حملہ بار بار ہوتا ہے اور جراثیم کش ادویہ کھانے سے ختم ہو جاتا ہے۔

اب تک میں ٦ ایکیپسول کھا چکی ہوں اور میرا جسمانی نظام اب اس کا عادی ہو چکا ہے۔ میں ایک بہت اچھے ڈاکٹر کے زیر علاج ہوں۔ ڈاکٹر سرفراز کے بارے میں اس کے مریض کہتے ہیں کہ وہ بہت شفا رکھتے ہیں۔ حقیقتاً وہ مسیحائی لمس رکھتے ہیں۔ ایک انسان کی حیثیت سے بھی وہ نہایت شاندار کردار کے حامل ہیں۔ نہایت خوش مزاج، رحمدل، مہربان اور بہت ہی پسندیدہ طبیعت کے مالک ہیں بالکل جیسا کہ ایک ڈاکٹر کو ہونا چاہیئے۔ وہ شاہین کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں ایل ایم کالج میں جب شاہین ان کے زیر علاج تھے تو ان سے کہنے لگے کہ شاہین صاحب آپ کو یاد نہیں میں انٹرمیڈیٹ میں آپ کا طالب علم تھا لیکن آپ بیس سال بعد بھی ویسے ہی ہیں"۔

ڈاکٹر سرفراز نے مجھے یقین دلایا ہے کہ بیماری مسلسل علاج سے چلی جائے گی لیکن اس پر کچھ وقت لگے گا۔ بہرحال اب مجھے کوئی فکر نہیں۔

اسلام آباد۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۷۰ء

عید سے دس دن پہلے میں نے کارڈ بھیجنے شروع کر دیئے تھے ہندوستان کو، امریکہ کو، لندن کو، ترکی کو۔ صرف پاکستان میں بھیجے جانے والے کارڈ عید سے دو دن پہلے تک کے لئے روک لئے اور دس دن پہلے میں نے عید کارڈ اور ایک خط اپنی پیاری بہن عالم کو بی آر پی کالونی کے پتے پر بھیجا تھا۔ میں کیسے جان سکتی تھی کہ اس پر کیا آفت پڑ گئی ہے اب اپنے آپ کو میں کس قدر مجرم سمجھتی ہوں کہ میں نے عید منائی دوستوں سے عید پر ملاقاتیں کیں اور میرے مہمان آئے میں نے ان کو گاجر کا حلوہ، خشک میوہ، دال موٹھ حسب معمول کھلایا۔ بریانی کھائی اور اس المیہ سے مکمل طور پر بے خبر رہی جو میری بہن کو پیش آیا۔ یہ المناک خبر مجھے عید کے دوسرے دن نجمہ کے خط سے معلوم ہوئی۔ میں نے نجمہ کا خط کھولا اور خیال کیا کہ اس میں عید کارڈ ہے اور یہ خط جس کا مجھے عرصہ سے انتظار تھا ایک ناقابل یقین المناک خبر لئے ہوئے تھا۔

اس کا غم اتنا ہوا ہے کہ کوئی بھی ہمدردی یا تعزیت اس کے لئے ناکافی ہے۔ پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ میری دلی ہمدردی اور تعزیت عالم آرا تک پہنچا دو۔ اگر وہ ابھی تک منگلور میں ہے۔ علی بھائی جان تو ایک

دل تھے وہ جنت کو سدھار گئے ہیں اور ہمیں ان کے لئے غم نہیں کرنا چاہیئے۔ غم تو زندوں کے لئے ہے اس بیوی کے لئے جو ابھی چالیس سے کم ہے اور اس بیٹے کے لئے جو ابھی بچہ ہے۔ اتنی کم عمر میں بیوہ اور یتیم ہو جانا حقیقی المیہ ہے۔ علی بھائی جان نہایت سمجھدار، عقلمند اور ہمدرد انسان تھے۔

پیاری زینت تم کہتی ہو کہ تم آپا اور میرے بھائی علی جان کے آخری دیدار کے وقت ملی ہو۔ اب آپ کیسی ہیں؟ کیا اب بھی وہ جوان نظر آتی ہیں چند سال پہلے تو تھیں لیکن جب سے ابا فوت ہوئے ہیں اور میرے پیارے ناناجان بھی فوت ہو گئے ہیں اس وقت سے ہمارے خاندان کے حالات بہت نازک ہو گئے ہیں۔ ان تمام کا اس کی صحت پر اثر ضرور پڑا ہو گا اور اب ان کی بیٹی بھی بیوہ ہو گئی؟ بیچاری خانم آپا! میرا دل اس کے لئے روتا ہے کیوں کہ عورت کے لئے خاوند کی موت سے بڑا دنیا میں کوئی بھی نقصان نہیں ہے۔ عورت کی زندگی شوہر کے دم قدم سے قائم ہے۔ اس کے بعد اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے! اب اسے اپنے بیٹے کے لئے زندہ رہنا ہو گا۔ رضو ہوشیار اور اطاعت شعار لڑکا ہے اور کاش اس کی تربیت باپ کے راستے پر کی جائے اے خدا اسے استقامت دے۔

اسلام آباد۔ ۲۳ر اگست ۱۹۷۱ء

تمہیں یاد ہے آج کونسا دن ہے؟ مجھے یقین ہے کہ تمہیں یاد ہے۔ آج ہماری شادی کی سالگرہ کا دن ہے۔ سالہا سال پہلے آج کے دن ہماری شادی ہوئی تھی اور پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل ہی کی بات ہو!

کچھ عرصہ پہلے مجھے ایسا لگتا تھا جیسے لکھنے کے لئے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ زندگی بالکل ہی رک گئی ہے۔ کوئی چونکا دینے والی یا خاص خبر باقی نہیں رہی تھی مستقبل کے لئے کوئی خاص منصوبے نہیں تھے۔ شاہین جون میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے ہیں اور اب قبل از پنشن چھٹی پر ہیں۔ چنانچہ فی الحال ہم صرف انتظار کر رہے ہیں ویسے اس کے لئے ــــــــــ ہی بہتر

نفظ ہو گا کیوں کہ شاہین کے پنشن کے کاغذات ابھی درست ہونے میں کافی وقت لگے گا۔ ہم یہاں کم از کم دو تین ماہ اور بھی ٹھہریں گے اور پھر واپس کراچی چلے جائیں گے۔ پھر اسی مصروف شور وغل والی گرد و غبار والی گندی کراچی میں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ کراچی نے بہت ترقی کر لی ہے اور گزشتہ چند سالوں میں جب کہ ہم باہر رہے ہیں بہت بہتر ہو گئی ہے۔ جیسی بھی ہے کراچی وہ جگہ ہے جہاں ہمیں بالآخر مستقل سکونت اختیار کرنی ہو گی۔ ہم اسلام آباد چھوڑنے کے بعد کہیں باہر جانا چاہتے تھے اسلئے کہ اسلام آباد سے ہمیں بہت لگاؤ ہو گیا تھا اسی لئے ہم ملک سے باہر جانے کو ترجیح دے رہے تھے لیکن اب تک یو این (UN) سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ شاہین کا نام یو این کی لسٹ میں ڈال دیا گیا ہے اس کی اسناد کو پسند کیا گیا ہے۔ لیکن فی الحال وہاں کوئی خالی جگہ نہیں ہے۔ لہٰذا آئندہ بھی جو مبہم سی بات ہے۔

شاہین کے دوسرے منصوبے بھی ہیں۔ وہ یو ایس اے اور کینیڈا میں مختلف یونیورسٹیوں کو تحقیقی فیلوشپ کے لئے لکھ رہا ہے وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں پڑھانا پسند کرتا ہے جو کہ امریکہ میں اول نمبر کی شہرت رکھنے والی یونیورسٹی ہے۔ وہ ایک دو کتابیں بھی لکھنا چاہتا ہے جن کے لئے وہ منصوبے بنا رہا ہے۔ ریسرچ فیلوشپ سے وہ اس قابل ہو جائے گا کہ یونیورسٹی میں پڑھائے بھی، ریسرچ بھی کرے اور کتابیں بھی لکھے۔ لیکن جب تک ان امیدوں میں سے کوئی عملی شکل اختیار نہ کرے وہ واپس کراچی جا کر اس گرامر سکول میں پڑھانے کا ارادہ رکھتا ہے جس میں پرویز اور گلریز پڑھا کرتے تھے جہاں منتخب طلباء ہی پڑھنے آتے ہیں۔ یہ نہ ہوا تو وہ اپنے پرانے ایس ایم کالج میں پڑھانا پسند کرے گا۔ اگرچہ بہت دیر ہو گئی ہے پھر بھی میں کچھ کام کرنا پسند کروں گی تاکہ اپنی طرف سے تھوڑے سے حصہ کا اضافہ کر سکوں۔

پرویز بحیرہ روم کے ایک جہاز میں سفر کر رہا ہے جو یونانی تہذیب کے علاقوں کے پاس ٹھہرے گا۔ اب تک وہ یونان کے ساحل اور جزیرہ روڈز سے ہوتے ہوئے ترکی جائیں گے۔ (تمہیں معلوم ہے

کہ یونانی تہذیب کے زیادہ آثار ترکی میں ہیں اور بہترین محفوظ کھنڈرات بھی بہ نسبت یونان کے ترکی میں زیادہ ہیں کالج میں ایک دفعہ میں نے ہیلن کا رول ادا کیا تھا۔ مزنا بیگم اے نونی بنی تھی جو پیرس کی وفادار تھی۔ لیلا واڈیا نے پیرس کا کردار ادا کیا تھا۔ ٹرائے بھی ترکی میں ہے) واپسی پر یہ لوگ لبنان جائیں گے۔ سر مارٹمر وہیلر اس دورے میں انکے ہمراہ ہے ان کی رہنمائی کر رہا ہے اور انہیں یونانی تہذیب پر لیکچر دے رہا ہے۔ پرویز اس دورے سے پورا فائدہ اٹھا رہا ہے ہم نے سر مارٹمر وہیلر کی تقریریں ٹی وی کی شاندار سیریز میں سنی ہیں جو یونان کی شان وشوکت اور روم کی عظمت کے عنوانات سے پیش ہو چکی ہیں۔

کراچی جانے سے پہلے ہمارا ابھی ارادہ ہے کہ کچھ سیر و سیاحت کرلیں۔ ایک بار کراچی چلے جائیں تو ہمیں ایک ہی جگہ ٹھہر جانا ہوگا فاصلے اتنے طویل ہیں اور کراچی کے گرد کوئی بھی دلچسپ جگہ نہیں۔ جب کہ پاکستان کے یہ شمالی خطے حسن سے بھرپور ہیں۔ پہاڑوں کے سلسلے ہیں، جھرنے ہیں، جھیلیں ہیں اور خوبصورت طویل وادیاں ہیں۔ اسلام آباد سے ہم مختلف جگہوں مثلاً مری، نتھیا گلی، ایوبیہ جا سکتے ہیں۔ خالدہ (نذیر کی بیٹی) کچھ دنوں ہمارے ہاں ٹھہرنے کے لئے آ رہی ہے ہم اسے ان جگہوں میں سے کچھ پر ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ کم از کم پشاور، ایبٹ آباد، مری، نتھیا گلی اور ایوبیہ انشاءاللہ۔

ایک عرصہ سے ہماری سوات جانے کی خواہش تھی۔ یہ موقع تب پیدا ہوا کہ مصطفٰے کے گھر والے کراچی سے یہاں پندرہ دن کی چھٹی پر آئے اور ہمارے ہاں ٹھہرے۔ ہم ان کو چند دن کے لئے سوات لے گئے ہم اپنی موٹر میں گئے اور شاہین تقریباً تمام پانچسو میل کے راستہ پر کار چلاتے رہے بعض پہاڑی راستے خاص کر مالاکنڈ کی چڑھائی بڑی مشکل تھی۔ کسی بھی وقت بریک فیل ہو سکتے تھے۔ اور اگر بارش ہو جاتی تو بس پھر کام تمام تھا شاہین اب ایک مشاق ڈرائیور بن گیا ہے پھر بھی احتیاط کرتا ہے۔

مالاکنڈ سے گزر جانے کے بعد جب اصل سوات شروع ہوا تو موٹر چلانا مشکل نہیں تھی سوائے مدائن سے کالام تک کے بیس میل کے راستے میں جو در حقیقت بہت خطرناک ہے اور خدا کا شکر ہے کہ یہ راستہ ہم نے اپنی کار میں نہیں طے کیا۔ کہتے ہیں کہ کاغان بے انتہا حسن کی وادی ہے ہم نے کاغان نہیں دیکھا لیکن چند لوگوں نے بتایا ہے کہ یہ جگہ دیکھ کر تصور ہوتا ہے کہ اس کے حسین مقامات یہیں جیسے ہیں۔ سوات خوش منظر ہے اور مختلف قسم کے مناظر سینکڑوں میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم ایک جگہ ٹھہرے جہاں سے ہم سوات کے مختلف حصوں کو جاتے رہے یہ مدائن تھا جو کالام اور سیدو کے درمیان ہے (سیدو شریف سوات کا صدر مقام ہے) تمام وادی میں یہ سب سے حسین مقام ہے اور شاندار مدائن ہوٹل سے (جس میں ہم ٹھہرے تھے) دم بخود کر دینے والا منظر نظر آتا تھا۔ سرسبز پہاڑوں کے سلسلے ہی سلسلے جن کی ڈھلوانوں پر سیڑھیوں کی شکل میں کھیت تھے جو کہ سوات کی ایک خصوصیت ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں کھیت ایک سیڑھی کے بعد دوسری سیڑھی کی شکل میں اُفتاں تھے۔ بے شمار مربعوں کی شکل میں پھیلے ہوئے یہ کھیت زمردیں رنگ کے قالینوں کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے اور جب ہم ہوٹل کے بیرونی لاؤنج میں کافی پی رہے ہوتے (یا مصطفٰی کے گھر والوں کے ساتھ تاش کھیل رہے ہوتے۔ تمہارے ماموں شاہین اب بھی ہارٹ اور ڈائمنڈ یا سپیس اور کلب میں فرق نہیں کر سکتے) تو دریائے سوات تقریباً ہمارے پاؤں کے ساتھ بہہ رہا ہوتا۔ ایک ہی رفتار سے نہ خاموش اور نہ طوفانی اور پانی بالکل صاف شفاف۔ جب رات گہری ہو جاتی تو تقریباً پورا چاند سیاہ پہاڑیوں کے پیچھے سے نکل آتا کہ اس تمام حسن کا مشاہدہ کر سکے اور اپنا بھی جادو ڈال کر اسے پرستان میں بدل دے۔ پہاڑوں میں ٹمٹماتی ہوئی روشنی کبھی یہاں اور کبھی وہاں نظر آتی تھی۔ —— لیکن اس تمام حسن میں ایک المیہ بھی شامل ہو گیا۔ ہمارے جانے کے دو دن بعد موسلا دھار بارشیں شروع ہو گئیں اور دریائے سوات کا صاف شفاف پانی ایک غضبناک جھاگ میں تبدیل ہو گیا اور ایک سو سے زیادہ جانوں کو لے گیا۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکی ہوں مدائن اور کالام کے درمیان سڑک بہت خطرناک اور بے حد تنگ ہے۔ ایک طرف اونچے پہاڑ ہیں اور دوسری طرف دریا ہے۔ بارش سے سڑک پھسلواں ہو گئی تھی۔ ایک حد سے زیادہ لدی ہوئی بس جو کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور چالیس سے زائد مسافر اسکی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے بے قابو ہو گئی اور گہرے نالے میں گر پڑی اور وہاں سے

(باقی صفحہ ۱۳۸ پر)

گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

حضرت جگر مرادآبادی نے اس مصرعہ میں موجودہ دور کے انسان کے بارے میں نہایت بلیغ اشارہ کیا ہے۔ حقیقتاً آج انسان گھٹ گئے ہیں۔ لہٰذا ادب میں بھی انسان کا قد گھٹ گیا ہے۔

ڈرامے کے ہیرو کبھی یونانی المیوں کے بلند و بالا کردار ہوا کرتے تھے۔ جن میں دیوتاؤں کی صفات تھیں اور دیوتاؤں کی شان ان بلندیوں کے ساتھ ان میں کوئی انسانی کمزوری ہوتی تھی۔ جو ان کے المیہ میں منتج ہوتی تھی۔ شیکسپئر کے کردار گو زیادہ انسانی سطح پر تھے۔ تاہم بڑے بڑے ہیرو تھے۔ لیکن آج کے ڈرامے کے ہیرو گھٹتے گھٹتے سموئیل بیکٹ کے wating for go dot کا ناچیز غیر اہم انسان رہ گیا ہے یا ہیرالڈ پنٹر کا بے بس بے زبان حیوان (BIRTHDAY PARTY)

مروست، سارتر اور کامیو کے ناولوں کے ہیرو کی جگہ جدید فرانسیسی ادب کے نوویو رومان کے نہایت معمولی اور ادنیٰ اینٹی ہیرو نے لے لی ہے۔ حتےٰ کہ اس گروہ کے ایک ادیب راب گریئے نے بے جان چیزوں کو انسان پر ترجیح دی ہے۔

انگریزی نئے ادب کے Angry Yonng man شلانگس ے امیس اوس بورن وغیرہ کے ہیرو نہایت معمولی کردار ہیں۔ ان میں ڈی ایچ لارنس اور جیمیس جوئس کے کرداروں کا قد کہاں ہے؟

ادب میں انسان کا سب سے بلند و بالا تصور اقبال کا انسانِ کامل ہے۔ اقبال کے ہاں انسان کی خودی سب سے اہم مرکز ہے اور یہ خودی اتنی بلند ہو سکتی ہے کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔ انسان بڑی حد تک اپنی تقدیر کا آپ مالک ہے۔ جیسے قرآن میں بار بار کہا گیا ہے۔ انسان کو راہیں سمجھا دی گئی ہیں۔ ان میں انتخاب کا اسے مکمل اختیار ہے جب انسان کی تخلیق کی گئی تو اسی امتیاز کے ساتھ کہ خدا نے اسے قوتِ ارادی اور قوت فیصلہ کے ساتھ خیر و شر میں کسی ایک کے رد و قبول کا اختیار بھی بخشا۔ آدم کو علم اور جوہر عنایت کیا گیا اور انسان کا یہ مخصوص جوہر اس وقت نمایاں ہوتا ہے۔ جب وہ عقل و دانش سے کام لے کر مثبت و منفی، سیاہ و سپید، خیر و شر میں امتیاز کر کے رد و قبول کا فیصلہ کر سکے۔

آدم کے مقابل میں ایک ابلیس کی ضرورت تھی کہ ابلیس جو شر کی علامت ہے۔ انسان کو ترغیبات میں اُلجھائے رکھے اور انسان ایک کشمکش سے گزر کر اپنے لئے کوئی فیصلہ کرے اور ایک راہ منتخب کرے یوں انسان فکر و تدبر اور قوت فیصلہ سے کام لے کر زندگی کی راہیں آپ تراشتا ہے۔ اور نہ صرف اپنی انفرادی زندگی بلکہ دنیا اور کائنات کے نظم و ضبط کے بناؤ میں ایک ذمہ دار حیثیت سے حصہ لے سکتا ہے۔

شاید کہ کائنات ابھی ناتمام ہے..... یہ زمین دیکھ، فلک دیکھ..... فضا دیکھ۔ "ارض و سماوات میں جو کچھ ہے۔ اسے خدا نے

اپنی طرف سے تمہارے لئے تابع کر دیا ہے۔ یقیناً اس بات میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔" انسان کو نیابت الٰہی عطا کی گئی ہے۔ وہ اس زمین میں خدا کا نائب ہے انتشار افراط و تفریط اور بدنظمی کو دور کر کے نظم و ضبط پیدا کرنے میں کائنات کی تنظیم اور تعمیر میں انسان بھی شریک ہے۔ یوں انسان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

اقبال نے دراصل انسان کے اسلامی تصور ہی کو اپنایا ہے۔

صوفیوں کے اس تصور کے برخلاف کہ خودی کو مٹا کر اپنے آپ کو وجود مطلق میں جذب کر دینا انسان کی آخری منزل اور تکمیل ہے اقبال نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ انسان اس مکمل اور یکتا وجود کے جتنا قریب آتا ہے اس کی تکمیل کی منزل اتنی ہی قریب ہے۔ حتیٰ کہ "انسان کامل" وہ ہے جو بجائے خودی کو فنا کر کے خدا کی ہستی میں جذب ہونے کے، اپنے آپ میں خدا کی ہستی کو جذب کر لے۔

اقبال کا انسان کامل ایک آئیڈیل ہے۔ اتنی بلند و بالا، مکمل انسانی شخصیت پیغمبر دو عالم کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ البتہ تکمیل کی جد و جہد انسانی زندگی کا حاصل ہے۔

تکمیل کے معنی اقبال کے ہاں ایک ٹھہری ہوئی کیفیت اور جامد حالت کے نہیں ہیں بلکہ مسلسل تحریک اور مسلسل ارتقاء ان کا پیغام ہے جنت میں بھی اگر صرف آرام و آسائش، سکون و سلامتی اور ٹھہراؤ کی کیفیت ہے تو اقبال کو ایسی جنت قبول نہیں۔ "جاوید نامے" میں وہ حوروں کے بلانے پر جنت سے انکار کر دیتے ہیں۔ (اور منصور حلاج اور قرۃ العین طاہرہ کی روحیں بھی جنت سے نکل کر خلا میں مسلسل گھومتی رہتی ہیں) ہر دم ایک نئے طور، نئی تجلی کی تلاش میں سرگرداں، اللہ کرے، مرحلہ شوق نہ ہو طے۔

انسان کے روحانی ارتقا اور روحانی طمانیت کے کوئی محدود پیمانے نہیں ہیں مسلسل جد و جہد کرنا اور اپنی تکمیل میں کوشاں رہنا ہی اسے زیب دیتا ہے اور یہاں سے "نامکمل انسان" کے تصور کا آغاز ہوتا ہے۔

اقبال کے "کامل انسان" کا تصور نیٹشے کے "فوق البشر" (SUPERMAN) سے کہیں زیادہ اعلیٰ ہے اقبال کو نیٹشے سے اختلاف ہے۔ کہ ان کے ہاں "مادیت" ہے۔ نیٹشے کا سپرمین غیر معمولی قوتوں اور صلاحیتوں کا مالک ہے۔ لیکن ان کا تصور مادی ہے روحانی نہیں۔ وہ جابر بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے وجود سے دنیاوی اقتدار کی بو آتی ہے۔ چنانچہ دنیا کی بڑی بڑی سیاسی شخصیتوں کو مثلاً نپولین کو نیٹشے کے سپرمین سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کوئی سیاسی شخصیت اقبال کا "انسان کامل" نہیں ہو سکتی۔ فوق البشر انسان کا تصور پیش کرتے ہوئے نیٹشے نے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ بلندیاں پستیوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں۔ کہ ان سے افتاد کا امکان ہے۔

انسان کی افتاد کا تصور سراسر مسیحی تصور ہے کہ آدم کے بنیادی گناہ سے انسان کی سرشت میں گناہ شامل ہو گیا۔ اور تمام انسانیت آلودہ ہوئی۔ اور مسیح کی قربانی انسانیت کی نجات کا ذریعہ بنی اس مسیحی تصور کو آرجنیٹ کے مشہور ادیب BOURGES بورژش جو [illegible] کے پیشرو ہیں، اپنے افسانے "زخم کا ہلال" میں یوں اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ "یہ مناسب تھا کہ ایک آدمی کی باغ بہشت میں خدا کے حکم سے سرکشی انسان کی افتاد کا باعث ہو اور ایک گناہ سے ساری دنیا آلودہ ہو جائے۔ اور اسی طرح ایک آدمی کی صلیب پر قربانی ساری انسانیت کو بچائے اور نجات کا باعث بنے۔ شوپنہار نے غالباً سچ کہا ہے کہ میں سارے آدمیوں میں ہوں یعنی ہر آدمی سارے آدمیوں میں ہے۔"

اسلام میں گناہ اور نجات کا تصور مسیحی تصور سے مختلف ہے کہ ہر فرد اپنے کردار اور عمل کے اعتبار سے جزا اور سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ ہر فرد کی نجات اسی کے کردار و عمل میں مضمر ہے۔ یہاں علم اخلاق اور ایمان و حقیقت کا علم صحیح ہی کافی نہیں۔ ایمان و عقیدہ کے ساتھ ساتھ اسلام نے کردار و عمل کی اہمیت پر بھی بہت زور دیا ہے۔

آدم کی سرگزشت کا حال بھی تورات اور قرآن میں مختلف ہے آدم کی لغزش کو قرآن نے دوسرے پیرائے میں بیان کیا ہے اور

اس حصہ کو ایک الگ معنویت دی ہے، چنانچہ آدم کے اس بنیادی گناہ کے معنی جنسیت تک محدود نہیں کئے گئے۔ اور قرآن نے اس درخت کو جس کا پھل کھانے کی ممانعت کی گئی تھی۔ اور غیر شعوری کیفیت سے شعور کی منزل حاصل کی۔ چنانچہ اقبال اپنی کتاب

"THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THAUGHT IN ISLAM."

میں لکھتے ہیں:۔

"MANS DID NOT DESCEND UPON HIM AS A CURSE - THE FALL OF MAN DOES NOT MEANS A MORAL DEPRAVITY. IT WAS MEANS TRANSITION FROM SIMPLE CONSCIOUSNESS TO THE FIRST FLASH OF SELF CONSCIOUSNESS. MAN'S FIRST ACT OF DISOBEDIENCE WAS ALSO HIS FIRST ACT OF FREE CHOICE".

فیض صاحب نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان کی تردامنی بھی ایسی ہے کہ دامن نچوڑ دے تو فرشتے وضو کریں۔

اقبال کے ہاں انسان کا تصوّر اسلامی تصوّر سے مستعار ہے۔ انسان کا مسیحی تصور مغربی ادب میں ڈانٹے اور ملٹن سے لے کر ٹی ایس ایلیٹ اور گراہام گرین تک چلا آیا ہے۔

ادب میں انسان کا جو تصور سب سے حاوی رہا ہے اور صدیوں تک سب سے نمایاں تصوّر رہا ہے۔ وہ نامکمل انسان کا تصوّر ہے خواہ یونانی المیوں کے ہیرو ہوں یا شیکسپئر کے ڈراموں کے کردار۔ دستوودسکی ٹامس مان اور کافکا کا انسان ہو۔ یا سارتر کا خود وجودی انسان یہ سب نامکمل انسان کے مختلف روپ ہیں۔ یہ تصور کہ انسان اپنی فطرت میں پیچیدہ ہے اس میں اچھائی برائی۔ بلندی اور پستی کے پہلو ایک ساتھ موجود ہیں۔ ان میں باہم اندرونی کشمکش جاری رہتی ہے۔ انسان کے اندر وہ قوت موجود ہے جس سے وہ اپنی کمزوریوں پر فتح پاکر بلند ہو سکتا ہے۔ اسے اپنی نا تکمیلی کا شعور ہے اور وہ اپنے نامکمل وجود کی تکمیل میں کوشاں رہتا ہے۔

نیکی اور بدی کی قدریں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر مل جاتی ہیں۔ نیکی اور بدی گویا لازم و ملزوم ہیں۔ اور ایک ہی وجود میں قائم رہ سکتی ہیں۔ اس موضوع کو موجودہ دور کے تین بڑے ادیبوں نے پیش کیا ہے۔ اور اس مہم کے لئے انہوں نے فاؤسٹ کا انتخاب کیا ہے۔ جو اس "دو رخے" کردار کے لئے بہت موزوں ہے یوں تو گوئٹے کے فاؤسٹ میں بھی میفسٹوفلس یعنی ابلیس فاؤسٹ کے اندر ہی موجود تھا۔ جسے ایک الگ وجود میں مجسم کیا گیا ہے ٹامس مان نے DR. FANSTNS میں یہی موضوع اور کردار لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ آج متضاد قدریں کس طرح گھل مل گئی ہیں۔ اور آج کے فن کار اور روحانی انسان کی تقدیر کیا ہے؟ خدا اور شیطان ایک ہی جسم میں موجود ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہ فاؤسٹ میں موجود تھے ویلیرے نے MAN FANST میں یہی موضوع لیا ہے۔ ان کے ہاں انسان شیطان سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ ژاں پال سارتر کے ڈرامے "Le Diable et b bon Dien" میں سارتر کا فاؤسٹ یعنی گوئٹز پہلے بدی ہی بدی میں گھرا رہتا ہے۔ پھر بدی سے کنارہ کشی کر کے انسانوں کے لئے نیکی کرنے میں اپنی بقیہ زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ لیکن فاؤسٹ کو اس حقیقت سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کہ "وہ آدمی پیدائشی مجرم ہیں۔ اور مجھے بھی ان کے جرائم میں شریک ہونا چاہیے۔ تاکہ میں ان کی محبت حاصل کرسکوں۔ نیکی اور بدی ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔ میں بُرا ہونا قبول کروں گا۔ تاکہ میں اچھا بن سکوں۔

دستوودسکی کے ہاں جرم و گناہ کیتھارسس کا باعث ہوئے ہیں کہ گناہ کرنے کے بعد انسان آگ میں تپتا ہے اور کندن بن کر نکلتا ہے چنانچہ "جرم و سزا" کے اسکال نیکاف کے درد و کرب اور مجرم ضمیر کی آواز ہی اس کی اصل سزا ہے۔ سائبریا کی قید بھی اس کے اندرونی کرب سے زیادہ اذیت ناک نہیں ہو سکتی۔

اور مابعد جنگ عظیم دوم کے ادب میں سارتر کا خود وجودی انسان اپنے وجود کا آپ خالق ہے اور اپنی تقدیر کا آپ مالک ہے

"Man is what he wills" ہر موڑ پر اس کے آگے دو راستے ہیں۔ جن میں سے ایک راہ کا اسے انتخاب کرنا پڑتا ہے اور اس کا یہ انتخاب بہت اہم ہے اور اس پر اس کی تقدیر یا اس کا فیصلہ ہے۔

"The Flies" میں سارتر کا اورسٹس یونانی المیہ کے اورسٹس کے برخلاف فیوریس سے پیچھا چھڑا کر اپنے آپ کو اور اپنی آئندہ نسل کو جرم و سزا کے اس چکر اور نسل در نسل قتل و خون کی اس لعنت سے آزاد کرا لیتا ہے۔ جس کی جڑ HOUSE OF ATREUS پر لگی تھی۔ وہ ایک آزاد اور خود وجودی انسان ہے جس نے اپنی تقدیر کا نوشتہ بدل ڈالا۔ سارتر کا انسان اپنے اعمال اور افعال کا پوری طرح ذمہ دار ہے۔ خواہ وہ ناؤسٹ ہو یا اورسٹس ALTONA کا قاتل یا CRIME PASSIONAEL کا قیدی اپنے ڈرامے ALTONA میں سارتر نے فرانس کے مجرم ضمیر کو پیش کرنا چاہا تھا کہ الجزائر کے مسلمانوں پر ڈھائے گئے مظالم اور اذیت دہی کی شرمناک اور انسانیت سوز وارداتوں کا فرانس پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر اس کا ضمیر زندہ ہوتا۔ لیکن سارتر اپنے موضوع کو اس صورت میں پیش نہ کر سکے۔ اور انہیں جرمن کرداروں کا سہارا لینا پڑا۔ جنھوں نے دوسری جنگِ عظیم میں روسیوں پر مظالم ڈھائے تھے ALTONA کے قیدی فرانز کو یہ ماننے سے انکار ہے کہ نازیوں کے استبداد کے تحت اس سے جرم سرزد ہوئے ہیں۔ اپنی نظروں میں وہ خود بہت بڑا مجرم ہے۔ بے پناہ اذیت دہی اور انسان قتل و خون کی ذمہ داری خود اس پر عائد ہوتی ہے۔

"میں نے نازیوں کو لاشیں فراہم کی ہیں۔"

"میں خود گوئرنگ ہوں۔ اگر گوئرنگ کو جنگی جرائم کی پاداش میں پھانسی دی گئی۔ تو مجھے بھی پھانسی کی سزا ملنی چاہیئے۔"

فرانز اپنے جرم کی سزا کے طور پر اپنے آپ پر قید کی صعوبتیں عائد کرتا ہے۔ ۱۳[1] سال تک اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند رکھتا ہے۔ لیکن تیرہ سال کی کنارہ کشی، تنہائی اور اسیری بھی اس کے شدید احساس اور ضمیر کی ملامت کو خاموش نہیں کر سکی اور احساسِ جرم کی اذیت ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ تو وہ خودکشی کر لیتا ہے۔

اس کے برخلاف کامیو کا "اجنبی" اپنے جرم کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ کو مجرم نہیں گردانتا ہے اور نہ اسے ندامت ہے کہ ایک انسانی زندگی اس کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔ اس لئے کہ اس کا یہ فعل دانستہ اور ارادی نہیں تھا۔ اس نے دانستہ کبھی کسی کو ضرر اور دکھ نہیں پہنچایا تھا۔ بس یہ کہ وہ ان قدروں سے بالاتر تھا جنہیں ریاکار سماج عائد کرتی ہے۔ بلکہ اسے ان قدروں کا احساس تک نہیں تھا۔ وہ بہت دور اور الگ تھلگ تھا۔ اس دنیا کے لئے ایک مکمل اجنبی۔

"اجنبی میں یہ المیہ ہے کہ نہ اس دور میں صرف قدریں غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ بلکہ انسان محسوس کرنے کی صلاحیت تک کھو بیٹھا ہے۔"

"IT IS A DEVALUATION OF ALL VALNESS' A DWINDLING OF THE FACULTY OF VALUATION ALTOGETHER."

کامیو کا فلسفہ ہے کہ قدروں اور پیمانوں کے بغیر انسانی زندگی مہمل اور بے معنی ہے۔ سسی فس کی صبر آزما مشقت ایک بے کار اور بے نتیجہ چیز ہے۔ ساری حیات دینوی ہی عبث اور لایعنی ہے حتے کہ اس کا انجام موت بھی ایک بے معنی انجام ہے۔ پھر کامیو نے اس سے آگے بغاوت کا فلسفہ پیش کیا ہے۔ کہ انسان کو زندگی اور موت دونوں کے خلاف بغاوت اختیار کرنی چاہیئے۔

کامیو کے اجنبی OUTSIDER کا تصور ساری دنیا میں ایک دور کے ادب پر چھا گیا۔ اور آج تک نئے ادب کا سب سے نمایاں تصور رہا۔ کیونکہ وقت کے مزاج نے "اجنبی" میں اپنا عکس

---

1 ERIC KAHLER: THE TOWRD AND THE KOYSS

دیکھا تھا۔

اب ہم اس دور کی طرف آتے ہیں، جب ہمارے ہاں بھی نئے ادب کی تحریک کا آغاز ہوا۔ یعنی ۳۶ سے ۴۷ تک کا دور۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں انسان کا تصوّر سادہ رہا ہے۔ یہاں پر فی الحال میں فکشن ہی کی بات کر رہا ہوں۔ چنانچہ پریم چند کے افسانوں اور ناولوں کو لے لیجئے۔ ان میں انسان نیک ہیں تو بہت ہی نیک ہیں۔ بُرے ہیں تو بہت ہی بُرے۔ عام طور پر غریب کردار اور گاؤں کے کردار بہت ہی معصوم اور بھولے بھالے ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ترقی پسند تحریک کے ساتھ سیاسی انسان اور فطری انسان کے تصوّر حاوی ہو گئے۔ چنانچہ اس دور کے ادیبوں میں مثال کے طور پر کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی کے ہاں انسان کا سیاسی تصوّر ہے کہ انسان اپنی فطرت میں معصوم ہے۔ اس کی شخصیت اور عمل کا دار و مدار سماجی اور سیاسی نظام پر ہوتا ہے۔ اگر نظام بدل دیا جائے تو انسان بھی بدل سکتا ہے نئے انسان کی پیدائش پر ان ادیبوں کا ایمان اور یقین تھا۔

بیدی، احمد علی، محمد حسن عسکری، حیات اللہ انصاری وغیرہ نے اس دور میں اپنے افسانوں میں بھی نامکمل انسان کو پیش کیا۔ اور منٹو کے ہاں انسان کے تصوّر میں ایک نمایاں ارتقا پایا جاتا تھا منٹو کا انسان پہلے فطری انسان تھا۔ فطری انسان جو ہر قسم کی سماجی اور اخلاقی بندشوں سے آزاد ہو کر فطری جبلتوں کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ ڈی ایچ لارنس کو اس تصور سے سب سے نمایاں ادیب کہا جاتا ہے۔ لیکن میں عسکری صاحب سے اس بات پر متفق ہوں کہ لارنس کو محض اس تصوّر کی چار دیواری میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے تو انسان کے متعلق بہت کچھ کہا ہے ان محدود معنوں میں فطری انسان کی مثال ہنگرے کے ہاں ملتی ہے۔ منٹو کے ہاں پہلے دور میں یعنی تقسیم ہند سے پہلے جو خالص فطری انسان کا تصور ہنگوے کے انسان سے مشابہ تھا۔ جو اپنی جبلتوں پر آزادی سے عمل کرنے کا خواہاں تھا اور سماجی قید و بند کا پابند نہ رہنا چاہتا تھا۔ لیکن سماج کی مروجہ اقدار اور اخلاقی بندشیں، فطری جبلتوں اور خواہشوں کے آگے روک لگا دیتی ہیں اور فطری انسان گھٹن اور کجروی کا شکار ہو جاتا ہے۔ منٹو کا شکست خوردہ فرسٹریٹڈ، فطری انسان گناہ اور گندگی میں گھرا نظر آتا ہے۔ منٹو کے بیشتر کردار طوائفیں، ان کا گاہک، دلالے عیاش مرد اور بدکار عورتیں ہیں۔ جو موجودہ سماج کی گناہ آلود زندگی کے گھیرے میں ہے۔ فطری جبلتوں کو جب بندشوں کے ذریعے روکا جاتا ہے اور وہ ان بندشوں کو توڑ کر باہر نکل آتی ہیں تو جنسی زندگی میں انتشار اور بے راہ روی ہی پیدا ہو سکتی ہے منٹو نے اس زندگی کو اور ان کرداروں کو مکمل معروضیت، جرأت اور بے رحم صداقت کے ساتھ پیش کیا تھا۔

"بو" کے اندھیر کے افعال کی اچھائی اور برائی سے منٹو کو کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن "ننگی آوازیں" "ٹھنڈا گوشت" اور "بابو گوپی ناتھ" میں وہ اچھے بُرے کی تمیز کرتا ہے یہاں منٹو کا اخلاقی نظریۂ حیات کردار کے تجزیے اور تعمیر میں مضمر ہے۔

"بابو گوپی ناتھ وہ اہم موڑ ہے جہاں سے منٹو کے انسان کا تصوّر بدلا ہے۔ اب وہ فطری انسان نہیں، نامکمل انسان ہے جو بیک وقت اچھائیوں اور برائیوں، پستیوں اور بلندیوں کا مجموعہ ہے۔ بابو گوپی ناتھ میں منٹو نے ایک مکمل اور بھرپور کردار پیش کیا ہے۔ بابو گوپی ناتھ مروجہ اخلاقی قدروں کی رو سے چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ عیاش اور رِندِ خانہ خراب لیکن اس بدی کے خول میں ایک نیک باطن ہے۔ اس کی روح پاکیزہ اور اس کا دل بڑا ہے، اس کے پاس خلوص ہمدردی، فیاضی اور دوستی کا بے پناہ جذبہ ہے۔ "بابو گوپی ناتھ" میں ایک مکمل اور بھرپور کردار کے ساتھ ایک بڑے تجربے اور تکمیل کا احساس پایا جاتا ہے

اسی طرح منٹو نے "ممی گندگی" اور "سلطانہ" کے بعد جو خالص فطری عورتیں ہیں۔ طوائف کا روپ وہ پیش کیا ہے جس میں "ماں" بھی پوشیدہ ہے۔ حتیٰ کہ "سڑک کے کنارے" میں ایک عورت اور ماں کی زخمی روح ہے۔ اس افسانے میں جنس کا تصوّر وجود

کی تکمیل اور روحوں کے ملاپ سے وابستہ کیا گیا ہے اور یہاں پر بنیادی گناہ کا گہرا تصوّر ہے۔

ایشر سنگھ کے سے قاتل اور شہوانی حیوان کی جب سوئی ہوئی انسانیت جاگ اٹھتی ہے۔ تو وہ ایک نامعلوم کرب و اضطراب میں ڈوب جاتا ہے۔ مرتے ہوئے وہ اپنی کرپان کی طرف دیکھ کر کہتا ہے: "میں چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں اس کرپان سے۔" اس سادے جملے میں بلا کی پشیمانی اور انفعالیت ہے۔ ان سادہ لیکن فلسفانہ جملوں میں ایشر سنگھ کے مضطرب اور اس کے اندر زندگی اور انسان سے متعلق بے پایاں تحیر اور استعجاب پیدا ہوتا ہے۔ دل و دماغ کی کرب انگیز کیفیت جھلکیاں لیتی ہے۔ فسادات کے دوران میں دو بنیادی جذبے یعنی جنس اور قتل و خون اتنی وحشیانہ اختیار کر گئے تھے کہ انسان، حیوان بلکہ درندہ بن گیا تھا۔ لیکن منٹو کا انسان پر اعتماد اتنا قوی تھا کہ اس وقت بھی اسے انسان سے مایوسی نہیں ہوئی۔ منٹو نے بار بار اس کا یقین دلایا ہے کہ انسان حیوان بن کر بھی اپنی انسانیت کھو نہیں سکتا۔ اس کی انسانیت بڑی سخت جان ہے۔

ایشر سنگھ میں اندرونی کشمکش ایک غیر شعوری بے چینی اور اضطراب کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ بالکل نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے اندر یہ بے چینی یہ کرب و اضطراب کیوں پیدا ہو گیا ہے دوسری طرف منٹو کے ہاں باسط ہے۔ باسط جو قدم قدم پر اپنے فطری ہیجانی جذبات پر قابو پاتا چلا گیا ہے۔ اور نازک سے نازک موقعوں پر بھی انتہائی صبر و تحمل اور ضبطِ نفس سے کام لیتا ہے باسط اور "اس منجدھار میں" امجد ایسے کردار ہیں جو اپنی ذات کو، اپنے وجود کو دوسروں پر قربان کرتے ہیں۔ باسط کا ایثار غیر معمولی ہے اور امجد اپنی بیوی کی تجدید حیات کے لئے اپنے منفی وجود کو فنا کر دیتا ہے۔ یہ سمجھنے سوچنے والے حساس کردار ہیں۔ جن کی اندرونی کشمکش شعوری ہے۔

پاکستان کے بعد کے افسانوں میں بھی سماجی انسان حاوی ہے۔ چنانچہ قدرت اللہ شہاب کے "یاخدا" کی دلشاد پر جو کچھ گزری ہے اس کا ذمہ دار سماج ہے۔ لیکن قرۃ العین حیدر کی سیتا ہرن اور ہاجرہ مسرور کی تیسری منزل کی پیرڈسن کا المیہ ان کے کرداروں میں مضمر ہے:

ہمارے ہاں انتظار حسین نئے ادب کے ایک نمائندہ افسانہ نگار اور دقیع فن کار ہیں۔ انہوں نے اپنے مجموعے "آخری آدمی" میں ماضی کے استعارے سے "پرانی داستانوں" انجیلی حکایات اور قرآنی تلمیحات کے ذریعے موجودہ دور کے انسان کا اخلاقی اور روحانی زوال دکھایا ہے۔ انہیں فرد کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کے اخلاقی زوال کا بھی غم ہے۔

"سید صاحب ایک بات پوچھوں، دلی کی جامع مسجد کو تو ہندوؤں نے آگ لگائی۔ پر داتا صاحب کے مینار کس نے گرائے؟

فرد کا وجود پورے قومی وجود کا ایک حصہ ہے اور قومی وجود انسانیت کا، فرد اور قوم ہی نہیں، پوری انسانیت میں روحا[...] انحطاط جاری و ساری ہے۔ طمع، حرص و ہوس، مادیت نفس کا غلبہ، ظالم سے خوف زدہ ہو کر خود میں سمٹ جانا، اور حق کی شہادت سے منکر ہو جانا، ان سب باتوں سے انسان اپنی انسان[...] سطح سے نیچے گر جاتا ہے۔ اور حیوان کی سطح پر اتر آتا ہے۔۔۔۔ قرآن حکیم میں آیا ہے۔

انتظار حسین کے افسانوں میں زرد کتا، بندر، مکھی، بکر[...] کی ٹانگیں، روحانی انحطاط اور اخلاق زوال کی مجسم علامتیں ہیں جو سب انسانوں میں موجود ہیں اور انسانی صلاحیتوں کے کر[...] ہونے پر حاوی ہونے لگتی ہیں۔

پس ایسا ہوا کہ اس نے دانش و فہم کا جامہ اتار دیا، وہ پنی[...] کی طرف جھکا اور ہوائے نفس کی پیروی کی تو اس کی مثال ک[...] کی سی ہو گئی۔ جو انسان عقل، غور و فکر سے کام نہیں لیتے قرآن انہیں کالانعام، یعنی حیوانات کی مانند بلکہ ان سے بھی گئے گزر[...] قرار دیتا ہے۔

"وہ عقل و حواس کا استعمال کھو کر چارپایوں کی طرح ہو گ[...]

کہ اس سے بھی گئے گزرے" (سورہ اعراف)

یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بدتر حیوان وہ انسان ہیں
جو بہرے گونگے ہو گئے جو کچھ سمجھتے نہیں ہیں۔" (سورۂ الانفال)

انتظار حسین کا آخری آدمی الیاسف آخر تک اپنی
آدمیت برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن بے سود، ایک
ایک کر کے اس کی ساری انسانی صلاحیتیں اور قوتیں سلب ہو جاتی
ہیں اور وہ ایک بندر، ایک چوپایہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

مغرب کے مشہور نئے ادیب IONESCO کے ڈرامے
RHINOCERUOS میں سارے انسان ایک ایک کر کے
RHINOCERUS میں تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ حتے کہ منطقی
انسان بھی اپنا روپ بدل لیتا ہے۔ لیکن IONESCO کا
آخری آدمی جو باقی رہ جاتا ہے یہ محسوس کرتا ہے کہ
RHINOCERUS ہی اصل حقیقت ہیں، اصل قوت ہیں
اور اس کا اپنا انسانی وجود نہایت غیر اہم اور غیر حقیقی ہے۔

خواہ IONESCO کا RHINOCERUS ہو یا انتظار
حسین کا آخری آدمی آج کے ادب میں انسان کا ایک نمایاں
تصور DEHUMANISED انسان کا ہے۔

اپنی فہم، دانش، بصیرت اور دور نگاہی سے بڑے ادیب
ایسی ازلی اور بنیادی حقیقت پیش کر گئے ہیں۔ جس سے ان
کی تحریروں میں نہ صرف روحِ عصر اور اپنے عہد کا تجربہ ہے۔ بلکہ
آنے والے دور کی تصویر بھی جھلکتی ہے۔ چنانچہ T.S.ELIOT کی
"WASTELAND" ہماری اپنی دنیا ہے۔ اور
W.S YEATS نے اپنے زمانے کی جو تصویر بنائی ہے موجودہ
دور کی اس سے بہتر اور حقیقی تصویر کیا ہو سکتی ہے۔؟

اپنی نظم "SECOND COMING" میں "YEATS"
نے کہا ہے۔

THINGS FALL APART THE CENTRE
CANNOT HOLD.
MERE ANARCHY IS LOOSED UPON
THE WORLD.
THE BLOOD DIMMED TIDE IS LOOSED
AND EVERYWHERE THE CEREMONY
OF INNOCENCE IS DROWNED
THE BEST LACK ALL CONVICTION
THE WORST ARE FULL OF PASSIONATE
INTENSITY

(W.B YEATS IN SECOND COMING)

رفتارِ زمانہ کی یہ تصویر بنانے کے بعد YEATS پوچھتے ہیں

WHAT BEAST IS IT THAT LIES
CROUCHING TO BE REBORN?

یعنی زمانے کو ایک مسیحا کی آمد ثانی کا انتظار ہے جس
کی حکومت میں امن و سکون، نیکی اور سلامتی کا دور دورہ ہو
کہیں ایسا تو نہیں ہوگا۔ کہ بجائے مسیحا کے کوئی درندہ دبکا بیٹھا
ہو اور جو نمودار ہو کر سارے زمانے پر چھا جائے؟

منٹو - ایک اخلاقی فنکار

آج منٹو کی پندرھویں برسی ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دس پندرہ سال بلکہ ربع صدی بھی ادب کی تاریخ میں ایسا کوئی طویل عرصہ نہیں کہ کسی ادیب کا صحیح مقام متعین کیا جا سکے۔ تاہم دُنیائے ادب میں مختصر افسانہ بجائے خود ایک کم سن اور محدود صنف ہے اور جدید اردو افسانے کی عمر اور بھی مختصر ہے۔ لہٰذا جدید افسانے کے دوبارہ جائزے یعنی (RE - EVALUATION) میں ایک افسانہ نگار کا مقام جانچنے میں فی الحال ایک طویل وقتی فاصلہ اور وسیع تناظر کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

منٹو کی تحریریں آج دوبارہ پڑھی جائیں۔ میں نے حال ہی میں منٹو کی تحریریں دوبارہ پڑھی ہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے اچھے افسانوں کا ذہنی تاثر برقرار ہے۔ منٹو کے افسانوں میں کوئی ابہام نہیں نہ کوئی پوشیدہ امزا ایسے ہیں، نہ کوئی پیچیدہ گتھیاں کہ ان کے سلجھانے میں دقت محسوس ہو۔ وقت کے ساتھ ساتھ نئی تشریحیں اور تفسیریں ہوں اور تہ در تہ معانی نکالے جائیں یہ صاف ستھری سیدھی اور براہ راست نوعیت کی تحریریں ہیں جن کا پیغام واضح ہے ان تحریروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اردو کے صفِ اوّل کے چند گنے چنے افسانہ نگاروں میں منٹو کو جو اہم مقام حاصل تھا، آج بھی منٹو کا وہی مقام ہے۔

منٹو ایک سچا، دیانت دار، فطری فن کار تھا۔ اس نے جو کچھ لکھا بھرپور خلوص اور ایمانداری سے لکھا۔ منٹو میں اظہار کی مسلسل تڑپ تھی، ایک شدید اندرونی لگن، ایک آگ جس میں وہ ہمیشہ تپتا رہتا تھا۔ جو فن کار کی بقا کے لئے بے حد ضروری ہے۔

عسکری صاحب کے الفاظ میں منٹو اپنے آپ تو مجسم تخلیق بن گیا تھا۔ لیکن دوسروں کو بھی اپنی تخلیقی کشمکش اور تخلیقی کرب میں حصہ دار بنانا چاہتا تھا۔ اور یہ مسلسل اذیت منٹو کے سوا اور کس کے اعصاب برداشت کر سکتے تھے؟ انسان کی روح یا فن کار کی تخلیقی کاوش جب بالکل عریاں ہو جائے تو اس کا اثر بوز درم والا ہوتا ہے معاشرے کی بدی، بدصورتی اور گندگی کو اس نے بہت قریب سے دیکھا اور زندگی کے زہراب کو اس طرح چکھا کہ اس کی تلخی کام و دہن سے گذر کر رگ و پے میں اتر گئی۔ زندگی کے مشاہدے اور تجربے میں منٹو نے اپنے آپ کو موم کی شمع کی طرح پگھلایا اور زندگی کے ایسے پہلوؤں کو پوری جرأت بے باکی اور بے رحم صداقت کے ساتھ پیش کیا جنھیں چھونے کی ہمارے ہاں بہت کم ادیبوں کو جرأت ہو سکتی تھی

منٹو کی ادبی زندگی کا آغاز سنہ ۳۶ء کی نئے ادب کی تحریک سے ہوا تھا۔ نئے ادب کی یہ تحریک ایک باغی تحریک تھی، انحراف (Protest) جس کی بنیاد تھی۔ سامراجی حکومت کیخلاف، مروجہ معاشرتی نظام کے خلاف ادب کی رومانی روایت کے خلاف اظہار کے نئے اسلوب واقعیت نگاری اور معاشرتی حقیقت نگاری کے نئے رجحان یہ سب اس میں شامل تھے۔ منٹو اس تحریک کا غالباً سب سے باغی ادیب تھا منٹو کی بغاوت اس سماج کے خلاف تھی، جس کی عائد کردہ پابندیاں اور موجودہ تہذیب کا ملمع اور تصنع، فطری، صحت مند نشو و نما کو روکتے ہیں۔ آزادی کو سلب کر لیتے ہیں اور جنسی گمراہیوں اور بے راہ رویوں کا باعث بنتے ہیں۔ باغی منٹو نے اس موضوع کا انتخاب کیا جو سماج کی نظر (Taboo) تھا سب سے زیادہ ممنوع تھا۔ یعنی جنس کا موضوع۔

جنس کے موضوع کی صدیوں کے ادب میں خاص اہمیت رہی ہے۔ عورت اور مرد کا رشتہ ایک ازلی اور ابدی رشتہ ہے

آدم و حوا کے بنیادی گناہ اور بہشت گم گشتہ سے لے کر آج تک بھی ہر معاشرے میں، جنس کا مسئلہ ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ الہامی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے جن میں جنس کے رشتہ کو شرمناک نہیں بلکہ مقدس بتایا گیا ہے کہ اس سے بات کی تجدید ہوتی ہے۔ پرانے عہدوں میں مثلاً قدیم یونانیوں، مصریوں کے ہاں جنس اتنی زبردست قوت سمجھی جاتی تھی کہ یا تو اسے آسمانی الوہی درجہ دیا جاتا تھا یا شیطان کا۔ یہ کوئی عالم بالا کی قوت تھی یا اندرونی شیطانی قوت کہ انسانوں۔ مردوں اور عورتوں کو اپنے غلبہ سے بے بس کر دیتی تھی۔ لہٰذا صدیوں کے ادب میں اس موضوع کو خاصی اہمیت دی جاتی رہی البتہ موجودہ زمانے کے ادیب ایسے دیویوں دیوتاؤں بڑے قد آور ہیروؤں اور ہیروئنوں سے نیچے اتار کر عام مردوں اور عورتوں کے رشتہ کی سطح پر لے آئے ہیں۔

"جو سمجھتے ہیں کہ نئے ادب نے جنسی مسائل پیدا کئے ہیں غلطی پر ہیں کیونکہ جنسی مسائل نے اس نئے ادب کو پیدا کیا ہے۔" منٹو نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہ وہ جنس کے موضوع پر کیوں لکھتا ہے اپنے مضامین میں کہا۔ عورت اور مرد کا یہ رشتہ بہت پرانا ہے ازلی اور ابدی، جو اس کے خط عریانی سمجھتے ہیں انہیں اپنے احساس کے ننگ پر افسوس ہونا چاہیئے۔ اعتراض کیا جاتا ہے کہ نئے لکھنے والوں نے عورت اور مرد کے جنسی تعلقات ہی کو اپنا موضوع بنا لیا ہے۔ اپنے متعلق میں اتنا کہوں گا کہ موضوع مجھے پسند ہے کیوں ہے، بس سمجھ لیجئے کہ مجھ میں Perversion ہے زمانے کے جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیئے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں یہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔"

چکّی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں بن سکتی میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی ڈراؤنا خواب دیکھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دینے آ رہا ہے۔ اس کے بھاری بھاری پپوٹے جن میں برسوں کی اچٹی ہوئی نیندیں منجمد ہیں۔ میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اس کی غلاظت اس کی بیماریاں، اس کا چڑچڑاپن، اس کی گالیاں یہ سب مجھے بھاتی ہیں۔ میں ان کے متعلق لکھتا ہوں۔"

اور یوں منٹو کے ادب کی دنیا ان "گرے ہوئے" کرداروں سے آباد ہو گئی۔ طوائفیں، ان کے گاہک اور دلال، فلمی دنیا کے عیاش کردار، عیاش مرد اور بدکار عورتیں اور ان سے آباد ان کی پناہ گاہ، شہر بمبئی، جو منٹو کا محبوب اور مرغوب شہر تھا۔ بابل اور ایفیس اور لارنس ڈرل کے اسکندریہ کی مانند ایک شہرِ گناہ۔

منٹو نے بدی کی دنیا تخلیق کی، کیونکہ وہ ایک اخلاقی فن کار تھا اور منٹو کے فن کا کمال یہ تھا کہ اس شہر کے لئے اور ان گرے ہوئے کرداروں کے لئے منٹو نے ہمارے دل میں محبت اور ہمدردی پیدا کی۔ پہلے ان کے بارے میں منٹو کا رویہ معروضی تھا وہ بغیر کوئی نتیجہ اخذ کئے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھ کر، پوری واقعیّت کے ساتھ کسی کردار اور واقعہ کو پیش کرتا تھا۔ چنانچہ افسانہ "بو" میں جو منٹو کے بہترین افسانوں میں سے ایک فطری صحت مند مکمل جنسی ملاپ کی نہایت اچھی تصویر کشی ہے۔ بلکہ اس پرکشش بو کا جس طرح احساس دلایا ہے اس کا جواب نہیں ملتا۔ لیکن یہاں منٹو کو اندھیر یا اس لڑکی کی اچھائی برائی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ پھر منٹو کی نگاہ میں اپنے کرداروں کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی سماج سے ان کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ان کی اندرونی روحانی کشمکش کو اس نے محسوس کیا یہ اندرونی کشمکش جو بہت شدید اور ڈراؤنی نہیں تھی کہ منٹو کردار قد آور اور بلند نہیں ہیں، بلکہ ایک نامعلوم سی بے چینی وہ اپنے اندر محسوس کرتے ہیں ایک روحانی کرب و اضطراب جسے "ٹھنڈا گوشت" کے ایشر سنگھ کی طرح وہ خود سمجھ نہیں پاتے۔ منٹو کوئی Didactic تبلیغ کرنے والا ادیب نہیں تھا لیکن ننگی آوازیں

"ٹھنڈا گوشت" "کھول دو" اور "بابو گوپی ناتھ" جیسے افسانوں میں منٹو کا اخلاقی نظریہ حیات کرداروں اور واقعات کے تجزیے اور تعمیر میں مضمر ہے۔ یہ منٹو کے فن کا ارتقا تھا۔

منٹو درحقیقت ایک اخلاقی فن کار تھا۔

منٹو پر فحش نگاری کے الزامات عائد کئے گئے۔ مقدمات چلائے گئے۔ مجرم گردانا گیا۔ جرمانے ہوئے، قید و مشقت کی سزا بھی سنائی گئی حالانکہ منٹو کی تحریریں "فحاشی" کے تحت نہیں آتیں۔ ہمارے ہاں جنس نگار ادیبوں میں منٹو کی تحریریں سب سے زیادہ صاف ستھری ہیں۔ چنانچہ منٹو کی واضح اور کھلی تحریروں اور براہ راست انداز بیان میں عصمت چغتائی کی پردے کے پیچھے والی ڈھکی چھپی اکساہٹ اور لذیّت نہیں ہے۔ عصمت کی تحریروں میں Tillilation کی کیفیت ہے یعنی جنسی چھیڑ چھاڑ اور گدگداہٹ اور عزیز احمد نے اپنے ناولوں "گریز" "ہوس" "ایسی بلندی، ایسی پستی" اور افسانوں میں جنسی تجربات کو جس تلذذ سے بیان کیا ہے اس سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔ منٹو کی کوئی تحریر ایسی نہیں ہے جس میں برائی اور بدکاری کو خوبی کی حیثیت سے دکھایا گیا ہو۔ منٹو کے افسانے اپنے کرداروں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ترغیب نہیں دیتے۔ نہ معقول آدمیوں کے دل و دماغ میں ہیجان پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔

منٹو کے افسانوں میں جنسی موضوعات کے باوجود لذیّت اور ترغیب کا عنصر بہت کم ہے۔ جنسی بدعنوانیوں کے افسانے پڑھ کر منٹو کے قاری کا ردِّ عمل وہی ہوتا ہے جو افسانہ "کھول دو" کے ڈاکٹر کا ردِ عمل ہے یعنی اس کی جبیں عرق آلود ہو جاتی ہے اور عرقِ انفعال کے یہ قطرے موتی کے مانند قیمتی ہوتے ہیں۔

منٹو یقیناً "فحش نگار" نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس ایک اخلاقی فن کار تھا۔ محمد حسن عسکری منٹو کو ذاتی طور پر بھی قریب سے جانتے ہیں۔ لہٰذا ان کی یہ رائے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ منٹو نے ہمیشہ ایک شریف آدمی بننا چاہا ہے۔ ذاتی زندگی میں شرافت کے روایتی معیاروں کا جتنا پاس منٹو کو ہے اتنا کم لوگوں کو ہو گا لیکن اسے کچھ ایسے حالات سے بھی دوچار ہونا پڑا جو اس کے اندرونی معیار پر پورے نہیں اترتے اور ان تجربات سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ ان تجربات کا ہر وقت جائزہ لینے اور آدرش اور حقیقت کے تضاد کا مطالعہ کرنے پر مجبور رہے۔ بنیادی طور پر منٹو کا مزاج اخلاق پرستی میں بڑا کٹر واقع ہوا ہے۔ لہٰذا وہ کسی اخلاقی فیصلے سے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ اپنی تفتیش جاری رکھتا ہے اور یہ اظہار کی جدوجہد اور فنی کاوش بن جاتی ہے۔ منٹو نے انفرادی تجربوں میں انسانی معنویت تلاش کی ہے۔

یہ ناموزوں نہ ہو گا۔ اگر میں یہ مضمون آندرے موروا کے ان الفاظ پر ختم کروں جو منٹو پر صادق آتے ہیں۔

"TRUE MORALIST ALWAYS DEPICT AN IMMORAL WORLD BECAUSE HE PUTS US ON OUR GUARD AGAINST THE WORLD AS IT IS. THE MORALIST ALWAYS FRIGHTENS BECAUSE HE IS TRUE AND TRUTH IS FRIGHTENING TO MAN."

[illegible] جب وہ ہوش میں آئی اور اسے معلوم ہوا کہ اس کا خاوند دریا کی موجوں کی نذر ہو گیا ہے تو اس نے پھر دریا میں کود پڑنے کی کوشش کی۔ مجھے وہیں جانے دو جہاں میرے سرتاج گئے ہیں۔ ایک دلیر نوجوان طالب علم سرفراز جس نے اسے بچایا تھا اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بے شمار زندگیوں کو بچانے کی کوشش کی تھی اسے اپنی گرفت میں رکھا اور اسے دوبارہ دریا میں گرنے سے بچا لیا۔ لیکن اس کی تشفی نہیں ہوئی تھی اور چٹانوں اور پہاڑوں میں اس کی "تم کہاں ہو، تم کہاں ہو" کی چیخوں کی بازگشت سنائی دیتی تھی تو حسین وادیٔ سوات کی یادیں میرے ذہن میں ہمیشہ اس خوفناک لمحے سے وابستہ رہیں گی۔

ترجمہ:۔ سعید الابرار

"ٹھنڈا گوشت" "کھول دو" اور "بابو گوپی ناتھ" جیسے افسانوں میں منٹو کا اخلاقی نظریۂ حیات کرداروں اور واقعات کے تجزیے اور تعبیر میں مضمر ہے۔ یہ منٹو کے فن کا ارتقا تھا۔

منٹو درحقیقت ایک اخلاقی فن کار تھا۔

منٹو پر فحش نگاری کے الزامات عائد کئے گئے۔ مقدمات چلائے گئے۔ مجرم گردانا گیا، جرمانے ہوئے، قید و مشقت کی سزا بھی سنائی گئی حالانکہ منٹو کی تحریریں "فحاشی" کے تحت نہیں آتیں۔ ہمارے ہاں جنس نگار ادیبوں میں منٹو کی تحریریں سب سے زیادہ صاف ستھری ہیں۔ چنانچہ منٹو کی واضح اور کھلی تحریروں اور براہ راست اندازِ بیان میں عصمت چغتائی کی پردے کے پیچھے دبی ڈھکی چھپی اکساہٹ اور لذّیت نہیں ہے۔ عصمت کی تحریروں میں Titillation کی کیفیت ہے یعنی جنسی چھیڑ چھاڑ اور گدگداہٹ اور عزیز احمد نے اپنے ناولوں "گریز" "ہوس"۔ "ایسی بلندی، ایسی پستی") اور افسانوں میں جنسی تجربات کو جس تلذذ سے بیان کیا ہے اس سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔ منٹو کی کوئی تحریر ایسی نہیں ہے جس میں برائی اور بدکاری کو خوبی کی حیثیت سے دکھایا گیا ہو۔ منٹو کے افسانے اپنے کرداروں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ترغیب نہیں دیتے۔ نہ معقول آدمیوں کے دل و دماغ میں ہیجان پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔

منٹو کے افسانوں میں جنسی موضوعات کے باوجود لذّیت اور ترغیب کا عنصر بہت کم ہے۔ جنسی بدعنوانیوں کے افسانے پڑھ کر منٹو کے قاری کا ردِّعمل وہی ہوتا ہے جو افسانہ "کھول دو" کے ڈاکٹر کا ردِعمل ہے یعنی اس کی جبیں عرق آلود ہو جاتی ہے اور عرقِ انفعال کے یہ قطرے موتی کے مانند قیمتی ہوتے ہیں۔

منٹو یقیناً فحش نگار نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس ایک اخلاقی فن کار تھا۔ محمد حسن عسکری منٹو کو ذاتی طور پر بھی قریب سے جانتے ہیں۔ لہٰذا ان کی یہ رائے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ منٹو نے ہمیشہ ایک شریف آدمی بننا چاہا ہے۔ ذاتی زندگی میں شرافت کے روایتی معیاروں کا جتنا پاس منٹو کو ہے اتنا کم لوگوں کو ہوگا لیکن

اسے کچھ ایسے حالات سے بھی دوچار ہونا پڑا جو اس کے انفرادی

بقیہ: خطوط

دریا میں لاشیں تیس سے چالیس میل تک بہہ گئیں۔ بہت کم لوگ زندہ بچے اور سو سے زائد مر گئے۔ مرنے والوں میں بیس نوجوان سائنس کے طلباء بھی تھے جو ملتان کالج سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک پیارا نوجوان جوڑا بھی تھا جن کی صرف دو ہفتے قبل شادی ہوئی تھی یہ اس خوبصورت وادی میں ہنی مون منانے آئے تھے۔ دلہن غزالہ کسی طرح بچا لی گئی وہ غضبناک دریا سے کھینچ کر نکالی گئی اور ایک محفوظ ٹیلے پر پہنچا دی گئی جب وہ ہوش میں آئی اور اسے معلوم ہوا کہ اس کا خاوند دریا کی موجوں کی نذر ہو گیا ہے تو اس نے پھر دریا میں کود پڑنے کی کوشش کی۔ مجھے وہیں جانے دو جہاں میرے سرتاج گئے ہیں۔ ایک دلیر نوجوان طالب علم سرفراز جس نے اسے بچایا تھا اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بے شمار زندگیوں کو بچانے کی کوشش کی تھی اسے اپنی گرفت میں رکھا اور اسے دوبارہ دریا میں گرنے سے بچا لیا۔ لیکن اس کی تشفی نہیں ہوئی تھی اور چٹانوں اور پہاڑوں میں اس کی "تم کہاں ہو، تم کہاں ہو"۔ کی چیخوں کی بازگشت سنائی دیتی تھی تو حسین وادیٔ سوات کی یادیں میرے ذہن میں ہمیشہ اس خوفناک المیے سے وابستہ رہیں گی۔

ترجمہ:۔ سعید الابرار

ظلمتِ نیمروز کا دیباچہ

پاکستان رائٹرز گلڈ نے جب کتابوں کی اشاعت کا پروگرام بنایا تھا تو اس وقت اس ادارے نے سن ۱۹۴۷ء کے فسادات پر لکھے گئے افسانوں کا ایک مجموعہ "ظلمتِ نیمروز" کے نام سے ممتاز شیریں سے مرتب کروایا تھا جو بعد میں کسی وجہ سے زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ اس انتخاب کا دیباچہ ہمیں مرحومہ کے مسودات میں سے ملا ہے۔ جو فسادات پر لکھے گئے افسانوں کے بارے میں بصیرت افروز محاکمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے پہلی بار فنون کے موجودہ شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (ایڈیٹر)

۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان میں آزادی کی صبح طلوع ہوئی لیکن آزادی کی صبح افق کی سرخی خون آلود تھی!

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

یہ فیض کی آواز تھی اور اسی آواز کی بازگشت ہندوستان سے بھی آئی۔

شہیدوں کا خون اس حسینہ کے چہرے کا غازہ نہیں ہے
جسے تم اٹھائے لئے جا رہے ہو یہ شب کا جنازہ نہیں ہے

—— اختر الایمان

فسادات کے ریلے نے آزادی کو یوں خون آشام بنا دیا کہ شادمانی کے نغمے یک لخت موت کے نوحوں میں بدل گئے۔ فسادات نے انسانی زندگی کو اور انسانی قدروں کو تہ و بالا کر ڈالا ہندوستان اور پاکستان دونوں ملک اس خونیں حادثہ سے دوچار ہوئے لیکن پاکستان کے لئے یہ حادثہ زیادہ ہولناک تھا کیونکہ اس نئی مملکت کو زندگی کے آغاز ہی میں ایسی کاری ضرب لگی کہ اس حادثہ کا اثر ہماری سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی پر عرصہ تک رہا اور رہے گا۔

فسادات کے پیچھے ایک وسیع سیاسی تاریخ اور معاشرتی پس منظر ہے اتنے بڑے اجتماعی تجربہ کا ہمارے ادب میں عکس پذیر ہونا ناگزیر تھا۔ یہاں یہ بحث نہیں کہ فسادات بذات خود ادب کا موضوع بن سکتے ہیں کہ نہیں اور نہ ہیں یہ سوال اٹھا رہی ہوں کہ فسادات پر لکھنے والے ادیب کی حیثیت سے لکھ رہے تھے۔ یا شہری کی حیثیت سے فسادات کے ہنگاموں کو اگر محض خارجی حادثات بہیمیت اور بربریت کے انسانیت سوز مظاہروں اور خونریزی کے واقعات کے محدود معنوں میں لیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس موضوع پر اچھے ادب کی تخلیق ممکن نہیں لیکن فسادات کو ایک اجتماعی افتاد، کی حیثیت سے دیکھا جائے اور انہیں پورے وسیع تناظر میں پیش کیا جائے تو پھر ادبی تخلیق بھی ممکن ہے جنگ، خانہ جنگی اور فرانس کی تحریک حریت جیسے موضوعات پر بڑا ادب نہ سہی اچھا ادب پیدا ہو سکتا ہے تو فسادات بھی ادب کا موضوع بن سکتے

ہیں ۔ ان تحریروں کو نظر انداز کر دیا جائے جو محض پروپیگنڈے اور ایک غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈے کی حیثیت رکھتی تھیں تو ایسی کئی تحریریں موضوع پر نکل آئیں گی جن کی اثر آفرینی آج بھی برقرار ہے۔

میں نے یہ مجموعہ مرتب کرتے ہوئے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ اس میں نسبتاً پائیدار چیزیں شامل ہوں جن میں فسادات ایک وسیع تر پس منظر میں، اجتماعی افتاد کی حیثیت سے پیش ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان تحریروں میں جن میں اسی حادثہ کے متنوع پہلو ہیں۔ ایک اجتماعی تجربہ سمٹ آیا ہے۔

محمد حسین عسکری صاحب نے یہ مثال پیش کی ہے کہ عہد نامۂ عتیق کے بعض حصے بڑے ادب کا درجہ حاصل کر گئے ہیں اس لئے کہ ان میں محض قومی حادثات اور ایک پوری قوم کے جسمانی مصائب ہی پیش نہیں ہوتے یہودی قوم کے سینکڑوں افراد کے قتل و غارت، عورتوں کی بے حرمتی اور یہودی قوم کی جلاوطنی کا رونا ہی نہیں رویا گیا۔ بلکہ جو چیز انہیں ادب بناتی ہے وہ یہودیوں کا پیچیدہ روحانی تجربہ ہے یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ ان کی قوم خدا کی محبوب قوم ہے لیکن یہی قوم دشمنوں کے ہاتھوں ایک قیامت سے گذاری۔ عقیدت اور حقیقت کے اس تضاد نے یہودیوں کو سخت روحانی ایذا پہنچائی۔ ان کے شک و یقین، امید و ناامیدی، خوف اور بے باکی، بغاوت اور وفاداری کے باہم آویزش ہونے لگی، یہودی قوم کا یہ پیچیدہ روحانی تجربہ تھا جس نے عبرانی پیغمبروں کی آہ و فغاں کو بلند ترین ادب کا مرتبہ دیا۔

ہماری قوم کے لئے بھی یہ واردات ایک پیچیدہ اجتماعی تجربہ کشت و خون کے علاوہ ایک پوری قوم کی جلاوطنی، ہجرت خانہ برباد قافلوں کی دشت پیمائی اپنے عزیزوں کی موت اور جدائی، ایک قیامت سے گزرنے کے بعد ایک نئی زندگی کے آغاز کا حوصلہ مسلمانوں کے لئے یہ زیادہ پیچیدہ روحانی تجربہ تھا کیونکہ اس میں جد و جہد اور کشمکش بھی شامل تھی حق خود ارادیت اور آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد اور کشمکش ایک موعودہ زمین کی تلاش، یہ شدید ذہنی کشمکش کہ ایک طرف وطن چھوٹنے کا غم ہے تو دوسری طرف ایک نئے روحانی وطن کا خیر مقدم۔ اُدھر ماتم ایک شہر آرزو۔ اُدھر نیا مستقبل بنانے کی سعی جس میں قوم کے شاندار ماضی کا ورثہ بھی شامل ہو۔ ان متضاد جذبوں اور قدروں کی آپس میں آویزش اور کشمکش ایک پیچیدہ تجربہ میں منتج ہوئی۔

دوسرا نظریہ بھی درست ہے اگر ان ہنگاموں کو خونریزی کے واقعات اور بہیمیت اور بربریت کے مظاہروں تک محدود کیا جائے تو یہ ہنگامہ مکروہ اور گھناؤنا ہے۔ پُر عظمت نہیں۔ خون ریزی جنگوں میں ہوتی ہے۔ لیکن جنگیں اپنے وطن اور قوم کے لئے بلکہ بلند آدرش کے لئے خواہ وہ نام نہاد ہی سہی۔ لڑی جاتی ہیں۔ محض قتلِ عام سے رزمیہ کی فضا نہیں بنتی فسادات میں قیامت کا رن پڑا۔ لیکن دلیری اور شجاعت کے بڑے کارنامے مفقود ہیں ہندوستان کی یہ دوسری مہابھارت کرشن وارجن سے محروم ہے مظلومی اور شقاوت کے اس غیر معمولی ڈرامے میں کوئی مسیحا کوئی حسین نظر نہیں آتے صبر و استقلال، ایثار و قربانی کے اعلیٰ نمونے نہیں ملتے یہ اسمٰعیل و حسین کی قربانی نہ تھی بلکہ بھیڑ بکروں کی قربانی تھی کیونکہ انسان بھیڑ بکروں کی مانند ذبح کئے گئے تھے چنانچہ انتظار حسین نے ایک ادیب کی حیثیت سے ان سارے امکانی پہلوؤں پر غور کرتے ہیں کہ اس موضوع پر رزمیہ کیوں نہیں لکھی جا سکتی اور قوم کا نمائندہ ہیرو پچھوا رزمیہ ہیرو کیوں نہ بن سکا۔

لیکن آج کے دور کا نمائندہ ہیرو دراصل اینٹی ہیرو ہے عام معمولی غیر معروف چھوٹا انسان اور فسادات میں ان چھوٹے انسانوں کی دلیری اور شجاعت ایثار و قربانی کے نمونے ملتے ہیں یہاں وہ پدمنیاں بھی ہیں جنہوں نے اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرتے ہوئے جان دیدی، لیکن انہیں پدمنی کی شہرت نصیب نہ ہو سکی۔

اس زمانے کی بڑی واردات اور اس عہد کا تجربہ فسادات کے خارجی حادثہ سے زیادہ وہ جلاوطنی اور ہجرت تھی جو فسادات کے جلو میں آئی اور یہ ہجرت اپنے باطنی دکھ درد کے ساتھ ایک تخلیقی تجربہ بن گئی۔ یہ ہجرت ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف ہی نہیں

ایک زمانے سے دوسرے زمانے کی طرف ہجرت تھی اپنے گھر اور گلی کوچے ایک زمانے کی مانند گزر گئے، ان کی یاد روح کی مبہم کسک بن گئی ایک تہذیب کا شیرازہ بکھر گیا چنانچہ "دلی کی بپتا" صرف شاہد احمد صاحب کی ذاتی بپتا نہیں ہے جو اس آگ سے خود گزرے تھے بلکہ میر کے ان اشعار کی تفسیر ہے۔

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

"دلی کی بپتا" گویا نثر میں دلی کا شہر آشوب ہے اور ایک تہذیب کا مرثیہ البتہ واقعاتی حقیقت نگاری کے باوجود اس کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔

ہجرت کا تجربہ ادیبوں کی ایک پوری نسل کے ذہن میں رچ بس گیا تھا اور انہوں نے موضوع میں ڈوب کر لکھا۔ ادب کا تعلق روح سے ہے اگر ذہن و روح تک ادیب کی رسائی نہ ہو سکے تو قتل و خون اور جسمانی مصیبتوں کی ساری تفصیلات خواہ وہ کتنی جذباتی اور رقت انگیز کیوں نہ ہوں۔ صحافتی نگاری کا درجہ رکھتی ہیں۔ آج انسانی زندگی اتنی ارزاں ہو گئی ہے۔ اور لوگ اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ لاکھوں انسانوں کی موت محض ایک صوتی کیفیت کا اثر رکھتی ہے۔

ہیمنگوے نے جنگ کو موضوع بنایا تو اس کی غرض لاکھوں انسانوں کی جسمانی موت سے زیادہ انسانی روح کی موت اور انسانی قدروں سے تھی ژاں پال سارتر نے فرانس کی تحریک حریت اور جنگ کے بارے میں لکھا تو اس کی غرض اس "آہن" سے تھی جو روح میں اتر گیا۔ (IRON IN THE SOLL) اس برعظیم کے فسادات میں تلواریں اور کرپانیں خنجر اور برچھے ہزاروں جسموں میں پیوست ہوئے لیکن اس ہنگامے میں جو زندہ بچ رہے، ان کی روح میں "آہن" کی اس کھٹک تیر نیم کش کی اس خلش کو محسوس کر سکے انہیں کی تخلیقات دیرپا اور پر اثر ثابت ہوئیں۔

ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت سے محمود ہاشمی کے "کشمیر اداس ہے" کی اہمیت مسلم ہے کیونکہ انہوں نے اس پار کے کشمیر کی مستند تفصیلات کے ساتھ جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے لیکن جو چیز اس تاثراتی رپورتاژ کو فنی اور ادبی رتبہ عطا کرتی ہے۔ وہ روح کا وہ مبہم کرب و اضطراب ہے۔ جو دبی دبی لہروں میں ساری کتاب میں جاری و ساری ہے۔ محمود ہاشمی "دیوار برلن" کی مثل دیوار کشمیر کے اس پار رہ گئے تھے اور بڑی ہمت سے موت کے سائے میں اس دیوار کو پار کرنے سے پہلے انہیں انہوں ہی کے خلاف لڑنا پڑا؛ اس احساس کی خلش نے انہیں بے چین رکھا جموں کے مسلمانوں کو انہوں نے ایک قیامت سے گزرتے دیکھا اور ان کی روح کانپ اٹھی رجبور رجو "ایک شہر تھا عالم میں انتخاب" اس پار کے کشمیر کے حالات سے متعلق ایک اہم دستاویز ہونے کے ساتھ "کشمیر اداس ہے" ایک بلند ادبی معیار کی تخلیق بھی ہے اپنوں ہی میں وہ ننگ دیں، ننگ وطن بھی تھے جنہوں نے اپنی قومی تاریخ اور مقصد زندگی سے غداری کی ہزاروں فنکاروں کے خون شہیدان سے رنگی "زوال حیدر آباد" کی خونچکاں داستان اس غداری کی مثال پیش کرتی ہے۔ فسادات کا موضوع اپنے وسیع تر تناظر میں کشمیر کے قضیہ اور زوال حیدر آباد، ان سب مسئلوں کو محیط ہوتا ہے۔

فسادات کا سب سے ہولناک اور سب سے شرمناک پہلو عورتوں کی بے حرمتی تھا۔ بہر بار انسان کی حیوانیت کے یہ مظاہرے کریہہ اور گھناؤنے تھے ان کی تفصیلیں بے پناہ نفرت تو پیدا کر سکتی ہیں لیکن وہ گداز نہیں جو منٹو نے "کھول دو" کے دو لفظوں میں سمو کر رکھ دیا ہے۔ عورت کے ذہن و روح پر چھائی ہوئی وحشت جو ان دو لفظوں "کھول دو" سے ایک ہی معنی سمجھ سکتی ہے منٹو کو یہاں عورت کی روح سے غرض تھی پابندی کے سلاجونتی، میں عورت کی روح کے ایک نہایت نازک تار کو چھیڑا ہے۔ یہاں مرد کا بہیمانہ جلاجونتی کا شوہر بے رحم بہیمانہ نہیں بلکہ ایسا الڑکھا کردار پیش کیا ہے کہ وہ اغوا شدہ عورت کی روح کے زخم کو چھونا نہیں چاہتا کہ اس سے درد سوا نہ ہو جائے۔ لیکن عورت یہ چاہتی ہے کہ کوئی اس کا زخم دیکھے چھوئے اس پر مرہم لگائے۔ اس پھانس کو نکال لے جو اس کی روح میں کھٹکتی ہے۔

اور منٹو کی جستجو اور جسارت حیرت انگیز تھی کہ انہوں نے قاتل

کی موج کو بھی چھوڑ گیا ایشر سنگھ کا کرب و اضطراب رجب مردہ لڑکی کے ٹھنڈے گوشت کے لمس کے تصور سے وہ کانپ اٹھتا ہے اور اس کی انسانیت جاگ اٹھتی ہے، جو چند سادہ گالی آمیز جملوں میں ظاہر ہوتا ہے ایک دل شکستہ روستا دکی جرم و سزا کا کرب و اضطراب ہے کرپان گویا پیٹھ کے خونی خنجر کا تصور ہے کہ اسے دیکھ کر ایشر سنگھ کی زبان سے کوئی مرصع شاعرانہ جملے نہیں نکلتے بلکہ وہی سادہ گالی آمیز جملہ . . . . رمال . . . . چھیننی . . . . میں اس کرپان سے چھ آدمی قتل کر چکا ہوں . . . . ،،

فسادات پر منٹو کی تحریروں کا پیام سب سے زیادہ رجائیت آمیز ہے کہ انسان کی انسانیت اتنی سخت جان ہے کہ کبھی مر نہیں سکتی بربریت بھی اسے ختم نہیں کر سکتی اور یہ پیام منٹو نے کسی بندھے ٹکے جملے مثلاً نیا انسان پیدا ہو گیا، انسان مر گیا لیکن انسان زندہ رہے گا کے ذریعہ نہیں دیا ہے بلکہ واقعات اور کردار کے باطن سے یہ نتیجہ بر آمد کیا ہے

منٹو نے معصومی غیر جانبداری نہیں بلکہ ایک سچے ادیب کی معروضیت برتی ہے ان کا زاویۂ نظر نہ سیاسی تھا نہ عمرانی۔ منٹو نے ظلم کے خارجی عمل کی تفصیلوں سے دہشت نہیں پیدا کی بلکہ ظلم اور مظلومیت کو صحیح انسانی پس منظر میں دیکھا۔ انہوں نے انسانی کردار پر تخلیقی انداز میں غور کیا۔ اور یہ احساس پیدا کیا کہ غیر معمولی حالات میں انسان کتنا ہی وحشی کیوں نہ بن جائے، روز مرہ کی معمولی زندگی میں وہ قدرت ہے کہ وہ انسان کو سیدھا کر ہی لیتی ہے اور اسے اپنے معمول کی طرف واپس لے آتی ہے رجائیت امید و یقین کو متزلزل کرنے والے ان حالات میں بھی منٹو کو انسانی فطرت پر اعتماد تھا۔ منٹو نے فسادات کے موضوع پر متعدد اور متنوع پہلوؤں پر افسانے لکھے اور ان بظاہر غیر ادبی موضوعات میں بھی انہوں نے ایک معنویت ڈھونڈ نکالی کہا جاتا ہے کہ ایسے غیر معمولی حالات میں ادیب کو چاہیئے کہ وہ ادبی تقاضوں اور فن و ادب کی عظمت کو بھول کر پروپیگنڈے کے میدان میں اتر آئے بالکل درست اگر اس سے کوئی سماجی مقصد حل ہو سکتا ہو لیکن فسادات پر اس طرح کے جو افسانے لکھے گئے وہ تو اپنا سماجی مقصد بھی ٹھیک طرح سے ادا نہیں کر سکے۔

۱

عصمت چغتائی اپنے مضمون فسادات اور ادب میں لکھتی ہیں پہلے فسادات کی روک تھام ضروری سمجھی گئی۔ ہندوستان اور پاکستان کے بیشتر ترقی پسند ادیب فوراً اس طرف متوجہ ہو گئے اور دوسرے ترقی پسند عناصر کی ہمراہی میں کام کرنا شروع کر دیا۔ چاقو اور چھری کا وار قلم سے روکا گیا (واقعی ؟) اور رجعت پسندوں نے چاقو اور چھری کا ساتھ دیا ترقی پسندوں نے بالکل اسلحہ جات کی طرح ڈرامے اسکیچز اور نظمیں تیار کر کے تیزی سے فضا میں بکھیر دیں، انہیں یہ سوچنے کی فرصت نہ تھی کہ اس جلد بازی سے فن کو ٹھیس نہ لگ جائے قلم کی ہتک نہ ہو جائے۔ اس بھڑکتی ہوئی دنیا کو شہ پاروں سے زیادہ چھینٹوں کی ضرورت ہے۔

،، اسی زمانے میں کرشن چندر نے باقاعدہ ایک مضبوط مورچہ قائم کر کے افسانوں، کہانیوں اور اسکیچز کی فوج کی فوج میدان میں اتار دی جس تیزی سے فسادات پھیلے کرشن چندر کے افسانے ہندوستان اور پاکستان کے رسالوں کے ذریعہ پھیل گئے کرشن چندر نے جو کچھ لکھا جذبات کی رو سے بچ کر اور شاید زبردستی لکھا آمد کا گلا گھونٹ کر وہی لکھا جو اس نے لکھنا چاہا! جو مصلحت وقت نے کہا قصداً یہ بھیا دی کچھ اس انداز سے کی گئی کہ دنیا میں کہیں اور ایسی کوئی دوسری مثال نہ ملے گی ،،

میں عصمت چغتائی کی ذہانت اور زور بیان کی معترف ہوں لیکن کیا واقعی انہیں ان باتوں پر یقین تھا یا وہ انگریزی محاورے کے مطابق زبان گال میں دبا کر بات کر رہی تھیں ؟ کیا چاقو چھری کا وار اتنی آسانی سے قلم پر روکا جا سکتا ہے اور کیا وہ لوگ جو ایک دوسرے کے گلے پر چھری پھیر رہے تھے اطمینان سے بیٹھ کر ان ادیبوں کے افسانے پڑھ رہے تھے اور جس تیزی سے فسادات پھیلے کرشن چندر کے افسانے اس تیزی سے پھیل گئے اور اپنا اثر بھی کر گئے۔ ؟

اس دور میں جس نوعیت کے افسانے لکھے گئے اس کی توجیہ خود عصمت چغتائی نے کرشن چندر کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے کر دی ہے اس سے بہتر توجیہ ممکن نہیں۔ درحقیقت اس دور میں لکھے گئے افسانے شاید سب سے زیادہ بے روح اور بے اثر تھے کیونکہ لکھنے والوں نے مصلحت کی بنا پر لکھا۔ نہایت محتاط ہو کر لکھا کہ کہیں ان پر جانب داری کا الزام نہ لگ جائے وہ اپنی انسانیت پرستی بے تعصبی اور غیر

جانبداری کی مہر ثبت کرنا چاہتے تھے الہٰذا وہ ایسے افسانے لکھ رہے تھے جن پر دونوں قومیں ناراض نہ ہوں اور جو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے رسالوں میں چھپ سکیں۔

حالانکہ سچائی اور غیر جانبداری کا اظہار بغیر کسی مصنوعی ترازو کے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جہاں ہندوؤں کے قتل عام کی تصویر گھناؤنی اور نفرت انگیز تفصیلوں کے ساتھ کھینچی جائے پھر سرحد کے اس پار ماتھے ہی ہزار مسلمانوں کے قتل کا ذکر کر کے حساب برابر کر دیا جائے "اور تیرے کوچے سے ہم نکلے" (ناصر شمسی) اور "فیری لین" (نریندر گھوش) میں یکطرفہ تصویر ہے "فیری لین" کے ہندو محلے میں فسادات کی آگ بھڑکتی دکھائی گئی ہے "تیرے کوچے سے ہم نکلے" میں ایک باعزت وضع دار اور آسودہ حال مسلمان گھرانے کی دیگر اور دلگداز تصویر ہے کہ فسادات کی خونریز سامانی میں اس گھرانے پر کیا گذری باوجود اس یکطرفہ پیش کش کے ان تخلیقات کی اثر آفرینی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

نریندر گھوش کے ذاتی خلوص اور غیر جانبداری کا ثبوت فیری لین میں اجمل اور صابر کے کردار ہیں۔ یا تاجو سامری نے "جب بندھن ٹوٹے" میں لائلپور کے ہندوؤں کے مصائب کا ذکر کیا ہے اور انہیں ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ میں منتقل ہوتے اور لٹے پٹے قافلے میں گذرتے دکھایا ہے تو تشکر اور امتنان کے بھرپور جذبہ کے ساتھ پاکستانی ڈپٹی کمشنر آغا عبدالحمید اور پولیس چیف کی فرض شناسی اور رحمدلی کا تذکرہ بھی کیا ہے

فٹ نوٹ ۱: اس ضمن میں بلونت سنگھ آنند کی انگریزی کی کتاب (CRUEL INTERLUDE ASIA BOMBAY ۱۹۶۲ کا ذکر بھی برمحل ہے جس میں پوری سچائی اور غیر جانبداری سے یہی تفصیلات پیش کئے گئے ہیں اور ڈپٹی کمشنر آغا عبدالحمید اور پولیس سپرنٹنڈنٹ نجف خان کی کارگزاری کو سراہا گیا ہے۔

"اور انسان مر گیا" میں رامانند ساگر نے انسانیت کی موت کا نوحہ لکھا۔ قنوطیت اور یاس انگیزی کے اس گھپ اندھیرے میں انہوں نے اگر نور کا موقع پایا ہے تو وہ مولانا کا کردار ہے مولانا گویا خواجہ خضر ہیں۔ جو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور ہر نازک موقع پر مدد کے لئے آن پہنچتے ہیں ان کے اس ہمہ گیر وجود پر اعتبار مشکل ہی سے آتا ہے لیکن اس کردار کی پیش کش میں رامانند ساگر کے خلوص سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ساگر کو اس پر یقین ہے کہ گو انسانیت دم توڑ چکی ہے اگر مولانا کا سا ایک آدمی بھی زندہ ہے تو انسان مر نہیں سکتا۔ (یاد رہے کہ اس ناول پر رامانند ساگر کو اور اس دیباچہ پر احمد عباس کو رجعت پسندی کا تمغہ عطا کر دیا گیا۔)

ساگر کو اس کا ذاتی تجربہ ہوا تھا۔ وہ ایک لٹے پٹے شرنارتھیوں کے قافلے کے ساتھ اپنے بال بچوں کو لے کر دہلی پہنچے تھے اور ان حالات میں ایک خالص مسلم علاقوں میں گھرے کر انہیں غریب مسلمان ہمسایوں کے بھروسے پر چھوڑ آئے تھے۔ راجندر سنگھ بیدی ایک ریفیوجی ٹرین کی چھت پر "لٹکتے" آئے تھے انہوں نے اپنے بچوں کو پگڑی سے باندھ کر ڈبے چھت پر ایک کیل سے لٹکا رکھا تھا جہاں سے گرنے کا ہر لمحہ ڈر لگا رہتا تھا اور بیدی نے گہرے پہاڑی کھنڈوں اور بھائی بندوں کی گرہ بانوں کی پروا کئے بغیر کئی مسلمان خاندانوں کو محفوظ مقامات پر پہنچایا تھا۔

جن ادیبوں نے عملاً یہ سب کچھ کر دکھایا تھا۔ ان کے خلوص اور بے تعصبی میں کوئی شک نہیں ہو سکتا اور واقعی یہ بات قابل تحسین تھی کہ ان حالات میں جب نفرت کی آگ چاروں طرف بھڑک رہی تھی، ادیبوں انسان دوستی برقرار رکھی اور فرقہ وارانہ تعصب سے بلند ہو کر لکھنے کی کوشش کی لیکن بہت سے ادیبوں کے بارے میں یہی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ ان کی بے تعصبی اور غیر جانبداری محض دکھاوے کی تھی وہ اپنے آپ سے جھوٹ بول رہے تھے ان کی تحریروں میں بہروپیہ پن صاف ظاہر تھا۔ ان ادیبوں نے بہت ہی محتاط ہو کر ایک تنگ سے راستے کو اختیار کیا انہوں نے یہ طے کر لیا کہ فسادات اور ان کے وجوہات کا تجزیہ کیا ہو سکتا ہے اور ادیبوں کو کس قسم کے افسانے لکھنے چاہئیں اور پھر اس قسم کا ایک نیا گھڑا فارمولا بنا لیا۔

۱) یہ کہ انگریزوں کی سامراجی حکومت نے نفرت و نفاق کا بیج بویا

۲) تقسیم اور پاکستان کا قیام فساد کی جڑ ہے۔ ملک کا بٹوارہ محض انگریزوں کی چال تھی۔

۳) ترازو نہایت احتیاط سے پکڑی جائے اور فسادات میں ہندوؤں مسلمان سکھوں کا قصور برابر بتایا جائے۔

۴) اور آخر میں اس موہوم سی امید پر یہ راگ الاپا جائے کہ یہ نفرت مٹ جائے گی۔ ہندو مسلمان بھائی بھائی ہو جائیں گے پھر سے ایک متحدہ

محاذ قائم ہو گا۔ اور ایک نیا انسان جنم لے گا۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ پاکستان کے ادیبوں نے بھی یہی فارمولا مستعار لیا۔ حالانکہ یہ نظریہ جو ایک سیاسی جماعت سے اُدھار لیا گیا تھا۔ مطالبۂ پاکستان کی نفی کرتا تھا۔ اسے ہماری قومی حمیت آسانی سے قبول نہیں کر سکتی تھی۔ پاکستان ایک تصور تھا۔ اور اب حقیقت بن چکا تھا۔ اس سے ہماری تمنائیں، عزائم اور آدرش وابستہ تھے۔ یہ نظریہ کہ تقسیم محض سامراج کی ایک چال تھی اور فسادات کی ساری ذمہ داری تقسیم پر عائد ہوتی ہے نہ صرف انتہائی گمراہ کن تھا بلکہ اس بحران کی صحیح توجیہہ بھی پیش نہیں کرتا تھا۔

یہ نفرت و نفاق محض غیر ملکی سامراج کی بدولت نہ تھی بلکہ اس کے جراثیم صدیوں سے نسل در نسل دلوں اور دماغوں میں پرورش پا رہے تھے (خواجہ احمد عباس "اور انسان مر گیا" کے دیباچہ میں جو فسادات پر ان کے افسانوں سے کہیں زیادہ موثر چیز ہے کیونکہ اس میں انہوں نے بلا جھجک کری اور سچی باتیں کہی ہیں۔ پوچھتے ہیں کیا ہم اتنے اندھے اور بے قوت تھے کہ انگریزوں کے بہکاوے میں آ گئے جب ہم سو برس سے انہیں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے؟) اس برصغیر میں دو قومیتوں کی معاندانہ آویزش کے پس منظر میں غیر منقسم ہندوستان کی وحدانی صفحہ ۴ قومیت کا تصور غیر حقیقی تھا۔ لکھنے والے اس واشتی بھائی چارگی اور ایکے کے جو خواب دیکھتے رہے وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے اب ہندو مسلم مشترکہ تہذیب اور وحدانی قومیت کے راگ الاپے جانا حقایق سے چشم پوشی کرنا تھا۔

اب ہم ایک دوراہے پر آ کھڑے ہوئے تھے ہمیں قطعیت کے ساتھ ایک راہ کا انتخاب کرنا تھا۔ پاکستانی ادیبوں کے سامنے نئے تقاضے تھے سب سے پہلے ان کے سامنے یہ بڑا کام تھا کہ وہ اپنا قومی تشخص (NATIONAL IDENTITY) قائم کریں اور اپنے آپ کو پاکستانی قوم کے عزائم اور آدرشوں، حسرتوں اور تمناؤں، غموں اور خوشیوں سے مکمل طور پر وابستہ کریں اپنے قدموں تلے دھڑکتی ہوئی زمین سے گہرا ناطہ استوار کریں، ادیب اگر اپنی قوم اپنی سماج کے ضمیر کی گہرائی میں نہیں ڈوب سکتا تو اس کی آواز میں بھی گہرائی اور گیرائی پیدا نہیں ہو سکتی اس دور میں قدرت اللہ شہاب نے صحیح سمت اختیار کی اور سب سے پہلے حقیقی پاکستانی ادب کی مثال پیش کی مصنوعی تمازو والے ادب کی فضا میں جب "یا خدا" جیسی تخلیق وجود میں آئی تو لوگ چونک اٹھے۔ "یا خدا" کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں پہلی دفعہ ایک ادیب نے پاکستان کی سرزمین سے اپنا رشتہ جوڑا تھا۔ اپنی قوم کے ضمیر کی گہرائی میں ڈوب کر لکھا تھا۔ بغیر کسی مصلحت اور ملمع سازی کے ایک سچائی کا اظہار کیا تھا۔ قدرت اللہ شہاب نے "یا خدا" میں محض ہندوؤں اور سکھوں کے مظالم دکھانے پر اکتفا نہیں کی بلکہ بڑی جرأت اور جسارت کے ساتھ اپنی قوم کے کردار کا بھی محاسبہ کیا۔

پاکستان کی سرزمین لاکھوں مجروح جسموں اور زخمی روحوں کیلئے ایک جائے پناہ تھی۔ لیکن یہاں کے انصار نے ان مہاجرین کا کس طرح استقبال کیا۔ تخریبی اور شرانگیز عناصر اپنے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد لئے یہاں بھی موجود تھے دلشاد کو خدا کی اس سرزمین میں بھی پناہ نہیں ملی عورت کے اس انفرادی المیہ میں شہاب نے ایک عمومی اور ہمہ گیر حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے لہٰذا "یا خدا" محض دلشاد کی کہانی یا عورت کا المیہ نہیں ہے اس کی معنویت وسیع تر ہے۔

منٹو کی تخلیقات میں بھی یہی جرأت آمیز سچائی کارفرما تھی ان نئے ادیبوں نے بھی، جن کے ذہنوں میں ہجرت کا تجربہ رچ بس گیا تھا۔ اپنے آپ کو اس نئے روحانی وطن سے وابستہ کر لیا تھا۔

اب ہمارے ادیبوں نے ایک جدا منزل تلاش کر لی تھی۔ ہمارے قدریں، ہماری وفاداریاں الگ تھیں سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کے انداز جدا تھے۔ جس دلی کا شاہد احمد صاحب نے ماتم کیا ہے وہ یقیناً سردار جعفری کی یہ دلی نہیں ہو سکتی تھی۔

میری دلی، میری محبوب دلی۔

اب تو غاصب شہنشاہوں کی داشتہ اور خودکام جاگیرداروں کی لونڈی نہیں ہے غیر ملکوں کے سرمایہ داروں منڈی تیرے چہرے پہ میں آج ایک نور سا دیکھتا ہوں۔

"دلی کی بپتا" میں، شاہد احمد صاحب نے دلی کا شہر آشوب لکھا۔ پھر آزادی کے آٹھ مہینے بعد جب شاہد صاحب دلی واپس لوٹے تو انہوں نے اپنی محبوب دلی کے چہرے پر نور نہیں دیکھا۔

"میں اپنی ماں کی گود میں دل شکستہ لے کر آیا تھا اور دل مردہ لے کر واپس آیا۔ ماں کا رنڈسالہ دیکھا۔ بیوگی کے آنسو دیکھے۔ شاہجہانی مسجد کو چاندنی میں دیکھا تو سمجھا ماں کے دونوں ہاتھ دعا کے لئے آسمان کی

(باقی صفحہ ۱۳۶ پر)

اک زلیخائے خود آگاہ کا دامن بھی جلا

دو نفیس بلوریں گلاس جن سے دو مختلف رنگوں کے مشروب چھلک رہے ہیں، بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہیں۔ ایک میں گہرا زرد یا نارنجی سیال ہے دوسرے میں فرانسیسی شراب کلیرے کا سا سُرخی مائل بنفشی، ایک اورنج جوس ہوگا، دوسرا شربت فالسہ یا اسی سے ملتا جلتا کوئی شربت۔

دو گلاس پاس پاس بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہیں ان کی شفاف بلوریں سطح سے سُرخی مائل سبز اور بنفشی اور نارنجی رنگ چھلک رہے ہیں دونوں گلاسوں کے سیال مادہ میں بلبلے اٹھ رہے ہیں ان میں سفید سفوف کے ذرے تحلیل ہو رہے ہیں سفید سفوف یا ہلکا زرد سفوف یا ایک گلاس میں سفید سفوف اور ایک میں ہلکا زرد۔ مشروب کے گہرے رنگوں کی وجہ سے سفوف کا رنگ واضح دکھائی نہیں دیتا۔ اب ذرے گھل کر مشروب کے ساتھ یکجان ہو چکے ہیں حباب نہیں اٹھ رہے ہیں اور مشروب کی سطح پر سکون ہے۔

ایک آراستہ شبستان نرم قالین و بیز پردے فوم کا ڈبل بیڈ اور ریشمیں لحاف ریشمیں نرم، گرم، لحاف میں سے ایک نازک مخروطی انگلیوں والا حسین ہاتھ نکلتا ہے پھر عریاں بازو اور کندھے اور دمیدہ حد نظر تک عریاں ایک مضبوط مردانہ ہاتھ گلاسوں کی جانب بڑھتا ہے، بڑھتے بڑھتے رُک جاتا ہے۔

"نہیں نہیں، ابھی نہیں، ابھی رات بہت باقی ہے رات گہری ہونے دو، آج کی رات ہماری آخری رات ہے آج کی رات محبت کی آخری رات ہے آج کی رات محبت اور لذت کو اپنے منتہیٰ تک پہنچنے دو اس منتہیٰ تک کہ اس سے پرے موت کے سوا کچھ نہیں اس آغوش لذت سے ہم موت کی آغوش میں پہنچ جائیں گھبراؤ نہیں جانم، یہ موت اذیت ناک نہیں ہو گی، ایک گہری طویل نیند ہوگی اور بس . . .

کاش میں ایک فن کار ہوتا۔ ایک باکمال مصور یا سنگ تراش کہ تمہاری آخری شبیہہ پیش کر سکتا جو میرا آخری شاہکار اور بلند ترین فنی کارنامہ قرار پاتا۔ تمہارے بے مثال حسن کے سحر کو میں نے لفظوں میں تو سمو لیا ہے، تم میری شاعری کی جان ہو، وجدان ہو، میرے اشعار کا سوز و گداز، حدت و تپش، بجلی کی سی تڑپ سب کچھ تم سے ہے رعنائی خیال تم سے وابستہ ہے . . . جیتی جاگتی شخص کے تصور سے نہیں میں محض تصور کا قائل نہیں، محض لذت نظر کا قائل نہیں، اس جرأت گناہ کا قائل ہوں جو قرب اور جسم کے لمس اور آسودگی تک پہنچا سکے اس جرأت گناہ میں تم نے میرا مکمل ساتھ دیا ہے جذباتی روحانی، جسمانی ہر لحاظ سے ہم نے ایک دوسرے کے اور تم میرے لئے صرف تصور نہیں رہی ہو۔ نازنین! ۔ وجود کی تکمیل کی ہے۔

میں مصور نہیں ہوں لیکن ایک تصویر کار تو ہوں کہ کیمرے سے غضب کی تصویریں اتار سکتا ہوں، مدتوں کے لئے ہم نے مصوری نہیں سیکھی مصوری کے فن میں مہارت حاصل کرنے کے لئے خاصی ریاضت کرنی پڑتی ہے فوٹو گرافی آسان ہنر بھی ہے اور جدید زمانے کی الٹرا ماڈرن ذہنوں کے لئے بہر ملاقات، یہ تقریب بڑا کافی ہے اور تمہیں ماننا پڑے گا کہ کم از کم عکس نگاری فوٹو گرافی کے فن میں، میں خاصی مہارت رکھتا ہوں تمہاری بے شمار تصویریں اس کی شاہد ہیں مانا کہ تم بے حد حسین و جمیل نے کے علاوہ غضب کی فوٹو جینک بھی ہو پھر بھی کیا مجھ سے فن کار کی دل نگاہ اور فنی مہارت کو اس میں کو ئے

دخل نہیں کہ میں نے تمہارے حسن کو لازوال کر دیا؟

تمہاری وہ پہلی تصویر تمہیں یاد ہے جو میں نے وفورِ شوق کے عالم میں بنائی تھی اس وقت جب تم میرے لئے صرف ایک تصور ، ایک تمنا تھیں تمہاری پہلی معصومیت کی تصویر اس میں تم ایک الوھی وجود ایک دیوی کی طرح مقدس ، پاکیزہ اور معصوم نظر آرہی ہو لہراتے ہوئے بال کھولے تم سمندر کی موجوں سے اس طرح ابھر رہی ہو جیسے بوتی چیلی کی وینس ، تمہاری وہ پہلی تصویر میرا پہلا شاہکار تھا۔ کاش کہ میں تمہاری آخری تصویر بنا سکتا جس میں تمہارے چہرے پہ اور حسین جسم پر بیک وقت انتہائی لذت اور انتہائی اذیت کی کیفیات طاری ہوتی یہ تصویر واقعی ایک شاہکار ہوتی لیکن اس وقت میرے ہاتھوں میں سکت کہاں ہوگی میرے حواس ہی کہاں قائم ہوں گے کیونکہ ہم دونوں ساتھ ساتھ موت میں شریک ہوں گے۔

نازنین تمہاری اس پہلی معصومیت سے اس زندگی تک آنے کا جس کی آج تم ماہر ہو چکی ہو شاید میں ہی ذمہ دار ہوں میں نے تمہیں اس زندگی کی لذت سے آگہی بخشی ، تم آج ایک کامیاب سوسائٹی گرل ہو اس شہر نگاراں کی ہر محفل کی شمع ، ہر پارٹی کی جان ہر کلب اور جم خانہ کی رونق تم سے دوستی کا شرف اور نیاز حاصل کرنے کے لئے بڑے سے بڑے آدمی بیتاب حتیٰ کہ ایک بین الاقوامی گروہ میں تمہاری مانگ بڑھتی گئی جو تمہارے حسن اور ذہانت کو اپنے مقام کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے تم نے اس زندگی کی خیرہ کن چمک دمک دیکھی اور اس دلدل میں ایک دفعہ پھنسنے کے بعد اپنے آپ کو باہر نہ نکال سکیں۔ یہ پھندے اتنے مضبوط ہیں

نازنین کہ تم نکلنا بھی چاہو تو نکل نہ سکو گی ، میں تمہیں بچانا بھی چاہوں تو بچا نہیں سکوں گا۔

ڈائری کے اوراق الٹتے گئے۔ ڈائری نویس کا موڈ بدلتا جا رہا تھا۔ محبت کا لہجہ نفرت و انتقام میں بدلتے ہوئے ایک قاتل کا سا لہجہ بنتا جا رہا تھا۔

" اتنا مجھی کو الزام دیتی ہو کہ میں نے تمہیں زندگی کی ان راہوں پہ لا ڈالا کہ تم ایک کی پابند نہ رہ سکیں اس مرد کی جو تم پہ دل و جان سے فریفتہ تھا اور تمہاری ہر ادا پہ ہر لغزش برداشت کرنے کے لئے تیار تھا لیکن میں وہ نہیں ہوں جسے تم اب تک دھوکا دیتی رہی ہو ، میرے خمیر ایک اور ہی مادہ سے اٹھی ہے ، میں سراسر نار ہوں ، تمہاری ذرا سی بے وفائی ....

بقیہ : ظلمتِ نیمروز کا دیباچہ

طرف اٹھے ہوئے ہیں اور کیونکر اس کے دل میں شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یہ تصور کچھ ایسا بندھا ہے بھلائے نہیں بھولتا اور بار بار دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔

" ماں کیا تیرا سہاگ ہمیشہ کے لئے اجڑ گیا؟ "

انتظار حسین اپنے ماضی ، اپنی بہشت گم گشتہ کی تلاش میں اپنے دیس گئے۔ سانجھ بھئی چوندیس۔ وہاں انہیں بہشت نہیں ملی اور وہ اس احساس کے ساتھ واپس ہوئے کہ اپنے ماضی اور اپنے اصل کی تلاش ہمیں کہیں اور ہی لے جاتی ہے چاہے تہذیبی سالمیت رخصت ہو چکی ہو اور عہد حاضر کے انقلاب نے سب کچھ درہم برہم کر دیا ہو ماضی کا ورثہ یادوں کی صورت میں اجتماعی حافظہ (COLLECTIVEUNCONCIOUS) میں محفوظ رہتا ہے۔ منزل گم گشتہ کی جستجو اور کارواں رفتہ کا سراغ ہمیں ۱۹۴۷ء کے بحران اور دس (۵۷) تاروں کی جنگ آزادی سے بھی بہت پیچھے میدان کربلا۔ بلکہ جنگ بدر تک لے جا سکتا ہے ، یہ ہماری تاریخ کی آگ ہے اور ہماری قوم کا جو نیا احساس تعمیر ہو رہا ہے اس میں آٹھ سو سالہ ہند مسلم تہذیب اور چودہ سو سالہ تاریخی شعور بھی شامل ہے اور یہی ہمارے ادب کی اساس ہے۔

مُجرم کون؟

کیا وہ ایک مجرم تھی؟

ایک مجرم، ایک قاتل؟

وہ جس کے حسن میں میڈونا کی سی تقدیس اور پاکیزگی تھی؟

وہ ایک ماں تھی، جس کے سینے میں ماں کا دل دھڑکتا تھا جو جدائی میں اپنے ننھے سے بچوں کے لیے تڑپ رہی تھی؟

عورت ایک ناقابلِ فہم معمہ ہوتی ہے وہ اپنے معصوم ظاہر میں کتنی پیچ در پیچ، تہ دار شخصیت چھپاتے ہوتے ہوتی ہے۔

یقیناً وہ ایک قاتل ہونے کے ساتھ ایک ماں بھی ہوسکتی تھی۔

لیکن کیا حقیقتاً وہ ایک قاتل تھی؟

بے شمار نظریں اس پر لگی تھیں کورٹ روم (کمرۂ عدالت) کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کیوں کہ آج اس مشہور مقدمہ کا فیصلہ سنایا جانیوالا تھا۔ باہر بھی ایک مجمع کثیر تھا۔ لوگ اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔

وہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑی تھی، اسی شاہانہ تمکنت کے ساتھ سراونچا کیے۔ بلور کے سے شفاف چہرے پر جذبات کا عکس چھلک چھلک آتا لیکن وہ جذبات پر قابو پاتے ہوتے تھی۔ چہرے پر خوف یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔

استغاثہ کی جانب سے لاتعداد گواہ پیش کیے گئے تھے، وکیل استغاثہ نے کیس بھی بہت اچھی طرح پیش کیا تھا۔ لیکن وکیل صفائی CRIMINAL) LAWYER) کی حیثیت سے ملک گیر شہرت کا مالک تھا۔ اس نے گواہوں پر اتنی کامیاب جرح کی تھی اور دفاع کا کیس (SUM UP) سمیٹتے ہوئے اتنی قابل قبول، مدلل بحث کی تھی کہ یقین ہو چلا تھا، یا تو وہ بری کردی جائے گی یا پھر سزا ہوگی تو چند سال کی سزائے قید۔

اس نے حاضرین عدالت پر ایک نظر ڈالی۔ ساری نظریں اس پر جمی تھیں۔ ان نگاہوں میں کیا تھا؟ (ACCUSATION?) اور اچانک جیسے یک زباں ہو کر کہا

تم مجرم ہو!

یہ کسی جیوری کی آواز نہیں تھی، سارے شہر کی آواز تھی،

تم مجرم ہو، تم مجرم ہو،

مجرم، مجرم، مجرم

یہ آواز اس کا تعاقب کررہی تھی۔

اور اچانک اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھاگیا اور زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی اس کی نظروں نے دیکھا جج کے سر پر کالی ٹوپی رکھی گئی تھی۔ اس کے کانوں نے سنا، فیصلہ سنایا جارہا تھا فیصلہ...

سزائے موت!

پھانسی! سانس رکنے تک، حرکت قلب بند ہوجانے تک،

پھانسی! اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی گردن کی طرف بڑھا۔ وہ مرمریں صراحی دار گردن جو ہیرے کے ہار، یاقوت اور موتیوں کے گلوبند یا دینس کے جگمگاتے کرسٹل کی لڑیوں سے مزین رہتی تھی، ایک مرتی رسی کے پھندے میں کسی جائے گی حتیٰ کہ سانس ...... اف کتنی عبرتناک موت ہوگی۔

ہر محفل کی شمع تھی وہ جو شہر نگاراں کی اعلیٰ سوسائٹی کی رونق تھی شمع محفل تھی، کلبوں، کاک ٹیل، ڈنر پارٹیوں، رقص و سرود کی محفلوں کی جان تھی، اس کی زندگی کا انجام اتنا شرمناک، اتنا عبرتناک ہوگا:

"انگڑائی" میری پہلی کوشش ہے اور یہ مجھے اپنے افسانوں میں بہت پسند ہے۔ یہ افسانہ ایک اہم نفسیاتی نکتہ کے گرد بنا گیا ہے۔ ADOLESCENCE کے پہلے دور میں اپنی ہی صنف کی طرف کشش ہوتی ہے پھر جیسے جیسے عمر پختہ ہوتی جاتی ہے مخالف جنس کی کشش غالب آجاتی ہے۔ "انگڑائی" کی ہیروئن ایک نوخیز پردہ دار لڑکی ہے کچھ تو اس کی عمر کا تقاضا ہے لیکن زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ مردوں سے بالکل الگ رکھی گئی تھی۔ اسے ایک عورت سے جذباتی محبت ہو جاتی ہے اپنی کالج کی ایک ٹیچر سے لیکن جب مرد پہلی دفعہ اسکی زندگی میں آتا ہے اس کے شوہر کے روپ میں تو وہ اسکی طرف بے اختیار کھنچ جاتی ہے۔ وہ اپنی پہلی محبت کو بھلا ہی نہیں دیتی بلکہ محسوس کرتی ہے کہ وہ اب تک کتنی بے وقوف رہی تھی۔ وہ اب اپنی اس ٹیچر سے بے پرواہ ہی نہیں ہو جاتی، بلکہ اپنے نئے محبوب کا ذکر کر کے انہیں جلانا چاہتی ہے وہ محبت جیسے ایک خواب تھی، وہ ایک "انگڑائی" لے کر اس نیند سے بیدار ہوتی ہے اور مسکراتی ہوئی اپنے مستقبل کا خیر مقدم کرتی ہے۔ ایک "انگڑائی" جس میں بے اعتنائی ہے، بے اعتنائی ہی نہیں ایک ہلکی سی تحقیر بھی، گویا ماضی کی زندگی رات بھر کی تکان تھی جسے وہ اس جسم کی تان اور بانہوں کی لچک سے دور کرنا چاہتی ہے۔ "انگڑائی" زندگی کا بنا بنایا افسانہ ہے۔ میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ اس مواد کو ایک مخصوص تکنیک میں ڈھالا ہے۔ افسانہ کا وقفہ مشکل سے ایک گھنٹہ کا ہے لیکن لڑکی کی پچھلی زندگی کے واقعات کا عکس اس کے ذہنی تصورات میں نظر آتا ہے۔ خارجی اثرات خلل انداز ضرور ہوتے ہیں جن سے خیالات کا سلسلہ ٹوٹتا رہتا ہے۔ لیکن یہ ایسے نہیں کہ خیالات کی رو کو دوسری ہی طرف پھیر دیں اسلیئے ان تصورات کا مرکز ایک ہی ہے۔ ان کا رنگ بدلتا جاتا ہے لیکن تسلسل قائم رہتا ہے۔

——— ممتاز شیریں

"آپا۔ گلنار آپا! وہ دیکھو مجھ فنا....... "جاوید ننھے ننھے ہاتھوں سے میری ساری کھینچ رہا تھا۔

"ارے ہٹ بھی۔ جب دیکھو آپا آپا...... دیکھ تو میری ساری کا ناس لیے دے رہا ہے۔ سفید ساری آج ہی تو پہنی تھی۔ اور یہ دھول میں اٹے ہوئے ہاتھ! مٹی سے کھیل رہا تھا کیا بدتمیز!" میں نے غصہ سے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ اس نے رونی صورت بنالی۔ "نہیں تو آپا...... مجھ فنا بجھ جائے لوڈیل...... "اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ "انہیں بلاؤ نا...... مجھ فنا بجھ کتنی اچھی ہیں۔ اس دن مجھے کیک دیا تھا اول کو کو...... کیسی اچھی کو کو...... آپا! انہیں بلالو اچھی آپا۔"

"ارے!" میں چونک پڑی۔ "مس فنانس یہاں!" میں نے دریچہ کی طرف نگاہ ڈالی۔ ہاں وہ سچ مچ کچھ دور پر کسی عورت سے باتیں کرتی ہوئی آرہی تھیں۔ "تو انہیں بلالوں؟" میں نے سوچا، پھر جلدی سے کمرہ کا جائزہ لینے لگی۔ کتابیں بکھری ہوئی اور فرنیچر! ایک کرسی دیوار کی طرف منہ کیے کونے میں پڑی ہے تو ایک کمرے کے عین بیچ میں۔ گویا اپنی پالش سے بے نیازی پر نازاں بیٹھی ہو اور صوفہ! ہونہہ۔ یہ بڑا سا سوراخ اور اس میں سے میلی میلی روئی جھانکتی ہوئی...... ٹیبل کلاتھ؟ اس پر تو جاوید نے بڑے ہی خوشنما نقش و نگار کھینچے ہیں؟ اُف کس بدتمیز نے فرش پر کاغذ بکھیرے ہیں؟ ایسے شریر بچے بھی کسی کے ہوتے ہیں؟ اور یہ دھول کی ایک انچ موٹی تہہ! ..... یہ کریمن بھی کہاں مر گئی؟ کم بخت سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ صبح صبح کمروں میں جھاڑو دے دیا کرے۔

"کریمن! او کریمن ذرا جھاڑن لیتی آنا! کیا تم نے یہ دھول بیچنے کے لئے جمع کر رکھی ہے؟"

"آئی بی بی! ابھی آئی۔ ذرا توے سے روٹی تو اتار لوں۔ جل جائیگی۔"

بھاڑ میں جائے وہ اور اس کی روٹی۔ کمبخت ہر وقت چولہے میں گھسی رہتی ہے...... آخر میں کیوں اتنا جل رہی تھی۔ مجھے خود شرم آنے لگی بے چاری غریب کیا کرے ایک ہی تو تھی اور گھر کا سارا کام اس کے سر۔ ہم ایسے کوئی امیر تو نہ تھے کہ دس نوکر رکھتے۔ ایک ہی غنیمت ہے۔

میں نے جلدی سے ٹیبل کلاتھ بدلا اور کرسیوں کو اپنی اپنی جگہ کھسکا کر فرش پر بکھرے ہوئے کاغذ سمیٹنے لگی۔ سمیٹتے سمیٹتے اٹھ کر کھڑکی پر نظر ڈالی تو میری سانس جیسے رک گئی۔ اُف مس فنانس کتنی نزدیک آگئی تھیں! "زکیہ! زبیدہ!" میں حلق پھاڑ کر چلائی۔ جواب ندارد! دروازے میں جاکر دیکھا تو بس جل ہی گئی۔ دونوں آنگن میں موجود! زکیہ جاوید کو اٹھائے کھڑی تھی تو زبیدہ گیٹ پر چڑھی ہوئی گردن بڑھا کر مس فنانس کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"زکیہ! کچھ مدد بھی کرو گی؟ شرم نہیں آتی تمہیں یوں باہر کھڑی ہو۔" "خفا کیوں ہوتی ہو آپا! میں ہمیشہ گیٹ میں تھوڑے ہی کھڑی ہوتی ہوں؟ یونہی آج"...... پھر وہ میرے پھولے چہرے کو دیکھ کر ہنس پڑی۔ "اخاہ۔ آپا! آج تو آپ کے غصہ کا پارہ سو ڈگری پر چڑھا ہوا تھا۔ اہا ہا۔ ابھی اتارے دیتی ہوں۔ اپنی آپا کا ٹمپریچر۔ دیکھو نا ایسے مزے کی بات بتاؤں گی۔" منہ بنا کر تالی بجاتے ہوئے۔ "بتادوں آپا؟ ..... او..... اوں...... مس فنانس یہاں سے گذر رہی ہیں۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہی ہے۔ اچھا آؤ ذرا کمرے کو صاف کرنے میں مدد دو۔ تمہیں تو بس باتیں ہی آتی ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "تو آپا مس فنانس کو بلاؤ گی؟" اس نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا زبیدہ بھی ناچ رہی تھی۔ اوہ! ابھی تک یہ بچے مس فنانس کو اتنا چاہتے ہیں!

زکیہ پھر دروازے کی جانب تکنے لگی۔ میں جھنجھلا گئی۔ کاغذ سارے کمرے میں پھیلے پڑے تھے۔

"ہونہہ! میں نہیں بلاؤں گی! دیکھو تو گھر کتنا صاف ہے۔" میں نے جھنجھلا کر سمیٹے ہوئے کاغذوں کو زمین پر دے مارا۔

"کیا کہہ رہی ہو آپا؟" زکیہ تعجب سے میرا منہ تکنے لگی۔ میں نے اس کی طرف توجہ کیے بغیر زبیدہ کو پکارنا شروع کیا۔ "زبیدہ! آجاؤ اندر۔"

"کیوں آپا؟" زبیدہ نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

"آجاؤ! اگر مس فنانس تمہیں دیکھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہمارا ہی گھر ہے اور وہ یقیناً مجھ سے ملنے آئیں گی۔" میں نے جاوید کو بھی اندر گھسیٹتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تو اور اچھا ہوگا۔ وہ کیوں نہ آئیں آپا؟"

"گویا تم نے گھر کو بہت اچھی طرح سجا رکھا ہے!" ہم ابھی سب

ٹھیک کر دیجئے۔ انہیں آنے دو آپا!" دونوں نے نہایت اشتیاق سے التجا کی۔

"کبھی جو دیا کر انہیں بلائیں گے۔"

"اوہ آپا! مس فنانس! اور اتنے دنوں کے بعد انہیں دیکھنا نصیب ہوا۔ آخر تمہیں کالج چھوڑے ہوئے دو تین ماہ ہو گئے ہیں نا؟ اتنے دنوں بعد اتفاقاً وہ خود ہمارے شہر میں آ گئیں۔ ہمارے گھر سے گزریں اور تم! ...... تم انہیں نہ بلاؤ۔ آپا تم تو مس فنانس پر" زکیہ سنجیدہ لہجہ میں کہتی کہتی یکایک زور سے ہنس پڑی اور شرارت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"ہوں! اچھا میں جان گئی...... جب سے پرویز بھیجا......"

"ارے چپ! بہت باتیں بنانے لگی ہے۔" میں نے زور سے ایک چٹکی اس کے لی۔

"ہونہہ آپا! تم بہت بنتی ہو۔ ابھی دیکھو نا پرویز کا نام آتے ہی کیسے شرما گئیں۔" میں یونہی شرماتی لجاتی۔ سمٹی سمٹائی سب کچھ بھول کر وہیں کھڑی رہی گویا اس نام نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔ کیسا حسین نام ہے۔ کتنا پیارا نام ہے! پرویز!

میں اس شیریں تصور سے چونکی تو سامنے کیا دیکھتی ہوں، دروازے کے کواڑ کھلے پڑے ہیں۔ پردہ ہوا سے اڑا جا رہا ہے اور مس فنانس ہمارے گھر کے بالکل مقابل میں کھڑی مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔ جونہی میں نے انہیں دیکھا وہ مسکرا ہمارے گھر کی طرف بڑھنے لگیں۔

"یا اللہ! اب کیا کیا جائے؟" میں زکیہ کو جھنجھوڑنے لگی۔ "اب تم ہی سب کچھ دیکھ لو۔ دیکھو وہ آ رہی ہیں۔" میں بے تحاشا وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں جا کر دم لیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے جھانک کر دیکھا مس فنانس برآمدے کے بازو والے کمرے میں کرسی پر بیٹھی تھیں اور زکیہ ایک خوشنما برتن میں کیلے اور سنگترے لئے ان کے پاس کھڑی تھی "گلنار کو بلاؤ نا" مس فنانس کہہ رہی تھیں۔ اچانک انہوں نے مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور مسکرا کر آواز دی۔ "گلنار!" میں شرما کر دروازے کی اوٹ میں ہو گئی......

...... میرے یوں شرما جانے سے وہ کیا بھی ہوں گی؟ میں ناکہ میرے جذبات ان کی طرف اب بھی ایسے ہی ہیں۔ ہونہہ! انہیں کیا معلوم کہ میں اب... مگر نہیں یہ غلط فہمی ضرور ہو گی۔ میں پہلے تو ان کے سامنے یونہی شرمایا کرتی تھی۔ جب وہ کہیں سے آ نکلتیں تو میں بھاگ کر کہیں جا چھپتی۔ وہ میری طرف دیکھتیں تو میں دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیتی۔ تو دل تو یہی چاہتا کہ وہ یونہی دیکھتی رہیں۔ عجیب لڑکی تھی۔ کچھ سال پہلے! رفتہ رفتہ میں ان سے کھل کر باتیں کرنے لگی تھی۔ پھر بھی جب کبھی ان سے اچانک مڈبھیڑ ہو جاتی تو میری بدحواسی نہ پوچھئے۔ وہ دن بھی کیا دن تھے چھٹی ہونے پر کالج کے برآمدے میں گھنٹوں ان کا انتظار کرنا میرا معمول تھا۔ ہفتہ بھر جس دن ان کا گھنٹہ نہ ہوتا۔ وہ دن کس قدر منحوس دکھائی دیتا تھا۔ ہاں میں ان پر مرتی تھی۔ انہیں دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی۔ اور لڑکیاں مجھے کیسے تنگ کرتی تھیں۔ گلنار! نہ جانے تم کیوں مس فنانس پر مرتی ہو۔ وہ کونسی ایسی حسین ہیں۔ بلکہ بدصورت بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔" جی چاہتا ہے کہ ان چڑیلوں کے منہ نوچ لوں۔ انہیں کیا معلوم کہ وہ مجھے کیسی حسین نظر آتی تھیں۔ دوسری لڑکیاں تو کیا میں زرینہ سے بھی اس دن سے خفا ہو کر روٹھ گئی تھی۔ گو زرینہ میری سب سے پیاری سہیلی تھی۔ ہاں اسی دن میں نے کالی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اور پربھا سے مادر مانگ کر سیاہ بوٹ بھی لگایا تھا۔ میں اور زرینہ ہاسٹل میں ٹہل رہے تھے اندرا بھی کہیں سے آ نکلیں۔ "آہا! آج تو تم بلا کی حسین نظر آ رہی ہو گلنار!" مس فنانس کی تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا تھا۔ ہونہہ! مس فنانس!" زرینہ نے طنز سے کہا تھا۔ "مس فنانس۔ وہ تین دفعہ مر کر جنم لیں تو شاید تمہارا حسن انہیں نصیب نہ ہو!" مجھے کتنا غصہ آیا تھا اس پر روٹھ گئی گل! اچھا بھئی وہ تجھ سے بڑھ گئیں زیادہ حسین ہیں۔ وہ خوش ہو گئی اب تو!" وہ پھر قہقہے لگانے لگی۔ اور اندر ہی اندر مسکرانے لگی۔ جی میں آیا زرینہ سے لڑ پڑوں۔ آخر وہ کون ہوتی مس فنانس کی توہین کرنے والی۔ یہاں میرا جی جل رہا ہے۔ اور وہ یوں کھڑی ہنس رہی تھی! اگر ایک بات بھی ان کے خلاف کہی جاتی تو میں بڑے سے کیا کالج کی لڑکیوں سے لڑنے کے لئے تیار تھی۔ بھلا میں ایک ہی تھی کئی لڑکیاں میرا ساتھ دیتیں۔ اور بھی تو بہت سی انہیں چاہتی تھیں

لیلتا غریب لڑکی وہ تو مجھ ہی کو ان کی محبت کا حقدار سمجھتی۔ میرے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرتی۔ بلکہ مس فنانس کو مجھ سے محبت کرتے دیکھ کر اور خوش ہوتی۔ کیسی بے لوث لڑکی تھی۔ اس کے خلاف وہ بختی! حسد کی پتلی، کیا کیا جتن نہ کرتی تھی کہ مس فنانس کی توجہ میری بجائے اس پر ہو۔ نہ جانے کہاں سے لاتی تھی ایسی خوبصورت ساڑھیاں اور انہیں کس سلیقے سے پہننے کی کوشش کرتی۔ جھوٹے موتیوں سے طرح طرح کے زیورات پہنا کرتی۔ اور بعد میں تو اس نے برقی مشین سے اپنے بالوں کو گھنگھریالے بھی بنایا تھا۔ ہونہہ! ان سب جتنوں سے کیا ہوتا۔ وہ حسین تو تھی نہیں۔ مس فنانس مجھ ہی کو دیکھا کرتیں۔ وہ جل مرتی۔ مس فنانس کے خاص سبجیکٹ پر تو وہ دنیا بھر کی کتابیں پڑھتی۔ مگر کہیں مجھ سے اچھا لکھ سکتی تھی! مجھ سے زیادہ نمبر بھی کبھی لے سکتی؟ آخر کچھ بھی نہ بن پڑتا۔ تو مجھ سے خوب جلا کرتی۔ اور ہمیشہ اسی کوشش میں لگی رہا کرتی کہ ایسی باتیں کرے۔ جن سے میرے دل کو ٹھیس لگے۔ یہ دیکھ کر کہ میں حسین سمجھی جاتی تھی وہ کیسے کڑھتی تھی۔ کہا کرتی "ہونہہ! سرخ و سفید رنگ کے بغیر بھی کوئی حسین تھی۔ لیکن تھی دراز قد اور دبلی پتلی۔ مگر اس کے چھریرے بدن میں خاک بھی حسن نہ تھا۔ وہ ایسے دکھائی دیتی تھی۔ گویا ایک لانبی سی لڑکی کو تراش کر صاف کر دیا گیا ہو۔ نہ وہ بدن کے دلکش نشیب و فراز، نہ کوئی لچک، نہ کوئی ادا۔ چپٹی بے جان، لکڑی۔ جی چاہتا منہ توڑ جواب دوں، ہونہہ۔ خوبصورتی کے لئے دلکش نقش بیچ رنگ سے زیادہ ضروری ہیں۔ اور بھرا ہوا گول بدن ایسے اتنا ہی خوبصورت ہوتا ہے۔ جتنا نازک جسم۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ دلکش۔" مگر مسکرا کر چپ ہو رہتی۔ اور یہ ظاہر نہ ہونے دیتی کہ میں اس کے طعن کو سمجھ گئی ہوں۔ کبھی وہ کسی کی گوری رنگت والی لڑکی کو دیکھ کر کہتی۔ "دیکھو گلنار وہ لڑکی کتنی حسین ہے۔ اور اس کی بتائی ہوئی لڑکی اتنی بدصورت، اتنی کریہہ صورت ہوتی کہ میں بے اختیار ہنس پڑتی۔ چپٹی ناک، پھیلے ہوئے نتھنے۔ بے حد موٹے ہونٹ، بھدا جسم مگر ہاں سفید رنگت۔ "میں ہنس کر کہتی۔ تمہاری حسن شناسی کی داد دیتی ہوں۔" جب ان باتوں سے کام نہ چلتا۔ تو سیدھی ذاتیات پر اتر آتی۔ اور وہ بار بار مجھے "کالی" کہتی۔ حالانکہ میرا رنگ اچھا خاصا گندمی تھا

اور زینت وہ تو مس فنانس کے پیچھے ہی لگی رہتی تھی۔ کیسی سادگی سے شکایت کرتی تھی۔ "گلنار! مس فنانس تو تمہیں ہی زیادہ چاہتی ہیں۔ اور وہ بے حد موٹی لڑکی... لڑکی نہیں بلکہ عورت.... وہ بھی تو انہی کا دم بھرا کرتی تھی۔ اور اپنی محبت کیسی عجیب طرح سے جتایا کرتی تھی۔ مس فنانس کو بھی بے اختیار ہنسی آجاتی......

اور نیلی....

"گلنار بی بی"!

"کیا ہے کریمن"!

"بیگم نے میٹھے ٹکڑے اور سموسے بنانے کے لئے کہا ہے۔ وہ جو کوئی مس صاحبہ آئی ہیں نا!

بہت کام ہے بیٹی۔ ذرا اس روٹی کے ٹکڑے کو تو کاٹ لو اچھی بیٹی۔ عمر بھر دعا دیتی رہوں گی۔ میں نے کواڑ کھولے اور آہستہ آہستہ جھانک کر دیکھا کہ کہیں مس فنانس ادھر تو دیکھ نہیں رہی ہیں! امی بھی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ امی سے باتیں کرنے میں مشغول تھیں میں جلدی سے نظر بچا کر باورچی خانے میں چلی آئی۔ چاقو کو اچھی طرح سے صاف کر کے روٹی کے ٹکڑے کاٹنے کے لئے بیٹھ گئی۔ کریمن نے گلا ہوا قیمہ چولہے پر رکھا اور اس میں نمک مرچ پیاز ڈال کر بھوننے لگی...... تو یہ شاہی ٹکڑے پکائے جا رہے ہیں۔ یہ انہیں بہت مرغوب تھے نا! اور میں نے کتنی دفعہ شاہی ٹکڑے اپنے ہاتھوں سے پکا کر انہیں بھیجے تھے۔ ان دنوں وہ یہیں کالج میں پروفیسر تھیں۔ اور جب ان کا ٹرانسفر ہوا تھا تو میں کتنا روئی تھی۔ وہ منا رہی تھیں تسلی دے رہی تھیں اور میں روتی جاتی تھی پھر میں نے رو دھو کر ابا کو مجھے بنگلور بھیجنے پر رضامند کر لیا۔ جہاں مس فنانس کام کر رہی تھیں۔ اور ان سے جا ملی تھی۔ دیکھتے دیکھتے دو سال یونہی گزر گئے۔ مجھے اس کالج کا آخری امتحان دینا تھا۔ اور اس کے بعد مس فنانس سے دائمی جدائی! میں اس کا خیال بھی نہ کر سکتی تھی۔ کاش اس کالج میں ایم اے کا کورس بھی ہوتا اور میں دو سال اور ان کے ساتھ رہ سکتی! .... پھر میں نے اس مرتبہ فیل ہونے کی ٹھان لی تھی۔ ایک ایسی لڑکی کے لئے جو جماعت

میں اول آیا کرتی تھی۔ فیل ہونا کتنی شرم کی بات تھی۔ اس بات کا مجھے خیال تک نہ آتا تھا۔ پروفیسروں نے مجھ سے کتنی امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ میں کانووکیشن میں بہت سے تمغے اور انعامات حاصل کروں گی۔ سب لڑکیوں میں اول آنا تو میرا معمول تھا اس کے الگ تمغے ملیں گے۔ سوشیالوجی اور انگریزی میں تو ریاست بھر میں اول رہوں گی۔ لڑکے دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔ اور کالج کا نام کیسے چمکے گا۔ ان کی امیدوں پر پانی پھرنے کی مجھے پرواہ نہ تھی۔

آخر وہ دن آ گیا جب امتحان ختم ہو چکا تھا۔ اور میں مس نانس سے آخری بار ملی تھی۔ انہیں خدا حافظ کہہ کر جب ہاسٹل لوٹی۔ تو سیدھی اپنے کمرے میں جا کر بستر پر جا گری اور تکیوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اتنا روئی کہ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اور تکیہ پوش بھیگ گیا۔ پھر جب زرینہ آئی تو اس نے مجھے گلے لگا لیا۔ اور تسلی دینی شروع کی۔ وہ جتنا مناتی تھی اور زیادہ میں روتی جاتی۔ ۔ ۔ ۔ اس رات زرینہ کتنی دیر تک میرے پاس بیٹھی سمجھاتی رہی۔ یہاں تک کہ میری آنکھیں جو رونے کی وجہ سے بری طرح جل رہی تھیں۔ نیند کے غلبے سے بند ہونے لگیں۔ کتنی محبت کرنے والی لڑکی تھی زرینہ!.......

"تو تم نے ٹکڑے کاٹ لئے بیٹی؟ ادھر لاؤ۔" انہیں میں گھی میں بھون دوں۔ اور اچھی بیٹی ذرا ان پوریوں میں قیمہ بھر کے سموسے بنا لینا۔ بیگم نے جلدی تیار کرنے کے لئے کہا ہے۔ کیا کریں بیٹی! تم دیکھتی ہو بہت بوڑھی ہو گئی ہوں۔ ہاتھ سے زیادہ کام نہیں بن پڑتا۔ ورنہ میں تمہیں کام کرنے کے لئے کہتی۔ توبہ توبہ... اس بوڑھے منہ میں کیڑے پڑ جاتے۔ یہ نازک نازک ہاتھ جو صرف قلم پکڑاتے تھے۔ ان کو میں موئی نوکرانی کام کرتے دیکھتی! آنکھیں نہ پھوٹ جائیں!" بوڑھی کریمن خوشامدیں کرنے لگی۔ میں بغیر جواب دیئے قیمہ بھر کر سموسے بنانے لگی۔

...... وہ خود بھی مجھے کتنا چاہتی تھیں۔ کئی بار انہوں نے مجھے اپنے گھر پر بلایا تھا اور کتنا اصرار کرتی تھیں کہ میں ان کے ساتھ سیر کو جایا کروں۔ اس دن ان کی آواز میں کیسی التجا تھی۔ "صرف ایک بار آ جاؤ گلنار! میں تمہیں اپنی کار میں گھما لاؤں گی۔ فلاں فلاں گارڈن لے جاؤں گی۔" میں نے بصد ناز ان کی التجا کو ٹھکرا دیا تھا.... اور اپنے پرچوں میں مجھے کتنے زیادہ مارکس دے دیتی تھیں۔ اسی پچاسی فیصدی! یہ دیکھ کر لڑکیاں مجھ سے بہت جلتیں۔ کہا کرتیں آخر تم تو ان کی فیورٹ ہو نا۔ ہمیں کہاں سے ملیں اتنے نمبر میرا نام اس چٹخارے سے لیتی تھیں گویا ان کے منہ میں لذیذ مٹھائی رکھی ہو۔ جب میری طرف دیکھ کر مسکراتی تھیں تو ان کا تبسم کتنا محبت آمیز ہوتا تھا۔ میرے دل میں بے اختیار خواہش پیدا ہوتی کہ انہیں مس نانس کی بجائے "مائی اینجلا" کہا کروں۔ یا کم از کم ایک بار چپکے سے کہہ دوں "میری اینجلا"۔ مگر مجھے کبھی جرأت نہ ہوئی تھی۔ ان کے سامنے کہتی نہیں تھی۔ تو کیا خطوں میں تو جو جی میں آیا لکھ دیتی تھی میرے دل کی ملکہ۔ میری جان ملکہ۔ میری آسمانی اینجلا۔ اور کیا کچھ نہیں لکھا کرتی تھی۔ عجیب دیوانی بھرے خط لکھا کرتی تھی۔ اور وہ کبھی خفا نہ ہوتی تھیں۔ انہوں نے بھی تو ایک دن ۔ ۔ ۔ ۔ اس دن میں اور لیلا ان کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ باتوں باتوں میں لیلا نے پوچھا تھا۔ "مس نانس آپ گھوڑے کی سواری جانتی ہیں؟" "نہیں" انہوں نے جواب دیا۔ "مگر بہت دنوں سے سیکھنے کی خواہش ہے۔ اور اس کے لئے رائڈنگ سوٹ بھی سلانے والی ہوں۔" اور پھر اچانک میری جانب مخاطب ہو کر کہا "وہ کوٹ اور پتلون گلنار" اس انداز سے کہا تھا کہ میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ "میں تو اس سوٹ میں بالکل مرد معلوم ہوں گی!" میں دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔ ہاں ان میں کچھ کچھ مردانہ جھلک بھی تو تھی۔ بہت دراز قد، چوڑا چکلا سینہ اور ایسی نظروں سے دیکھتی تھی کہ میں بے اختیار شرما جاتی۔ خواہ کتنی ہی لڑکیوں میں کھڑی ہوں۔ وہ باتیں تو اور لڑکیوں سے کرتی ہوتیں۔ مگر نظر مجھ ہی پر جمی ہوتیں۔ اور نارنجی ساڑھی میں وہ کیسی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ شاید ساڑھی کے عکس کی وجہ سے

چہرے کا رنگ سنہری ہو جانا۔ اور رخساروں پر ہلکی سرخی جس میں کچھ نیلاہٹ کی آمیزش بھی ہوتی۔ ......۔ اور دور سے تو چیچک کے داغ بھی دکھائی نہیں دیتے تھے.....

میں نے سموسوں کی سینی کریمن کے آگے رکھ دی۔ کریمن انہیں تلنے لگی۔ اب کہیں فرصت ملی۔ ان کاموں سے۔ اتنی دیر چولہے کے پاس بیٹھنے سے بہت گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ ساڑھی کے آنچل سے انہیں خشک کرتے ہوئے پھر اس کمرے کی طرف نظر دوڑائی۔ جہاں مس نفانس بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہی ساحرانہ مسکراہٹ جو مجھ پر جادو سا کر دیتی تھیں اب میں بخوشی ان کے پاس جانے کے لئے تیار تھی۔ دفعتاً میری نظر ساڑھی پر پڑی۔ جگہ جگہ مٹی لگی ہوئی تھی۔ اور جاوید کے ہاتھوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ میں یہ ساڑھی پہن کر کیسے جا سکوں گی؟

اتنے میں زبیدہ آنکلی۔

"زبیدہ" میں نے آواز دی۔ توجہ کئے بغیر بھاگی جا رہی تھی

"زبیدہ اِدھر تو آؤ۔"

"ہونہہ۔ نہیں آؤنگی۔ مجھے مس نفانس کے پاس جانا چاہیئے۔"

"میری اچھی منی مان لے گی۔ اپنی آپا کی بات۔ چاکلیٹ دوں گی۔ منی کو۔"

"کیا ہے آپا؟ چاکلیٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں"

"اچھی منی مجھے الماری میں سے ایک ساڑھی لا دینا۔ دیکھو یہ کیسی میلی ہو رہی ہے۔ مس نفانس کے پاس یہ پہن کر کیسے جاؤں اور یہ لو الماریاں کی کنجیاں۔"

"ہاں آپا جلدی جاؤ۔ مس نفانس تمہیں ہی یاد کر رہی ہیں"

...... تو وہ اب بھی مجھے چاہتی ہیں؟ ہاں شاید وہ دو ماہ پہلے میں نے ایک لڑکی کے ذریعے ایک خط بھیجا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ وہ خط پا کر خوش ہو گئی تھیں ......۔ اور اس دن بھی تو وہ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھیں نا جب میں اطلاع دیئے بغیر اچانک اس کالج میں آگئی تھی۔ جہاں وہ کام [illegible] کر رہی تھیں۔ میں ایک ایسی جگہ چھپ گئی تھی۔ جہاں سے انہیں میں دیکھ سکتی تھی۔ مگر وہ مجھے نہ دیکھ سکتی تھیں۔ اور ایک لڑکی کو اُن کے پاس بھیجا تھا کہ انہیں اطلاع کر دے۔ میں اس کالج میں داخلے کے لئے آئی ہوں انہوں نے فرطِ مسرت سے کئی بار میرا نام دہرایا تھا۔ گلنار! گلنار! یہاں! سچ کہو!" لڑکی نے انہیں یقین دلایا!" وہ کہاں ہیں بتاؤ نا؟" لڑکی انہیں بتا رہی تھی۔ میں کس جگہ ہوں مگر وہ دیکھے بغیر۔ گلنار! گلنار! تم کہاں ہو؟" کہتی ہوئی ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ انہیں یوں بے تاب دیکھنے میں بڑا مزا آیا تھا....

"لو اللہ اللہ کر کے سب چیزیں تیار ہو گئیں۔ اب میں اس بوڑھے جسم کو آرام تو دے لوں۔ کم بخت بوڑھی۔ جب دیکھو بڑبڑاتی رہتی ہے۔ میں جھلا کر رہ گئی۔

"خدا بھلا کرے۔ گلنار بی بی کا مجھ بوڑھی کی کتنی مدد کرتی ہے" کریمن باورچی خانے میں ٹاٹ بچھا کر وہیں لیٹ گئی۔ اہا بیٹی تم یہیں ہو۔ ابھی ابھی یاد کر رہی تھی۔ دیکھا بہت دراز عمر ہوگی۔ میری بی بی کی! اور بیٹی تمہارے لئے کتنی ہی دعائیں میرے منہ سے نکلتی ہیں۔ جھوٹ نہیں کہتی۔ کتنی ہی جگہ کام کیا ہرنا بابا ایسی بچی کہیں نہیں دیکھی۔ ذرا سے ونڈے تک مجھے ڈانٹ دیتے تھے۔ میری بی بی نے تو اب تک ایک سخت لفظ بھی نہ کہا۔ اب تو میرے کام کرنے کے دن گئے۔ اسی لئے تو تمہارے ہاں بھی کام چھوڑ دیا تھا۔ سچ کہتی ہوں بیٹی۔ صرف تمہاری شادی کی خبر سن کر آئی ہوں۔ تمہیں ان آنکھوں سے دلہن بنی دیکھوں۔ بہت دنوں سے یہی ارمان ہے۔ خدا کرے بہت اچھا دولہا نصیب ہو۔"

بھلا پرویز سے اچھا دولہا بھی کوئی ہوگا! ایک ہلکی سی مسکراہٹ میرے لبوں تک آگئی۔ میں نے جلدی سے منہ پھیر لیا کہ کہیں کریمن دیکھ نہ لے۔

پھر جیسے دماغ خیالات سے یک لخت خالی ہو گیا ہو۔ اور اُن کی جگہ پرویز۔ پرویز۔ پرویز۔ پرویز......

اور میں ایک حسین دنیا میں جا پہنچی۔ جذبات کی ایک رنگین دنیا۔ ہاں نہایت حسین۔ کالج اور مس نفانس والی دنیا سے

کہیں زیادہ حسین !!

کبھی میں یہ سوچا کرتی تھی کہ میری شادی ہو جائے تو اپنے شوہر سے محبت بھی کر سکوں گی۔ ایک دفعہ زرینہ نے جو پامسٹری جانتی تھی۔ میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا۔ "تمہارے شوہر کو تم سے محبت بے حد ہو گی" تو مجھے اپنے اس ہونے والے شوہر پر کتنا رحم آیا تھا کہ میں اس کی محبت کا جواب نہ دے سکوں گی اور اب ؟..... اب تو میں اپنے پرویز کو دیوانہ وار چاہتی ہوں۔

"آپا ساڑھی لے لو" میں نے زبیدہ سے ساڑھی لے کر میز پر رکھ دی۔ اور بال بنانے لگی۔

آخر میں مس فانس کو کیسے بھلا سکتی! وہ بھی تو مجھے بے حد چاہتی تھیں۔ ہونہہ! چاہتی ہوں گی۔ کبھی انہوں نے اس کا زبان سے اظہار بھی کیا تھا؟ میں سامنے ہوتی تھی تو ڈر کے مارے مری جاتی تھیں۔ گلنار۔ لڑکیاں کیا کہتی ہوں گی۔ گلنار اگر پرنسپل دیکھ لیں تو؟"

لڑکیاں دیکھیں تو دیکھیں۔ ہم نے کوئی جرم کیا تھا کہ یوں ہی ڈریں۔ اف رے بزدلی۔ اور جب ہمارے مضامین کی کاپیاں تصحیح کر کے کلاس میں لاتی تھیں۔ تو جیسے لکھے ہوئے نظریوں اور نکتوں کی تو بہت تعریف کرتیں۔ مگر کبھی لڑکیوں کو بتایا بھی تھا کہ یہ میرے پیش کیے ہوئے نکتے ہیں۔ جوابات کے پرچے واپس کرتے ہوئے کبھی جوش سے بھی میرا نام لیا تھا...... مگر وہ مجھ ہی کو سب سے زیادہ نمبر دیتی تھیں...... ہونہہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی؛ میں تو ہر پرچہ میں اول آتی تھی۔ لیکن کوئی استانی اتنے نمبر نہیں دیتی تھی۔ لیکن مس فانس تو اسی پچاسی نمبر دے دیتی تھیں۔ ہونہہ! صرف زیادہ نمبر نہ دے دیے "تو کیا ہوا۔ مجھے کتنی خوشی ہوتی۔ اگر وہ کلاس میں لڑکیوں کے سامنے میری تعریف کرتیں۔ اور کہتیں۔ دیکھو گلنار نے کتنے نمبر لیے ہیں۔ فلاں نمبر نے اتنے مارکس لیے۔ فلاں نمبر نے یہ کیا ہے۔ وہ کیا ہے۔ وہ کیا ہے۔ فلاں نمبر۔ فلاں نمبر میں تو بس "فلاں نمبر" ہی ہو کر رہ گئی تھی۔ اور وہ مس تھیں۔ آکسفورڈ کی ایم اے۔ وہ تو آدھ آدھ گھنٹے تک میرے مضمون کی تعریف کرتی تھیں گو ان کے جانچنے کا معیار بہت ہی اعلیٰ تھا۔ اور مسز سوشیل امرجی نے کہا تھا کہ وہ میرا پرچہ لیے بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔ "ماشاء اللہ گلنار نے تو اس دفعہ کمال ہی کر دیا۔ کتنے اچھے جواب ہیں۔ میں نے تو اس پرچہ کو کئی مرتبہ پڑھا۔" وہ دوسری ٹیچرز اور لڑکیوں کے سامنے ہمیشہ میری تعریف کرتی رہتی تھیں۔ اور مس کملا بالی جی۔ لیڈی ٹیچرز تو کیا مرد پروفیسر بھی میری ذہانت اور قابلیت کی داد دیتے تھے۔ فقط تھیں۔ تو مس فانس جو تعریف میں ایک لفظ بھی کہنا شاید اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھیں۔ ہونہہ!

اور میرا دل کیسے چاہتا تھا کہ وہ میرے حسن کی تعریف کریں ہمیشہ نہ سہی کبھی کبھی بے تابی سے کہہ دیں۔ گلنار تم کتنی حسین ہو! کم از کم ایک دفعہ بے اختیار ان کے منہ سے نکل جائے۔ آج تو تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو گلنار۔ یا یہی سہی۔ یہ ساڑھی تو تمہیں بہت سجتی ہے"۔ میں اس کے لیے کتنے جتن کرتی تھی۔ جس دن ان کا گھنٹہ ہوتا۔ وہ ہی ساڑھیاں پہنتی۔ جو مجھے بھاتی تھیں۔ بالوں کو خاص توجہ سے سنوارتی۔ کبھی کبھی بوڈی لگاتی۔ اچھی اچھی خوش رنگ ساڑھیاں پہنتی۔ اور مجھے اپنی کلائیوں اور انگلیوں پر بہت ہی ناز تھا..... میں اپنے ہاتھ میز پر اس انداز سے ٹیکے رہتی کہ چوڑیاں جم کر کلائیوں پر آ پڑیں۔ اور مس فانس کی سیٹ سے انگلیوں کی خوبصورتی کا اچھی طرح سے جائزہ لیا جا سکے..... مگر یہ تو ظاہر تھا کہ وہ مجھے حسین سمجھتی تھیں۔ ورنہ یوں نہ تکتی رہتیں۔ اور جب کبھی محسوس ہوتا کہ آج خصوصیت سے اچھی نظر آ رہی ہوں۔ ایسے موقعوں پر تو وہ مجھے بہت ہی توجہ سے دیکھ رہی ہوتیں۔ ان کی نگاہ مجھ پر سے ہٹتی ہی نہ تھی...... اچھا یوں ہی سہی۔ لیکن کیا میں پتھر کا ایک مجسمہ تھی۔ یا نقاش کی بنائی ہوئی تصویر تھی کہ یوں خاموش دار ملتی۔ آخر میں ایک انسان تھی۔ ایک سترہ سالہ نوخیز لڑکی رومانی اور جذباتی۔ کبھی تعریف کر دیتیں تو ان کا خزانہ کھو جاتا؟

مانا کہ وہ پروفیسر تھیں۔ مسز سوشیل بھی تو پروفیسر ہی تھیں کیا وہ میری صورت کی تعریف نہ کرتی تھیں۔ اس دن جب مجھے ایک ٹیبلو میں حصہ لینا تھا جس میں یہ بتایا جانے والا تھا کہ ملکہ نورجہاں رقص اور موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ مسز سوشیل میرا میک اپ

کرتی ہوں کیسے سراہتی جاتی تھیں۔ گلنار۔ نورجہاں کی تمثیل کے لئے تم ہی موزوں ہو۔" "تم کیسی اچھی انگریزی بولتی ہو۔ مسز سوشیل بھی تمہارے ہی گن گاتے رہتے ہیں۔ وہ بھی تمہارے لیکچرز دہ چکے ہیں نا؟ پوڈر، لپ اسٹک، روج لگا چکنے کے بعد انہوں نے کہا "آپ آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ ان کا میک اپ بھی کر دوں۔" اور میں نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں تو ماشاءاللہ کتنی خوبصورت آنکھیں !! ...... اور کس شدت سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش مسز سوشیل کی بجائے مس فانس ہوتیں۔ آخر میں مسز سوشیل ہی کیوں نہ چاہتی تھی۔ مس فانس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے؟ ...... اور زرینہ بھی تو میری آنکھوں کی تعریف کرتے نہیں تھکتی تھی۔ اور بیتا۔ وہ تو اشعار لکھا کرتی تھی میری آنکھوں پر!! زینی بھی کہا کرتی تھی نا۔ "گلنار۔ تم چشمہ نہ پہنا کرو۔ یہ تمہاری حسین آنکھوں کو چھپا دیتا ہے۔" سبھی تعریف کرتی تھیں۔ اس لئے تو میں اس کا خاص خیال رکھتی تھی کہ مس فانس میری آنکھوں کو دیکھیں۔ اور ان کی کلاس میں چشمہ بھی تو اتار رکھ دیتی تھی۔ گو مجھے بورڈ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے میں بہت دقت ہوتی۔ ہونہہ! اس بے حسی پر کچھ اثر بھی ہوتا تھا؟ مگر پرویز۔ پرویز کی حسن شناس نگاہیں پہلی ہی نظر میں میری آنکھوں کا حسن دیکھ لیں گی۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھیں گے تمہاری آنکھیں، غزالیں آنکھیں۔ کتنی سیاہ۔ کیسی مدھ بھری!! ...... کالج ڈے میں۔ میں نے صرف اس لئے ڈرامہ میں پارٹ ادا کیا تھا کہ مس فانس دیکھیں۔ برنارڈ شا کے ڈرامے "سینٹ جون ...." (SAINT JOAN) کا انتخاب ہوا تھا۔ اور میں جون بنی تھی۔ مجھے کیسی طرح سے سنوارا گیا تھا۔ میں خود آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر ٹھٹھک رہ گئی تھی۔ پھر مجھے ہنسی بھی آگئی۔ جون ایک دیہاتی لڑکی۔ پھر ایک قیدی جو کورٹ میں لائی جا رہی تھی۔ کیا اس وقت وہ بنی سنوری ہوگی لیکن یہاں کی فلموں اور سٹیجوں پر تو صرف یہی خیال رکھا جاتا ہے کہ جو لڑکی ہیروئین کا پارٹ ادا کرے۔ وہ خوبصورت ہو۔ اور اسے اچھی طرح سے سنوارا جائے۔ لیکن یہ تو مسز سوشیل اور مس جونس کی غلطی نہ تھی۔ انہوں نے میرا ٹھیک ہی میک اپ کیا تھا۔ مس جونس نے اپنا خاکی رنگ کا رائڈنگ سوٹ مجھے پہنایا تھا۔ خاکی کوٹ اور خاکی پتلون اور میرے لانبے بال پنوں میں لپیٹ کے شانوں پر ڈال دیئے گئے تھے۔ بالوں میں کنگھی تک نہ کی تھی۔ بال پیشانی اور رخساروں پر نہایت بے ترتیبی سے بکھیر دیئے گئے تھے۔ غلطی تو دیدہ پی کی تھی جس نے ڈیوک آف اوارک کا پارٹ ادا کیا تھا۔ وہ اپنے لبوں پر لپ سٹک لگا رہی تھی۔ ڈرامے کا وقت ہو گیا تھا۔ مجھے جاتی دیکھ کر اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچ لیا۔ "ہائے گلنار۔ یہ کیا؟ تم تو ہیروئین ہو۔ روز اور لپ سٹک!!" اس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر لپ سٹک لگا دیا۔ اور گالوں پر روز مل دیا۔ اور جاتے ہوئے میں نے آئینہ پر نظر ڈالی تو خود ہی ٹھٹھک گئی۔ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے روکھے بال تو اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ مس فانس آج میری تعریف ضرور کریں گی۔ بلکہ تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ ڈرامے کے اختتام پر مس سوشیل، مس جونس، مسز ڈیانیل دوڑی ہوئی سٹیج پر چڑھ آئیں اور پردے کے پیچھے آ کر بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے مجھے مبارک باد دی کہ میں نے جون کے سے مشکل پارٹ کو بہت اچھی طرح نبھایا تھا۔ سب میری اداکاری پر عش عش کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ اور مس فانس؟ انہوں نے حاضرین میں شامل ہو کر ڈرامہ دیکھا نہیں پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر اداکار لڑکیوں کو ہدایات دیتی رہیں۔ میں نے کتنی التجا کے ساتھ کہا تھا کہ آپ حاضرین میں بیٹھ کر ڈرامہ دیکھیں۔ ان کے دونوں شانے پکڑ کر نہایت ملتجی نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔ میری یہ ملتجی نگاہیں تو پتھر سے دل کو پگھلا دیتیں۔ لیکن وہ تو شاید پتھر سے بھی زیادہ بے حس تھیں! "گلنار کیا کروں میں نے اپنے ذمہ یہ کام لیا ہے تو مجھے کرنا ہی ہوگا۔" "واہ یہ ہے تمہارا کام۔" تاہم انہوں نے پردے کے پیچھے سے تو دیکھا تھا۔

اس رات مجھے ہاسٹل لوٹنے میں بہت دیر ہو گئی تھی۔ گو ہاسٹل کالج ہی کے کمپاؤنڈ کے اندر تھا۔ لڑکیاں قدم قدم پر مجھے گھیرے لیتی تھیں گلنار تم نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔ "تمہاری اداکاری کے کیا کہنے۔" "تم اسٹیج پر کتنی حسین نظر آ رہی تھیں گلنار۔" ان سب سے پیچھا چھڑا کر تھکی ہاری ہاسٹل لوٹی۔ زرینہ باہر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ

دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میری اچھی گلنار۔ تم بال کٹوا کر یونہی میک اپ کیا کرو نا۔ آج تو پری معلوم ہو رہی ہو۔ لیکن بھئی۔ جون کے لئے ہمارا میک اپ ٹھیک نہ تھا۔ انکوزیٹر (INQU SITOR) کہہ رہا تھا "JOHN, YOU LOOK VERY PALE TODAY" اور تمہارے گالوں سے شفق پھوٹ رہی تھی۔" ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہم دوڑتے ہوئے ڈائننگ ہال پہنچے۔ سب لڑکیاں کھانے پر بیٹھ چکی تھیں۔ میرے جاتے ہی سبوں نے تعریف کی بوچھاڑ کر دی۔ اور اس رات میں کیسی خوش خوش بستر پر جا لیٹی۔ نیند ہی نہ آتی تھی۔ ہونہہ! ان سب تعریفوں کی مجھے کیا پروا۔ کل میں اپنی مس فانس اپنی انجلینا سے ملوں گی تو وہ یہ کہیں گی۔ یوں تعریف کریں گی ..... دوسری صبح ان امنگوں اور امیدوں کو لئے ہوئے گئی۔ تو اپنی انجلینا کے پاس کیا رکھا تھا؟ ایک جذبات سے عاری چہرہ اور پھیکی بے مزہ باتیں ...... زرینہ سچ کہتی تھی۔" گلنار۔ تم اتنی رومانوی لڑکی اور مس فانس کی سی بے حس اور سرد مہر کہیں تمہارا جوڑ بھی ہے۔ تم تو آگ ہو اور وہ برف ..... ہاں وہ جذبات سے بالکل عاری تھیں بے حس اور مردہ دل، پتھر کا مجسمہ، برف کا تودہ۔ بھلا پرویز سے ان کی کیا مناسبت۔ میرے پرویز کی رگ رگ میں زندگی ہے۔ بجلی ہے تصویر ہی میں وہ کتنے رومانٹک معلوم ہوتے تھے۔ اور میں نے اس دن چوری سے جھانک کر انہیں دیکھ بھی لیا تھا۔ جب ابا نے انہیں سلامی دینے (نذرانہ پیش کرنے کے لئے) کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس دن بھی زرینہ آئی ہوئی تھی اور جبین بھی۔ " دولہا بھائی آ گئے"، زبیدہ کی آواز آئی۔ اور میرا دل کیسے دھڑکنے لگا۔ زرینہ اور جبین بھاگ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں۔ زرینہ مجھے بھی گھسیٹنے لگی۔ "اٹھو گلنار۔ تم بھی اپنے دولہا کو دیکھ لو نا۔" میں پہلے تو جھجکی۔ گو میرا جی بے اختیار چاہ رہا تھا۔ کہ انہیں ایک نظر دیکھ لوں۔ امی کیا کہیں گی"؟ "اری امی کی بچی اٹھ۔ ایسا زریں موقع کھو دے گی؟" زرینہ نے آخر مجھے کھینچ لیا۔ وہ ابا کے سامنے کیسے شرمائے شرمائے کھڑے تھے۔ پھر جب وہ ہال میں آئے تو ہم نے دروازے کے سوراخوں میں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ کم بخت سوراخ کتنے چھوٹے تھے۔ آخر ہمیں ایک ترکیب سوجھ گئی۔ جبین نے ہمارے کمرے کی روشنی گل کر دی۔ تاکہ باہر والے ہمیں دیکھ نہ سکیں اور زرینہ نے آہستہ سے چٹخنی کھول کر ایک کواڑ کو ذرا سا کھول دیا۔ پھر کیا تھا۔ جبین اور زرینہ دونوں ٹوٹ پڑیں۔ مگر نہ جانے کیوں گے پیچھے ہٹنے لگی.....

بڑا خوبصورت نوجوان ہے گل۔ زرینہ نے فرط مسرت سے مجھے گلے لگا لیا۔ میں نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ "میری گل" ایسا اچھا جوڑ ہے۔ تیرا اور اس کا۔" وہ میری تھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے بولی! اس کی آنکھوں سے کیسی محبت ٹپک رہی تھی۔ وہ پھر جھانکنے لگی۔ فارم بھی بہت اچھا ہے۔ اور آنکھیں کیسی حسین ہیں۔ ادھر آ تو گل۔ بڑی آئی کہیں کی۔ امی سے ڈرنے والی۔" زرینہ مجھے پھر گھسیٹنے لگی۔ " دیکھا تو نے اپنے پرویز کی آنکھوں کو۔ بخدا تیری آنکھوں کا جواب ہیں وہ تو۔"..... ہاں میں نے دیکھا سب کچھ دیکھا اس خوبصورت چہرہ کو۔ ان تبسم آمیز ہونٹوں کو۔ ان حسین آنکھوں کو جن میں شوخی اور بے تابی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی .... اری بڑا رومانٹک معلوم ہوتا ہے۔ گل۔ تجھ پر دیوانہ نہ ہو جائے تو میرا ذمہ۔ ابھی سے کہہ دیتی ہوں گل۔ وہ تجھے آنکھوں میں بٹھائے گا۔ گلے کا ہار بنائے گا۔" اور میں وفور جذبات سے بہکی جا رہی تھی۔ اس کے بازوؤں میں گر پڑی .... " دیوانی مس فانس پر مری جاتی تھی آخر تو نے کیا امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ اس پتھر سی بے حس عورت سے مسرت ہو یا رنج۔ غصہ ہو یا بے تابی۔ وہی پھیکا چہرہ۔ وہی بے نور آنکھیں۔ پرویز کو دیکھ کتنا اکسپریشن ہے۔ اس کے چہرے پر۔ گویا جذبات کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔"...... ہاں وہ اس وقت مجسم اضطراب نظر آ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں کس بے تابی سے ادھر ادھر گھوم رہی تھیں کیوں؟ شاید اس لئے کہ کہیں میں نظر آ جاؤں؟۔

جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ دروازے توڑ دوں۔ سب کی موجودگی کو فراموش کرتے ہوئے ان کے سامنے جا کھڑی ہو جاؤں..... کاش میں کسی پردہ کی آڑ ہی میں کھڑی ہوتی.... ایک لمحہ کے لئے پردہ کھسک جاتا۔ اور میں ان کی طرف شوخ نظروں سے دیکھ کر مسکرا دیتی پھر جلدی سے نظریں جھکا کر شرما جاتی اور انہیں دم بخود کر دیتی۔ ہاں وہ ضرور

دم بخود ہو جاتے۔ میں، اس نیلی جارجٹ کی نقرئی بارڈر والی ساڑھی میں بہت دل کش نظر آ رہی تھی نا...... ہونہہ! میں یہ والی ساڑھی پہن کر کیوں جاؤں۔ میں جارجٹ کی ساڑھی پہنوں گی۔ جو میرے پرویز کی لائی ہوئی ہے۔ میں نے ساڑھی کھینچ کر پھینک دی جو ابھی ابھی پہن رہی تھی اور ذکیہ کو آواز دی۔ ذکیہ ایک برتن میں سموسے لئے جا رہی تھی۔ ذکیہ ذرا میری نیلی ساڑھی لے آنا۔ وہی جارجٹ کی۔" اچھا لے آؤں گی۔ مگر تم جلدی آنا۔

میں نے بے پروائی سے اس کمرے کی طرف نگاہ کی۔ مس نانس ہاتھ پر ٹھوڑی رکھے اوپر دیکھ رہی تھی۔ جذبات سے خالی بے نور آنکھیں بے حد پتلے پھیکے رنگ کے ہونٹ۔ زرد چہرہ جس پر چیچک کے داغ ہی داغ تھے۔ مجھے ایسے دکھائی دینے لگا کہ وہ داغ بڑھ رہے ہیں۔ بگڑے ہوئے ہیں اور پھیلتے جا رہے ہیں۔ ان کی صورت کیسی کریہہ ہوتی جا رہی ہے میں جلدی سے اندر کھسک گئی۔ اور سر کو زور کا جھٹکا دیا کہ دماغ پر کھنچی ہوئی تصویر مٹ جائے۔ اس کی جگہ دماغ کے پردے پر ایک اور تصویر ابھرنے لگی پرویز کی۔ وہ خوبصورت نیلی آنکھیں۔ بڑی بڑی بادامی۔ نشیلی، لانبی خمیدہ پلکیں۔ کشادہ حسین پیشانی اور ہونٹ کتنی حسین تراش تھی ان ہونٹوں کی۔ رسیلے بھرے ہوئے اور کناروں پر وہ ہلکا سا خم۔ گویا وہ مسکرانے کے لئے ہی بنائے گئے ہوں۔ وہ سانولا سلونا رنگ۔ شیام سندر۔ ہاں میرے شیام اور میں رادھا۔ میں نے میز پر رکھی ہوئی تصویر اٹھالی۔ پرویز کی اور فرطِ بے تابی سے اسے چوم لیا۔ "یہی ساری ہے نا" میں نے گھبرا کر تصویر رکھ دی۔ ذکیہ ساری لئے کھڑی تھی۔ "ہاں یہی۔" "آپا جلدی سے آؤ نا۔ سموسے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ اور یہاں ساڑیوں پر ساڑیاں بدل جا رہی ہیں۔ ادھر یہ بے پروائی۔ ادھر دیکھو تو بے چاری مس نانس نے گلنار گلنار ہی کی رٹ لگا رکھی ہے"!

اچھا ابھی آئی۔ میں نے پھر تصویر اٹھالی۔ اور سب کچھ بھول کر حسین تصویر میں کھو گئی۔ کیا ہنس مکھ چہرہ۔ آہا یہ ہونٹ۔ نظر پہلے ان ہونٹوں پر ہی جاتی تھی۔ یہ ہونٹ اور...... اُف کیا خیال آگیا۔ میں مارے شرم کے عرق عرق ہو گئی۔ میں نے تصویر رکھ دی۔

اور ساری پہننے لگی۔ ان کی شخصیت میں کتنی دلکشی تھی۔ اُف کس بلا کا سجیلا پن۔ دراز قد، چوڑا چکلا سینہ۔ لانبے مضبوط بازو۔ ان بازوؤں میں...... اُف پھر کیسے خیال آ رہے تھے۔ جیسے رگ رگ میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ دل کی دھڑکن کیسے تیز ہو رہی تھی۔ اور خون جیسے ابلا جا رہا تھا۔ نس نس میں گرمی۔ آگ۔ اُف یہ جذبات کا ہجوم۔ یہ طوفان۔ میں بستر پر جا گری۔ اور تکیوں میں منہ چھپا لیا۔ یہ ہیجان۔ کیسی لذت تھی اس میں!

"گلنار آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے" میں نے چونک کر دیکھا۔ امی کھڑی تھیں۔ ان کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ "مس نانس کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ تمہیں کچھ بھی پاس ہے۔ بڑوں کا۔ اور وہ تمہاری استانی ہیں" امی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

"تمہارا انتظار کر رہی ہیں" "تمہیں کو یاد کر رہی ہیں"۔ "تمہارے نام کی رٹ لگا رکھی ہے" اچھا بھی جاؤں گی...... ہاں کیوں نہیں! ضرور جاؤں گی۔ یہ ساڑھی پہن کر جو پرویز نے لا کر دی ہے۔ اور ہاں وہ انگوٹھی پہنوں گی۔ جو پرویز سے میرے منسوب ہونے کی نشانی ہے۔ میں نے ایک چھوٹی سی مخمل کی ڈبیا نکال لی۔ کیسی خوبصورت انگوٹھی تھی۔ میری ایگجمنٹ رنگ P-ENGAGEMENT RING - پرویز کے نام کا پہلا حرف کس خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔ ہیروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔ اور ان سفید نگینوں میں ایک سبز نگ جگمگا رہا تھا۔ میں نے فخر سے دیکھا اور انگوٹھی پہن لی۔ ہاں اسی طرح جاؤں گی۔ اور انہیں بتا دوں گی۔ کہ مجھے اپنی شادی کی کس قدر خوشی ہے۔ وہ اپنے دل میں خیال کر رہی ہوں گی۔ کہ میں ان سے شرمندہ ہوں۔ منہ بسورے ہوئے بڑی ہی مغموم صورت بنائے ان کے پاس آؤں گی۔ درد بھرے لہجہ میں اپنی مصیبت بیان کروں گی کہ میرے دل پر کیا بیت رہی ہے اور شاید رونے بھی لگوں۔ ہونہہ! میں انہیں کیسے حیران کر دوں گی ساڑھی پر نظر پڑتے ہی کہہ اٹھیں گی نا۔ "کیسی خوبصورت ساری ہے" اور میں بڑے فخر سے کہوں گی کہ یہ پرویز لائے ہیں۔ پرویز ہی کی باتیں کروں گی۔ خوشی سے جھومتی ہوئی انہیں بتاؤں گی۔ کہ پرویز کس قدر

حسین ہیں۔ انہیں میری شادی میں شرکت کرنے پر اصرار کروں گی۔۔۔ اور جذبات کی شدت کا پورے طور پر احترام کرتے ہوئے یہ بھی کہدونگی کہ میں پرویز سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ یہ سن کر بس جل ہی جائیں گی جلیں گی!۔۔۔۔ ضرور۔ اس وقت جب میں چھٹی لئے بغیر اپنے گھر آئی تھی۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھیں نا۔ "گلنار، کہیں تمہاری شادی تو نہیں ہو رہی ہے!" میں نے کہا۔ "نہیں" انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا۔ "تم مجھ سے چھپاتی ہو گلنار!" اور جب ہی تو انہوں نے میری منگنی کی خبر ملنے پر مبارک باد تک نہ بھیجی تھی۔۔۔۔ اور اب تو میرے چہرے پر بجائے رنج کے یہ وفور شوق۔ مسرت اور بے تابی دیکھ کر کیسے جل اٹھیں گی۔ ہونہہ! جلیں گی تو جلیں! خوب جلیں میری بلا سے!!

میں نے چلتے چلتے پرویز کی تصویر بھی لے لی۔

"ہماری گلی" نیم افسانہ اور نیم خاکہ ہے۔ "بالکونی" بھی ایک طرح کا خاکہ ہی ہے۔ گلمرگ کے ایک ہوٹل میں رہنے والے اور بیرے۔ کرشن چندر نے ان سب کرداروں کا الگ الگ تفصیلی خاکہ کھینچا ہے۔ "بالکونی" صرف چند دنوں کا افسانہ ضرور ہے لیکن ان چند ہی دنوں کے افسانے میں وقت کا ایک عجیب احساس پایا جاتا ہے۔ یعنی زندگی ازل سے قائم ہے اور ابد تک رہے گی۔

"دیمک" میں اگرچہ ایک عورت کی داستان ہے لیکن ان ڈائرکٹ نریشن کے باوجود بلونت سنگھ نے اسے ایک شہ پارہ بنا دیا ہے اگر کہانی زینو کی زبانی بیان کی جاتی تو ممکن ہے اس میں درد زیادہ ہوتا اور کہانی جذباتی انداز میں بآسانی لکھی جا سکتی۔ لیکن "دیمک" کا فنکار زینو کی کہانی خود بیان کرتا ہے۔ دوسرے کرداروں کو اس کے مقابلے پر پیش کر کے ایک خاص گہرا اثر پیدا کر دیتا ہے۔ ایسے کردار جو عورت کی زندگی کی گزشتہ منزلوں کے نمائندہ ہیں۔

اس کے برخلاف اگر ممتاز مفتی "اپنی آپا" میں صیغہ غائب استعمال کرتے اور مصنف کی طرف سے اس قسم کا ان ڈائرکٹ نریشن ہوتا کہ "سجادہ بڑی خاموش لڑکی تھی، یوں تھی، ووں تھی۔ بعد میں تصدق آیا وغیرہ" تو "آپا" کا کرداری نقشہ تو کسی نہ کسی طرح کھنچ جاتا اور کہانی بیان ہو جاتی لیکن "آپا" کے پڑھنے میں اتنا مزا نہ آتا۔ یہ کہانی اگر "آپا" ہی بیان کرتی تب بھی نہیں۔ اس میں سنجیدگی بھی ہوتی، درد بھی ہوتا لیکن خوبصورتی اور شگفتگی جو کہ تا ہوا یہ درد نہ ہوتا۔ "آپا" اس لئے خوبصورت ہے کہ اسے "جہینا" بیان کرتی ہے جو "آپا" کی بہن ہے۔ وہ آپا بھائی جان اور چچا جو باجی میں یکساں دلچسپی لیتی ہے اور اس طرح ہر ایک کو غور سے دیکھ سکتی ہے۔

کوئی کہانی نوجوان مرد یا لڑکی کی زبانی رعنائی اور شگفتگی حاصل کر لیتی ہے۔ بوڑھے کی زبانی ماضی کی یادوں اور حسرتوں میں ڈوب جاتی ہے اور بچے کی زبانی معصومیت میں سمٹ آتی ہے۔ کرشن چندر نے اپنی کہانی "ایک لاکھ تا فاقے سے ہزار۔۔۔" میں بچے کی زبانی داستانِ قحط بیان کر کے بظاہر سادگی میں نادر فنی نمونہ بنا دیا ہے زبردست اثر انگیز بھی۔ بچے کے معصومانہ انداز بیان کے پس منظر میں یہ ٹریجڈی اور بھی زبردست معلوم ہوتی ہے۔

جیسے اختر حسین رائے پوری کے "تلاش گمشدہ" دیوندر ستیارتھی کے "برہمچاری" اور بیدی کے "چیچک کے داغ" ہیں۔

ممتاز شیریں

وہ اپنی ناولٹ کو آخری پیچ دے رہا تھا۔ چیز بہت اچھی بن رہی تھی۔ اور وہ بے حد مسرور تھا۔ شام کا وقت تھا۔ اور خوشگوار ہوا بہہ رہی تھی۔ سمندر کی خنکی سے لدی ہوئی ہوا کے سسر جھونکے فرحت افزا جھونکے، میز کے پاس والے دریچے سے آ رہے تھے۔ اور اس کا ذہن تازہ تھا، اور اس کا قلم بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ آج وہ اس ناولٹ کو مکمل کر دینا چاہتا تھا اور ابھی اسے ختم کر دینا چاہتا تھا۔

نقرئی قہقہوں کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ بھڑکیلے باس میں دو لڑکیاں سڑک پر سے گزر رہی تھیں۔ وہ قلم ہاتھ سے رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور تیزی سے دریچے کے قریب آکر انہیں دیکھنے لگا۔ ایک لڑکی نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ دوسری نے شلوار قمیض اور دوپٹہ۔ دوسری لڑکی بڑی طرحدار تھی اس نے اپنے دانت بھینچ لئے۔ اور یہ طرحدار لڑکی جس میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی، کہیں مل جائے تو اگر وہ یہ پتہ لگانے میں کامیاب ہو جائے کہ یہ لڑکی کون ہے اور کہاں پر رہتی ہے تو اُسے شکار کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ آخر وہ ایک ناولسٹ کی حیثیت سے مشہور ہے۔ کئی لڑکیاں محض اس کی شہرت کی وجہ سے اس کے پاس چلی آتی ہیں، اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیتی ہیں۔ کوئی بھی لڑکی اُس کی محبوبہ بننے پر فخر کرے گی۔ اُسے اپنی خوش قسمتی سمجھے گی۔ اس کی نظریں دور تک ان لڑکیوں کا تعاقب کرتی رہیں۔ وہ غور کرنے لگا کس قوم کی ہوگی وہ لڑکی! پہلی لڑکی کا مذہب تو اس کی ساڑھی باندھنے کے انداز سے معلوم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ لڑکی جو چلتے چلتے میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ کس مذہب کی ہو گی۔ اور پھر جیسے اُسے فوراً اس کا جواب بھی مل گیا۔ کیونکہ اس کی ساتھی لڑکی اونچی آواز میں اس سے چیخ چیخ کر باتیں کر رہی تھی۔ اور باتیں کرتے ہوئے اس نے اُسے نام سے مخاطب کیا تھا۔

اوہ تو اس مذہب کی لڑکی ہے۔ تب تو اور بھی یقینی ۔۔۔ انتقام کی خاطر، ہاں اِن دنوں وہ اس مذہب کی لڑکیوں کو چُن چُن کر ۔۔۔۔ جب کبھی فسادات ہو جاتے ہیں تو دو قوموں کے افراد ایک دوسرے کا قتل عام شروع کر دیتے ہیں۔ یا ایک دوسرے کی عورتوں سے ۔۔۔۔۔ انتقام کی یہ دوسری صورت تو بڑی مزیدار ہے۔ لطف کا لطف اُٹھاؤ۔ اور اپنے ہم قوموں کی نظروں میں قابلِ تحسین بھی ٹھہرو۔ اُس کے دل میں بھی اس مذہب کے لوگوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی ہے اور وہ انتقام کی یہ دوسری صورت اختیار کر رہا ہے۔ لیکن اپنے مقصد کو چھپائے اور بڑے مہذب طریقے پر۔ ایک آرٹسٹ کا مہذب انتقام۔

اُس نے قلم اُٹھا لیا۔ آج تو یہ ناولٹ پوری کر دینی ہی

چاہیئے۔ نہیں معلوم پھر موقعہ ملے یا نہ ملے ایک تو بہت دنوں سے اس نے کچھ لکھا ہی نہیں۔ اور پھر یہ ناولٹ بھی کب سے شروع کر رکھی تھی۔ آج وہ اُسے ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ چند ایک اختتامی پیراگراف ہی تو لکھنے تھے۔ لیکن یہ بھی وہ نہ لکھ سکا تھا آج صبح سے اُس کی نئی محبوباؤں میں سے تین لڑکیاں یکے بعد دیگرے آدھمکی تھیں۔ اور اب ذرا سی دیر میں اس کی دیرینہ لیکن دیرپا محبوبہ ریحانہ آنے والی تھی۔ اور اُس کے آنے سے سے پہلے یہ ختم نہ ہو جائے تو....... اُس نے لکھنا شروع کیا اس کے ذہن میں اب بھی تازگی تھی، قلم میں اب بھی زور، چند لمحوں میں اُس نے اختتامی پیراگراف لکھ ڈالے۔ اور اس نے ناولٹ کو شروع سے ایک دفعہ پڑھا۔ اُس کا دل مسرور ہو گیا۔ اور سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ کتنی مکمل چیز تھی۔ آغاز، تعمیر، اٹھان اختتام، جذبات کی روانی، الفاظ اور جملوں کا حسن، زورِ قلم اور آخری جملوں کی اپیل کتنی زوردار تھی۔ اُس نے آخری جملوں کو بار بار منہ ہی منہ میں دہرایا۔ اور موضوع اور زاویہ سو فیصدی ترقی پسند۔ کیا چیز ہے۔ بہت دنوں بعد وہ ایسی چیز لکھ پایا ہے۔ لوگ شاکی ہیں کہ اُس کی حالیہ تحریریں بڑی پھیکی ہیں۔ وہ خود اپنی تحریروں سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ توجہ سے بالکل لکھ نہیں رہا ہے۔ وقت ہی نہیں ملتا۔ تو یہ لڑکیاں بھی کیا وقت کو کھا جاتی ہیں۔ لیکن، وہ مسکرایا، اُسے اپنی ذہانت اور زورِ قلم پر اعتماد ہے۔ اب اس ناولٹ پر بھی اُس نے خاص توجہ نہ دی تھی۔ پھر بھی کیا چیز بنی ہے۔ لوگ پھر ایک دفعہ چونک اُٹھیں گے۔ اس سے وہ اپنا کھویا ہوا وقار پالے گا۔ لوگوں کی نظروں میں وہ پھر ایک دفعہ وہی آرٹسٹ بن جائے گا۔ وہی "حساس آرٹسٹ" جس کی نوک قلم کی ہر جنبش میں جوش اور ولولہ ہے جس کی تحریر میں بلا کا اثر ہے۔ اور موضوع اور زاویہ نظر دیکھ کر تو سب کو پھر اس کی انسانیت دوستی پر یقین آجائے گا۔ کیا سو فیصدی ترقی پسند موضوع ہے۔ عورت معصوم اور مجبور ہوتی ہے۔ یہ ہم مرد ہی ہیں جو اُسے طوائف بناتے ہیں۔ وہ مردوں پر کیسے برسا ہے۔ "سماج کی گندگی" کو کس طرح بے نقاب کیا ہے"

اُس نے پھر ایک مرتبہ ناولٹ کو شروع سے آخر تک پڑھا۔ لیکن اس دفعہ اس میں اسے کسی چیز کی کمی شدید طور پر محسوس ہوئی۔ آخر کس چیز کی کمی ہے۔ آغاز، تعمیر، اٹھان، اختتام سب نہایت اچھے ہیں، آرٹسٹک ہیں۔ اور جملوں میں بندش کیسی حسین ہے۔ اور سٹائل نے بھی جذبات کا ساتھ دیا ہے۔ کہیں مترنم اور حسین الفاظ نے حسن اور موسیقی بکھیر دی ہے۔ کہیں الفاظ کے جوش اور ولولہ انگیز جملوں کی اُمنڈتی اُبھرتی موجوں نے طوفانی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ لیکن صرف الفاظ زوردار ہیں اور جملوں کے اس طوفان کے سے چڑھاؤ کے باوجود وہ اثر پیدا نہیں ہوا ہے۔ ہاں اس میں خلوص نہیں ہے۔ اور خلوص کی اس کمی کو وہ اختتام کی آخری زوردار اپیل بھی پورا نہیں کر سکی ہے۔ اس میں خلوص کیسے آئے گا؟ اس ناول میں وہ ان مردوں پر برسا ہے۔ جو معصوم سی لڑکیوں کی زندگی تباہ کر دیتے ہیں۔ انہیں طوائفیں بنا دیتے ہیں جب کہ وہ خود کتنی زندگیاں تباہ کر چکا ہے۔ کتنی ہی لڑکیوں کو طوائف بنا چکا ہے۔ اس کے لبوں پر ایک عیارانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ اپنے قلم سے کھیلنے لگا۔ اور پھٹے ہوئے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ان لڑکیوں کے پتے اور نام لکھنے لگا۔ جو اس کی زندگی میں آئی تھیں ان لڑکیوں کے نام جو سب سے پہلے اس کے بچھائے ہوئے دام میں پھنسی تھیں۔ جنہیں اس نے طوائف بنایا تھا۔ پھر ان عورتوں کے نام جو اس کے لئے اپنے شوہروں تک کو چھوڑ کر آگئی تھیں۔ لیکن جنہیں اس نے مستقل سہارا نہ دیا تھا اور اب اُن کی زندگی تباہ ہو چکی تھی اور اُن کی اس بے بسی میں اسے ایک قسم کا سادی مزا (Sadistic) بھی ملتا تھا۔ اور اُس کا غرور اور بڑھ گیا۔ کہ اس کے لئے عورتیں کیا کیا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ پھر وہ عورتیں جنہیں اس نے طوائف نہ بنایا تھا۔ بلکہ وہ پہلے ہی سے خوب طاق اور تجربہ کار تھیں۔ اور ان کے اسی تجربہ کی خاطر اس نے اُن سے تعلق قائم کیا تھا۔ اور پھر یہ نئی نئی لڑکیاں تعلیم یافتہ، فیشن ایبل، نئی روشنی کی لڑکیاں جو اس کی شہرت کی وجہ سے کھنچی چلی آتی تھیں۔ اور اس کی محبوبہ بننے میں فخر

محسوس کرتی تھیں۔ ادھر کتنی لڑکیاں اور عورتیں ...... فخر سے اس کا سینہ پھول گیا۔ ایک طویل فہرست بن گئی تھی۔ سب سے اوپر سرِ فہرست رنجنا کا نام تھا۔ اُس کی دیرینہ اور لیکن دیر پا محبوبہ تھی۔ رنجنا کو اُس نے پہلے پہل اُس وقت جانا تھا جب وہ کم سن کوئی سولہ سترہ سال لڑکی تھی۔ معلوم نہیں اگر وہ اس وقت اس کی زندگی میں نہ آیا ہوتا تو وہ اب کیسی ہوتی۔ ممکن ہے کہ اُس کی شادی ہوتی، اس کا ایک گھر ہوتا، شوہر ہوتا، بچے ہوتے۔ ایک چھوٹی سی جنت ہوتی... لیکن وہ اس کی زندگی میں آگیا تھا۔ سب سے پہلے اس کی وجہ سے رنجنا اس عمر میں لڑکی سے عورت بن گئی۔ طوائفیت کا پہلا زینہ اس نے طے کرایا تھا۔ اور پھر وہ تیزی سے بڑھتی چلی گئی۔ اب تو وہ ایسی طاق بن گئی تھی کہ پیشہ ور طوائفوں کے بھی کان کاٹتی تھی۔ اسے عیاش مردوں کو خوش کرنے کے "گر" بھی معلوم تھے۔ معصوم جذباتی قسم کے نوجوانوں کو پھانسنے کے بھی۔ وہ اپنے آپ کو ہر طرح سے ڈھال سکتی تھی۔ ہر طرح کا روپ بھر سکتی تھی۔ وہ عیاش مردوں کے لئے تجربہ کار طوائف بھی تھی۔ بھولے بھولے نوجوانوں کے لئے ایک کم سن معصوم، پہلی محبت میں دھوکا دلانے والی لڑکی بھی اور بلا کی ریاکار اور عیار بھی تھی۔ اتنی کہ اس کی ریاکاری سچ بن جاتی تھی۔ وہ ابھی کسی کے سامنے گویا سچے دل سے خلوص اور محبت جتا رہی ہوتی۔ اور ابھی اس کے پیٹھ موڑتے ہی اس کی تحقیر اور مذمت کرنے لگتی۔ خود اسے بھی گو وہ رنجنا کی فطرت کی ایک ایک بات جانتا تھا۔ اُس کی ریاکاری کو عریاں دیکھا تھا۔ اور جو خود بھی ریاکار تھا۔ اُسے خود بھی دھوکا ہونے لگتا۔ اور وہ کبھی کبھی رنجنا کے اظہار محبت میں یہ محسوس کرتا۔ وہ واقعی اس سے سچی محبت کرتی ہے۔ وہ اتنے مردوں کے ہوتے کے باوجود اسی سے وابستہ ہے، وہ اسی کی ہے.... شاید رنجنا کی یہی بات یعنی دھوکے کو بالکل سچ کا روپ دینا، اور اپنی جھوٹی عارضی ہر دم بدلتی ہوئی، طوطا چشم محبت کو بالکل سچی محبت سا بنانے میں طاق ہونا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ رنجنا اتنے عرصے سے اس کی محبوبہ رہی ہے۔ ورنہ دوسری لڑکیوں کو تو وہ چند دنوں میں .... حالانکہ ان میں سے کئی ایک لڑکیاں خوبصورت بھی تھیں۔ اور رنجنا خوبصورت تو کیا کوئی خاص قبول صورت بھی نہیں.... فہرست میں نرملا کے نام پر اس کی نظر ایک لمحے کے لئے رکی۔ ایک لمحے کے لئے سرد اور پھر غم اس کے دل کے کسی گوشے میں دبک اٹھا۔ کیونکہ اس کی زندگی میں آئی ہوئی لڑکیوں میں صرف نرملا ہی تھی جس نے اس کے دل میں محبت کے پاکیزہ جذبات کو بیدار کر دیا تھا اور اسے اس نے سچی محبت سے آشنا کیا تھا۔ اور جب وہ اس کی زندگی سے یک لخت نکل گئی تھی۔ تو کافی عرصے تک سنبھل نہ سکا تھا.... لیکن یہ احساس صرف ایک لمحہ کے لئے تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس پر اس کے ضمیر کی بے حسی غالب آگئی۔ عرصہ ہوا اس کا ضمیر سو چکا تھا، شاید مر چکا تھا۔ اس کا دل زیادہ سرد زیادہ بے رحم ہوتا جا رہا تھا اور اس کی فطرت پر ریاکاری کی اور زیادہ تہیں چڑھتی جا رہی تھیں اس نے سینے سے شاید جذبات کے سرچشمے کو ہی سکھا دیا تھا۔ لیکن اس کی ناولیں رقت بھری جذباتیت سے بھرپور ہوتیں۔ شاید اس نے اپنے دل سے احساس اور جذبات کا آخری قطرہ بھی نچوڑ دیا تھا۔ اور یہ سب کچھ اپنے قلم میں منتقل کر دیا تھا اس کا دل جتنا زیادہ سرد ہوتا جاتا۔ وہ اپنی ناولوں میں الفاظ کے ذریعے اتنی ہی گرمی اتنی ہی حدت گھول دیتا۔

پاس والے کمرے سے اس کی بیوی کی چڑچڑی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔ شاید وہ بچے کو ڈانٹ رہی تھی۔ توبہ دن بدن کس قدر چڑچڑی اور بد مزاج ہوتی جا رہی ہے یہ عورت۔ اس نے نفرت سے اُس کمرے کی طرف نگاہ ڈالی۔ پھر سوچ کر وہ دل ہی دل میں ہنسا کہ اپنی بیوی کے چڑچڑے پن اور بد مزاجی کی آڑ لے کر تو وہ کھل کھیل رہا ہے۔ اگر اس کی بیوی خوبصورت اور خوش مزاج ہوتی تو لوگ اُس کی بے پروائی اور اُس کی بڑھتی ہوئی جنسی بدعنوانیوں پر اُسے مطعون کرتے۔ لیکن اب ..... اب اُس کے دوست احباب، اُس کے ملنے والے، اُس کے آرٹ کے پرستار دیکھتے کہ اس کی بیوی کس قدر ناقابل برداشت ہے۔ وہ جب ان کے سامنے اس کی خبر لیتی۔ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتی۔ ہر وقت بڑبڑاتی رہتی۔ اور وہ کچھ جواب دیئے بغیر نہایت مسکین بنا بیٹھا رہتا۔ یا خندہ پیشانی سے اس کی گھڑکیوں کا استقبال

کرتا اور ایک عفو بھری مسکراہٹ لبوں پر لئے اپنی بیوی کو دیکھتا
تو وہ سوچتے، واقعی یہ فرشتہ ہے فرشتہ۔ کتنا اچھا سلوک کرتا
ہے۔ اسے بیوی کیسی ملی ہے۔ کتنی بدمزاج ہے۔ پھوہڑ اور معمولی
صورت میں اتنے حساس اور اعلیٰ ذوق رکھنے والے آرٹسٹ
کو ایسی عورت ملی۔ اُس کا آدرش کتنا بلند ہوگا۔ ٹھیک ہی تو ہے
کہ وہ دوسری لڑکیوں اور عورتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ شاید
وہ ان میں اپنے آدرش کو ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اور آدرش ملنا مشکل
ہے۔ اور وہ ایک لڑکی سے مایوس ہو کر دوسری کی طرف متوجہ ہو جاتا ہو
پھر وہی مایوسی اور ۔۔۔۔۔ اس کی زندگی کتنی ٹریجک ہے ۔۔۔۔
جب نرملا اُس کی زندگی میں آگئی تھی۔ اور جب لوگوں نے نرملا کو اور
اس کی محبت کو دیکھا۔ تو کہا۔ اب اِسے اپنا آدرش مل گیا ہے۔ آرٹسٹ
اس دیوی کی پرستش کرے گا۔ اب وہ سیدھی راہ سے نہیں
بھٹکے گا۔ اُسے منزل مل گئی۔ اور جب نرملا کی شادی ہوگئی۔ اور
کچھ عرصہ اُس کے غم میں مبتلا رہ کر وہ اُسے تقریباً بھول چکا تھا اور
نئی نئی لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ تو شاید ان کو اپنی غلطی کا احساس
ہوگیا۔ اور اس کے بعد جب انہوں نے دیکھا۔ کہ وہ نہایت سستی
عام سی لڑکیوں سے بھی تعلقات قائم کرنے لگا ہے تو سب پر ظاہر
ہوگیا کہ وہ محض حظ اُٹھانے کے لئے ۔۔۔۔۔۔ اور اچانک سب
کی نظروں میں اُس کی وقعت جاتی رہی۔ اس کے دوست بھی اب
اس سے دور دور رہنے لگے ہیں۔ گو ایسے دوست جنہیں اس سے
غرض تھی اب بھی اس کے ساتھ ہر وقت رہتے۔ اس کی اتنی ہی
خوشامد کرتے۔ لیکن اب یہ ظاہر تھا کہ ان کی تعریفوں میں رسمیت
تھی، غرض تھی۔ ان کی نگاہوں میں بھی۔ اس نے دوری کو پڑھ لیا تھا
۔۔۔۔۔۔۔ اور پبلک ؟ اس سے محبت کرنے والی۔ اس کے آرٹ
کی پرستش کرنے والی پبلک ؟ اس پبلک کی نظروں سے اس نے
اپنے آپ کو چھپانے کی بہت کوشش کی۔ اس کے دور کے بہت
سے دوسرے ناولسٹوں، افسانہ نگاروں، شاعروں اور آرٹسٹوں کا سا
رویہ اس نے اختیار نہیں کیا تھا۔ جن کی ترقی پسندی آخر اس تان پر
ٹوٹی تھی۔ کہ سماج گندہ ہے۔ اس کے اصول، اس کی پابندیاں لوگوں

کو غلاظت میں دھکیل رہے ہیں۔ ہم بھی چونکہ اسی گندے سماج میں
رہتے ہیں۔ اس لئے اسی گندگی اور غلاظت میں آلودہ ہیں۔ تو کوئی
تعجب کی بات نہیں۔ یہ جنسی بھوک، ہمارے سماجی حالات کی پیدا کردہ
ہے۔ ہم بھی اس کے شکار ہیں۔ اسلئے اگر عورت ہمارے اعصاب پر
سوار ہے۔ ہماری جنسی زندگی بدعنوان ہے۔ اگر ہم یہ جنسی بھوک
مٹانے کے لئے عورت کا جسم خریدتے بھی ہیں تو یہ سماج کا، حالات کا
قصور ہے۔ جب تک یہ سماج، یہ نظام سرے سے نہ بدل جائے
جب تک اس فرسودہ عمارت کو ڈھا نہ دیا جائے اور اس کی بنیادوں
کو اکھیڑ نہ دیا جائے۔ ہم جنسی کجروی، بدعنوانیوں اور غلاظتوں کو
بے نقاب کرتے ہیں۔ اور ہم خود ہی اس غلاظت میں آلودہ ہیں تو کوئی
بات نہیں۔ کیونکہ وہ لوگ جن کی غلاظت بھری زندگی کو ہم بے نقاب کرتے
ہیں۔ ریاکار ہیں۔ اپنی داڑھیوں میں ہوس کو چھپائے گناہ کرتے ہیں۔
جھوٹی مذہبیت اور جھوٹے اخلاق کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں۔ ورنہ وہ
دراصل گندے ہیں۔ اُن کے جذبات گندے ہیں۔ ہم اُن کی ریاکاری کا
پول کھولتے ہیں۔ ہم تو باغی بن کر گناہ کرتے ہیں۔ لیکن وہ جرأت کے ساتھ
اعلانیہ گناہ کرنے کا قائل نہ تھا۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا لوگوں کی نظروں میں وہ
پاک رہے۔ اور وہ لوگوں کی نظروں میں دیوتا بنا رہا ۔۔۔ کسی کو اس کی
پرائیویٹ زندگی کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ بجز اس کے خاص
دوستوں کے اور ان لوگوں کے جنہوں نے اسے بہت قریب سے دیکھا
تھا۔ نیکی، انسان دوستی، انکسار، کسر نفسی اور خلوص کا مجسمہ، وہ ہر ایک
کو اپنی دوستی، ہمدردی اور اعانت کا یقین دلاتا۔ عام سے عام آدمی سے
بھی اسی اخلاق و محبت سے پیش آتا۔ سب اس کے گرویدہ تھے۔ اور اس
کے آرٹ کے پرستار پبلک کو اس کی ذات سے بھی بے حد، بے پناہ
عقیدت تھی۔ ان کی نظروں میں وہ دیوتا تھا ۔۔۔۔۔ لیکن اب،
اب ۔۔۔۔۔ کسی بھاری بوجھ نے اس کے دل کو مسل دیا۔ اس نے
اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اب وہ لوگوں کی نظروں میں
بالکل گر چکا تھا۔ ابھی ابھی ان پر اس کی پرائیویٹ زندگی کے راز کھلے
تھے۔ اور اس کا اثر اور ردِ عمل کتنا فوری ہوا تھا۔ آبادنگر کے واقعہ
کا خیال آتے ہی وہ کانپ گیا۔ شاید ہی کسی اور جگہ کے لوگ اس کے

آرٹ کی، اس کی ذات کی ایسی پرستش کرتے تھے۔ جیسے آباد نگر کے لوگ اسے وہاں انتہائی مقبولیت حاصل تھی ـ اور جب وہ پہلی مرتبہ آباد نگر گیا تھا۔ تو لوگ اُسے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑے تھے۔ اس کا کس گرمجوشی سے استقبال کیا گیا تھا۔ ان کی نظروں میں بے پناہ عقیدت تھی، اور جب وہ ان میں عام سے عام آدمی سے جس ہنس کر نہایت خوش اخلاقی سے ملا تھا۔ اور اپنے ضرب المثل انکسار سے ان کو یہ محسوس نہ ہونے دیا تھا۔ کہ وہ ایک مشہور آدمی سے باتیں کر رہے ہیں تو لوگوں کی نظروں میں عقیدت کی چمک اور بڑھ گئی۔ اور اُن کے دل جذبہ محبت سے معمور ہو گئے۔ لیکن جب وہ دوسری بار آباد نگر گیا تھا۔ اس خوبصورت شہر اور اس کے مضافات کی اچھی طرح سیر کرنے کے لئے اور اس شہر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے اپنی نئی محبوباؤں میں سے دو لڑکیوں کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ اس وقت بھی اس کے استقبال کے لئے لوگ جوق در جوق آئے۔ ایک دفعہ پھر ان کی عقیدت بھری نظریں اُٹھیں۔ لیکن ان دو سستی اور عام لڑکیوں کو اس کے ساتھ دیکھ کر جن کے سستے چھچھورے عشوؤں سے اور ناولسٹ کے پیشہ ور عاشقوں، کے سے انداز سے انہوں نے چند لمحوں میں تاڑ لیا تھا۔ کہ ان کے درمیان کیسے تعلقات ہیں، تو ان کے نظروں میں عقیدت کی چمک یکایک بجھ گئی۔ اور استقبال کی گرمجوشی سرد مہری میں تبدیل ہو گئی۔ پچھلی دفعہ جب وہ یہاں پر آیا تھا اسے بہترین جگہ پر ٹھہرایا گیا تھا۔ پارٹیوں پر پارٹیاں دی گئی تھیں کاروں اور ٹیکسیوں پر سیر کرائی گئی تھیں۔ ہر روز ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لوگ اس کے سامنے بچھے جاتے تھے۔ لیکن اس دفعہ جیسے اپنے آپ پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ نہ اس کی سیروں کے لئے ٹیکسیوں اور کاروں کا انتظام کیا گیا، نہ کوئی پارٹی دی گئی۔ یہاں تک کہ اس سے ملنے کے لئے کوئی بھی نہیں آتا تھا۔ اور اس کی شامت جو آئی تو ایک دو گھروں میں جہاں اسے بلایا گیا اس نے وہیں کی لڑکیوں پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے تو اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ اپنی جان بچانے کے لئے اسے وہاں سے بھاگ آنا پڑا تھا کسی نے اسے وقت پر آ کر بتا دیا تھا اس بات پر کہ وہ یہاں کی لڑکیوں کو پھانسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آباد نگر کے لوگ بپھر اٹھے ہیں کہ ایسا آدمی جو اپنے آرٹ کی مقبولیت اور اپنی شہرت سے فائدہ اٹھا کر شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو خراب کرتا ہے۔ گولی سے اُڑا دیئے جانے کے قابل ہے ......

اس نے اپنے لبوں پر تحقیر بھری مسکراہٹ لانے کی کوشش کی، ہمیشہ کی طرح یہ کہہ کر ٹال دینا چاہا، ہونہہ! کس قدر قدامت پرست تھے، یہ آباد نگر کے لوگ! لیکن مسکراہٹ اس کے لبوں پر نہ آ سکی۔ ایک سرد خوف نے اُسے سر سے پاؤں تک لرزا دیا...

یہ صرف آباد نگر کی ہی بات نہیں تھی۔ یہ مایوس کن حقیقت اس کے سامنے تھی کہ وہ خاص حلقوں میں تو گر ہی چکا تھا۔ اب تو عوام میں بھی اپنی مقبولیت کھو چکا تھا .... یہ مقبولیت حاصل کرنے کے لئے اس نے کیا کیا نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے آپ پر ایک خول چڑھا لیا تھا۔ میٹھی میٹھی باتیں، خوشامدیں، ریاکاری محبت اور دوستی کے اظہار کی فراوانی، حد درجہ انکساری اور اس کی یہ ایکٹنگ اتنی مکمل تھی کہ کسی کی نظر اس کے خول کے اندر پہنچ کر اصل آدمی کو دیکھ نہیں پائی تھی۔ اور وہ اپنی تحریروں پر بھی ایک خول چڑھا دیتا تھا۔ وہ ان میں انسانی محبت ہمدردی اور انسان دوستی کا بہت بڑا "ڈوز" دے دیتا تھا۔ اتنا بڑا کہ انسانی محبت اور ہمدردی سے اس کی تحریریں لبریز ہو کر چھلکتی نظر آتیں۔ اس نے یہ گُر ہمیشہ استعمال کیا تھا۔ اور یہی اس کی بے پناہ مقبولیت کا راز تھا۔ ورنہ اس کے کئی ہمعصر اس سے اچھے اور بلند پایہ فن کار تھے۔ جن کی تحریروں میں گھمبیرتا، ٹھوس پن اور گہرائی ہوتی تھی۔ لیکن اس کی تحریروں کی جوش بھری جذباتیت عام پڑھنے کے لئے اپیل رکھتی تھی۔ اور وہ سوچتے کتنا حساس آرٹسٹ ہے، اس کا دل انسانی محبت اور دردمندی سے لبریز ہے۔ وہ موضوع چنتے وقت بھی اس کا خاصا خیال رکھتا تھا کہ وقت کی نبض پر اور لوگوں کے دلوں پر بیک وقت ہاتھ پڑے یعنی گرما گرم موضوع، ایسے واقعات اور حادثات جن سے لوگوں کے دل اس وقت سب سے زیادہ متاثر ہوں، اور اس کا قلم

تونڈی کی سی روانی سے چلنے کا عادی تھا اور یہ گر اپنا کام کر جاتا۔ لوگوں کے دلوں میں عقیدت اور بڑھ جاتی، کہ یہ آرٹسٹ کس قدر حساس اور دردمند دل رکھتا ہے کہ جہاں کہیں بھی مظلوموں کو ظلم اور بہیمیت کا شکار ہوتے دیکھا۔ انسان کو مصیبت اور درد میں دیکھا بے حد متاثر ہو جاتا ہے۔ اور اس کا قلم خون بہانے کا عادی ہو چکا ہے۔ اور اس وقت بھی گرم گرم خون بہاتا ہے۔ جب اس کا دل برف کی طرح سرد اور منجمد ہو جاتا ہے لیکن لوگوں نے اب یہ جان لیا تھا کہ یہ رقت بھری جذباتیت تو اس کی سٹائل میں تحلیل ہو چکی ہے اور جوش اور ولولے اور درد میں ڈوبے ہوئے یہ الفاظ اور جملے تو میکانکی طور پر اس کے قلم سے نکل آتے ہیں۔ اور بہت سی قیافہ شناس نظریں اس کے خول کے اندر جا کر اصل آدمی کو دیکھ چکی تھیں۔ اور جنہوں نے اسے قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے قریب رہا کرتے تھے۔ اور وہ مداحوں اور دوستوں کے ایک بہت بڑے گروہ کو ساتھ رکھتا تھا۔ ان پر تو اس کی شخصیت کی یہ دورنگی صاف ظاہر تھی۔ حالانکہ اس نے اسے بھی اپنے آپ چھپانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن قرب نے اسے ظاہر کر دیا۔ اور پھر بہت سے دوست اس سے دھوکا کھا چکے تھے دوستی، محبت اور عنایتوں کی بوچھار کرتے کرتے وہ اندر ہی اندر دھوکا دے دیتا تھا۔ سو اب اس کے دوستوں کو بھی اس پر اعتبار نہیں رہا تھا اور یہ انکشافات، یہ باتیں آہستہ آہستہ پھیلتی گئی تھیں اور ان حالات میں، اس کی بڑھتی ہوئی جنسی بدعنوانیاں جواب علانیہ ہو چکی تھیں۔ ایک مرتبہ بھانڈا پھوٹ جانے کے بعد وہ کھلے طور پر اور زیادہ آزادی سے یہ سب کرنے لگا تھا۔ ان بڑھتی ہوئی عیاشیوں نے اور بھی کاری ضرب لگا دی تھی۔ اور جتنی تیزی سے وہ چڑھ کر بلندیوں پر پہنچ چکا تھا۔ اتنی ہی تیزی سے نیچے گر رہا تھا گرتا جا رہا تھا......

اس نے اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے سر کو اٹھا کر زور سے جھٹک دیا۔ وہ ان خیالات کو جن سے اسے ناقابل برداشت ذہنی کوفت ہو رہی تھی، پرے ہٹا دینا چاہا۔ ایک انداز خودسری سے تن کر بیٹھ گیا اور جھنجھلا کر کہا۔ "آخر یہ مشرقی لوگ اتنے تنگ نظر کیوں ہوتے ہیں اگر وہ عورتوں سے کھیلتا ہے ان سے حظ اٹھاتا ہے۔ تو کیا ہوا۔ آخر میں ایک آرٹسٹ ہوں، یہ لوگ ایک آرٹسٹ کی محض آرٹسٹ کی حیثیت سے قدر کیوں نہیں کرتے۔ اس کی پرائیوٹ زندگی سے کچھ سروکار رکھے بغیر......؟ لیکن، لیکن کیا اس کا آرٹ بھی گرتا نہیں جا رہا تھا؟" وہ اس حقیقت کو جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے پڑھنے والی وسیع پبلک میں سوائے ان کے جن کو کوئی ذوق نہیں تھا۔ اور جو اس کی بیکار سے بیکار چیز کو بھی ایک شاہکار سمجھ لیتے تھے۔ محض اس کے لئے کہ وہ اس کے قلم سے نکلی ہوئی تھی۔ ان لوگوں کو تو محض ایک جدت یا تکنیکی پینترا دے کر ہی مبہوت کر سکتا تھا۔ لیکن جو ذوق رکھتے انہیں یہ احساس ہو چلا تھا کہ اس کی تحریروں میں اب پہلی سی بات نہیں رہی۔ پہلی بات تو کیا کچھ بھی نہیں رہا۔ وہ خود بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کی تحریریں اپنے ظاہری حسن، رنگینی اور ظاہری گرمی کے باوجود نہایت پھیکی ہوتی جا رہی ہیں، کھوکھلی، بے روح اور بے اثر نہ ان میں فنی بلندی تھی نہ اثر تھا۔ فنی پہلوؤں پر توجہ دینے کے لئے تو اسے بہت کم وقت ملتا تھا۔ اور اس فنی بے مائیگی کو وہ نت نئی جدتوں اور تکنیکی پینتروں میں چھپانے کی کوشش کرتا۔ پھر بھی بات نہ بنتی۔ اور ان میں اثر اس لئے نہیں کہ ان میں خلوص نہیں ہوتا تھا۔ وہ خلوص کی اس کمی کو الفاظ کی بھرمار سے پورا کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اب جبکہ وہ "سرمایہ دار" بن چکا تھا۔ اس کا قلم اور زیادہ زور کے ساتھ سرمایہ داروں کو گالیاں دیتا۔ اور طبقاتی تفریق کی مذمت کرتا۔ اس میں سرمایہ دارانہ ذہنیت جتنی بڑھتی جاتی اس کی تحریروں میں "مزدور" اور "کسان" کی اور زیادہ رٹ ہوتی۔ اور وہ اپنے سرمایہ سے جتنی زیادہ لڑکیوں کے جسم خریدتا تھا۔ اور اپنی شہرت سے جتنی شریف لڑکیوں کو طوائفیت کا زینہ طے کراتا تھا۔ اتنا ہی زیادہ اس کی تحریروں میں عورت کی عصمت و عفت، اس کی معصومیت اور پاکیزگی کے احترام کی رٹ ہوتی۔ اس طرح الفاظ کے ذریعے اثر پیدا کرنا آسان تھا۔ اور اس طرح وہ عرصہ تک لوگوں کو اپنے خلوص سے دھوکا دیتا رہا تھا۔ لیکن وہ آخر کب تک دھوکا

دے سکتا تھا، کب تک۔ کب تک۔ اب تو یہ سب محسوس کرنے لگے تھے کہ اس کی تحریریں خلوص سے عاری ہیں اور وہ دن بدن پھیکی اور بے روح اور بے اثر ہوتی جا رہی ہیں۔

اس کی بیوی اب بھی چلا رہی تھی، اس دفعہ اس کی بدمزاجی اور عتاب کا ہدف شاید نوکر رہا تھا، کیونکہ آواز باورچی خانہ کی طرف سے آ رہی تھی۔ آخر اس کی بیوی کیوں دن بدن اتنی بدمزاج ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا ذمہ دار بھی تو وہی تھا۔ آج مدتوں بعد اس کا سویا ہوا ضمیر کچھ جاگا تھا۔ اور آج اسے اپنی بیوی سے بھی ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ وہ پہلے ایسی تو نہیں تھی۔ شادی سے چند مہینے پہلے وہ تو ایک بہت خوش مزاج لڑکی تھی۔ بات بات پر اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔ اور اس کا کشادہ دہانہ اور بھی کشادہ ہو جاتا۔ پھر بھی بھلا لگتا۔ لیکن اس نے برسوں سے اسے ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ اگر کبھی کبھار وہ ہنستی بھی یا مسکراتی بھی تو اس کی ہنسی میں اس کی مسکراہٹ میں کتنی تلخی ہوتی تھی۔ یہ تلخی اور زہر اسی نے تو بھرا تھا۔ شادی کے چند مہینوں بعد جب وہ پھر دوسری لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا، گو اس وقت وہ یہ بات اپنی بیوی سے چھپا کر کرتا تھا۔ لیکن وہ عورت تھی۔ اور اس نے کسی نہ کسی طرح سے پتہ لگا لیا تھا۔ پہلے وہ اس سے التجائیں کیا کرتی تھی۔ اس کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا کرتی تھی۔ لیکن اب اس نے دیکھا کہ اس کے شوہر کے سخت دل پر اس کی التجاؤں اور آنسوؤں کا ذرہ بھر اثر نہیں ہوتا تو اس میں خود اپنی توہین سمجھ کر اس نے رونا چھوڑ دیا۔ اور وہ اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔ اس میں اندر ہی اندر زہر سرایت کرتا گیا۔ اس کی وہ ہنسی مر گئی اور بدمزاج اور چڑچڑی ہو گئی اور وہ اپنے ملنے والوں اور دوستوں کو بتانے کے لئے اس زہر کو بڑھاتا گیا، اس کی بدمزاجی کو اور اکساتا رہا۔ وہ لڑکیوں کو کھلم کھلا اپنے گھر بلانے اور ساتھ لے آنے لگا۔ یہی نہیں وہ اسے ان لڑکیوں کی مہمان نوازی کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور اسے کرنی پڑتی تھی اور وہ خاموشی سے یہ سب کچھ برداشت کرتی تھی۔ لیکن یہ خاموشی کبھی طوفان بن جاتی دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے وہ سب پر بلا وجہ برس رہی ہے۔ اور اس کے دوست اور ملنے والے سمجھتے کتنی چڑچڑی اور بدمزاج ہے یہ عورت اور معمولی سی۔ ایک اتنے حساس اور اعلیٰ ذوق آرٹسٹ کو ایسی بیوی ملی ہے۔ اس کا آدرش کتنا بلند ہو گا۔۔۔ ٹھیک ہی تو ہے کہ وہ دوسری لڑکیوں کی طرف۔۔۔۔۔ انہیں کیا خبر تھی کہ یہ بدمزاج اور معمولی شکل والی عورت اس کے پلے باندھ نہیں دی گئی تھی۔ بلکہ اس نے اس سے باقاعدہ مہینوں عشق لڑا کر محبت جتا کر پھانسا تھا اور اس سے شادی کی تھی۔ اس لئے کہ وہ ایک دولت مند باپ کی بیٹی تھی۔ ۔۔۔۔۔

اس کی بیوی بھی اب چلّا چلّا کر ملازم کو گالیاں دے رہی تھی اور اس کا چلانا اچانک کلائمکس کو پہنچ گیا۔ وہ تاڑ گیا کہ اس کا چلانا اب عروج پر کیوں پہنچ گیا ہے؟ شاید رنجنا آ رہی تھی۔ اور اس کی بیوی نے رنجنا کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کی محبوباؤں میں سے رنجنا خاص طور پر اس کی بیوی کو چڑ تھی۔ ایک تو شاید اس لئے کہ اس کی دوسری محبوبائیں ہنگامی ثابت ہوتی تھیں۔ رنجنا گویا اس سے چمٹ گئی تھی اور جہاں دوسری لڑکیاں اس کی بیوی سے یا تو بے پروائی برتتیں یا نوآموز ہوتیں اسے دیکھ کر کچھ GUILTY سی محسوس کرنے لگتیں۔ لیکن رنجنا اس کی بیوی سے نہایت پیاری باتیں کرتی تھی۔ اپنے آپ کو یوں ظاہر کرتی جیسے وہ اس کی بیوی کی ہمدرد اور غمگسار ہو، اس کی بہترین دوست ہو اس کا قیاس ٹھیک نکلا، کیونکہ رنجنا دروازے کے لگے اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی، دلفریب اور دلنشیں اور دلربا مسکراہٹ جس سے مرد مسحور ہو جاتے تھے اور جو میکانکی ہونے کے باوجود فطری اور بے ساختہ معلوم ہوتی تھی جو بیسیوں مردوں پر اس فیاضی سے چھڑکی جانے کے باوجود ان میں سے ہر مرد یہی محسوس کرتا تھا کہ وہ مسکراہٹ صرف اسی کے لئے مخصوص ہے۔ اور رنجنا کی اس مسکراہٹ میں وہ اپنے پچھلے سارے اذیت دہ خیالات کو بھول گیا۔ رنجنا کی اس مسکراہٹ نے اس کے مدتوں بعد جاگے ہوئے ضمیر کو پھر تھپک تھپک کر سلا دیا۔ اور وہ سب کچھ بھول کر عورت کی مسکراہٹ، عورت کی خوشبو، عورت کے قرب میں کھو گیا۔۔۔

پھر اس نے رنجنا سے پوچھا۔ تو آج کیا پروگرام ہو گا، خوب گھومیں کسی شاندار سے ہوٹل میں کھانا کھائیں۔ اور سیکنڈ شو، اور، اور، اور

وہ ایک دلربایانہ انداز میں آکر اس کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔ "یونہی گھومنا۔ کچھ کام بھی تو ہو۔ میں پرسوں ...... سیٹھ کی دوکان پر گئی تھی۔ اس کے پاس ساڑھیوں کا نیا سٹاک آیا ہے ایک آبی رنگ کی جھین زرتار ساڑھی تو اس قدر خوبصورت تھی۔ میں کہہ آئی ہوں کہ میرے لئے رکھ دیں۔ دو تین دن میں لے جاؤں گی۔ میں تو تم سے یہ ساری لے کر رہوں گی۔ کب سے تمہارا وعدہ ہے۔"

آج تو تم جو کچھ بھی چاہو گی۔ تمہارے قدموں میں بچھا دیا جائے گا آج میں نے ایک شاندار ناولٹ ختم کیا ہے۔ واقعی بڑھیا چیز۔ بہت دنوں سے میں نے ایسی چیز نہیں لکھی تھی ...... "

"اوہ!" رنجنا نے یونہی اس کے سامنے سے مسودہ اٹھا لیا۔ اس کی نظر اختتامی پیراگراف پر پڑی۔ "اوہو! اپیل تو بڑی زوردار ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ تائب ہو رہے ہیں" ...... وہ شوخی سے مسکرا رہی تھی ......

وہ ہنسا ... تائب؟ ہا، ہا، ہا یہ تو بیکار افسانوں، ناولوں کی باتیں ہیں۔ رجنی ورنہ میں تو وہی ہوں، "رند کا رند" لیکن یہ کہتے کہتے اچانک اس کا چہرہ بجھ گیا۔ حالانکہ یہی جملہ وہ کئی بار رنجنا سے کہہ چکا تھا۔ اور رنجنا بھی صرف اس سے مذاق کے موڈ میں ایسی باتیں کرتی تھی طنز سے نہیں۔ رنجنا ان عورتوں میں سے تھی جنہیں طوائفیت کا چسکا لگ جاتا ہے۔ اس زندگی میں دھکیلنے پر وہ اس کی شاکی نہیں تھی۔ اس کے لہجہ میں طنز بالکل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن آج جانے کیوں رنجنا کا یہ جملہ اس کے دل میں چبھ سا گیا ...... وہ تیزی سے اٹھ گیا۔ "اچھا چلیں رجنی!" جاتے ہوئے وہ باورچی خانے کے پاس کچھ دیر کے لئے ٹھٹکے۔ قصداً اس کی بیوی کو اذیت دینے میں دونوں کو برابر لطف آتا تھا۔ اس کی بیوی نے پلکیں جھپکا کر نظریں اور نیچی کر لیں اور بہت دیر تک وہ بمشکل جو بنی نظریں جھکائے رہی۔ لیکن وہ خود بخود ان کی طرف اٹھ گئیں۔ رنجنا اس کے اور بھی قریب آگئی۔ اور اس نے مسکراتے ہوئے کنکھیوں سے رنجنا کی طرف دیکھا۔ اس کی بیوی چلائی "کس جانور سے پالا پڑا ہے۔ ترکاری تک ٹھیک سے نہیں چن سکتا" اور اس نے ترکاری کی رکابی کو زور سے ٹھوکر لگائی۔ رکابی دور جا کر پڑی۔ اور چنی ہوئی ترکاری ساری رسوئی میں بکھر گئی۔ نوکر حیرانی اور سہمی نظروں سے تینوں کو باری باری دیکھنے لگا۔ غصہ کے اس ابال کا سبب پہچان کر وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکرائے۔ اس کی بیوی نے ان کی معنی خیز نظروں کو دیکھا۔ ان کی مسکراہٹ کو محسوس کیا اور چپ رہی۔ وہ دونوں باورچی خانے کے اندر آگئے۔ اس نے مسکرا کر اپنی بیوی سے کہا۔ "بھئی آج تو قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ آج رات ہمیں کھانا نہیں ملے گا۔ اچھا بھئی باہر سے کھاؤں گا"

اس کی بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور رنجنا نے سموسوں کی پلیٹ پر نظریں جما کر کہا "بہن آج مجھے جلدی جانا ہے۔ ورنہ تمہارے ہاتھ کے بنے ہوئے سموسے کھائے بغیر نہ جاتی" ...... اس کی بیوی بدستور خاموش رہی۔ البتہ اس کا نچلا ہونٹ اس کے دانتوں میں آگیا تھا۔ اور تلخی اور کرب سے اس کا منہ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ اور اس کے چہرے پر حقارت، نفرت اور اندرونی درد و کرب کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ کتنی بدصورت نظر آ رہی ہے۔ وہ اس وقت! اس نے نفرت سے اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹا لیں۔ اور رنجنا کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ اور اس نے محسوس کیا کہ رنجنا بھی تو خوبصورت نہیں ہے اس کا دہانہ بھی چوڑا ہے۔ ہونٹ موٹے ہیں۔ اور اوپر کا ہونٹ تو بالکل سپاٹ ہے۔ غمزوں کے بغیر پھر بھی وہ ہونٹ ہر وقت ایک خوش رنگ لپ سٹک سے رنگے ہوتے تھے۔ اور ان پر ایک دل کش مسکراہٹ ہمیشہ کھیلتی رہتی تھی۔ اس کی بیوی کا چوڑا دہانہ تلخی سے ٹیڑھا ہو گیا تھا ورنہ دونوں کے خد و خال معمولی تھے۔ دونوں میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا۔ زندگی کی رنگینی نے رنجنا کے معمولی چہرے میں دلکشی اور رعنائی پیدا کر دی تھی اسے تازہ پھول کی سی شگفتگی دی تھی۔ زندگی کی تلخی نے اس کی بیوی کے چہرے کو مرجھا دیا تھا۔ اس کے معمولی چہرے کو بدصورت بنا دیا تھا اور اس نے سوچا، لیکن اس کی بیوی کے چہرے سے نفرت محسوس کرنے کی اور رنجنا کے چہرے میں دل کشی محسوس کرنے کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اس کی بیوی تھی اور رنجنا اس کی بیوی نہیں تھی۔ داشتہ۔ ہاں داشتہ ہی کی حیثیت تھی اس کی۔ لیکن داشتہ کس قدر ثقیل لفظ ہے۔ محبوبہ! اور محبوبہ کے لفظ کی لذت کو پوری طرح

محسوس کرتے ہوئے وہ رنجنا کی طرف مڑا۔ اور اپنے لہجے میں سارا پیار اور لاڈ بھرتے ہوئے کہا۔ "تو چلیں رجنی!"

"جاتی ہوں بہن، نمستے" وہ دونوں باہر نکل آئے اور اس کی بیوی کی آنکھوں سے پوری طرح اوجھل ہونے سے پہلے رنجنا اس سے بالکل قریب ہو گئی اور اس نے اپنا بازو اس کی کمر میں حائل کر کے اور قریب اسے کھینچ لیا۔ پھر گھر سے باہر نکلتے ہوئے اس نے اپنا بازو نکال لیا۔

باورچی خانے میں بچھے ہوئے ایک بوریے پر اس کی بیوی دھڑام سے گر گئی۔ اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کا سارا جسم سسکیوں سے دہلنے لگا۔ اور نوکر لڑکا جو نیا نیا آیا تھا حیران کھڑا دیکھ رہا تھا کہ آخر اس کی مالکہ کو اچانک ہو کیا گیا۔ ابھی اس پر رعب گانٹھ رہی تھی اور آنا بگڑ رہی تھی۔ اور اب اس کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رہی تھی!

رنجنا راستے میں چہکتی آ رہی تھی۔ اور وہ اس کے چہکنے سے اس کی دلنشیں مسکراہٹ سے اس کی نظروں کی شوخی، بےباکی اور سپردگی سے محفوظ ہوتا ہوا وہ بڑھا جا رہا تھا۔ وہ کچھ ہی دور گئے تھے کہ اچانک اسے اپنا ایک عزیز دوست دکھائی دیا جس سے وہ بہت مدت سے مل نہ سکا تھا۔ وہ حیرت آمیز مسرت سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ بھی انہیں کی طرف آ رہا تھا۔ دونوں نے مصافحہ کیا۔ "چلو گھر چلیں" لیکن اس کا دوست وہیں کھڑا باتیں کرتا رہا۔ پھر وہیں سے جانے لگا تو اس نے متعجب ہو کر کہا "گھر نہیں چلو گے؟ قریب ہی تو ہے اتنے عرصے بعد آئے ہو، میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔"

جب کوئی لڑکی اس کے ساتھ ہوتی تھی اور اس کے دوست آ جاتے تو وہ کچھ بے اطمینانی اور ناگواری کا اظہار کرتا۔ ان کی طرف زیادہ توجہ نہ دیتا۔ آج وہ رنجنا کو چھوڑ کر اس دوست کے ساتھ جانے کے لئے تیار تھا۔ کیونکہ وہ اسے بے حد عزیز تھا۔ اور مدت کے بعد ملا تھا۔ لیکن اس نے دیکھا اس کے دوست کے ہونٹوں پر ایک تحقیر اور طنز بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اس نے کہا "میں تو تمہارے ہی گھر آ رہا تھا۔ لیکن تمہیں شریمتی رنجنا کے ساتھ دیکھ کر سوچا یہیں سے باتیں کر کے چلا جاؤں گا۔ دیکھئے پھر کبھی آؤں گا موقع ہوا تو" اور وہ اس کے کچھ کہنے سے پیشتر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ وہیں کھڑا رہا۔ ساکت و صامت۔ جیسے اسے کسی سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اس دوست کی آنکھوں میں جن میں محبت، عقیدت اور جذبۂ پرستش ہوتا تھا، آج اجنبیت کیوں تھی۔ اور یہ دوست جو اس کے اخلاق کا اس قدر گرویدہ تھا۔ آج اس سے ایسا کیوں پیش آیا؟ وہ تو اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اور رنجنا کے بارے میں بھی وہ صرف یہ جانتا تھا کہ وہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔ اور وہ اسے یہاں وہاں کام دلا کر اس کی مدد کر رہا ہے۔ اسے سب کچھ کیسے معلوم ہوا۔ شاید دوسرے دوستوں نے .....

رنجنا نے پوچھا "ابھی تک کیوں کھڑے ہو؟" اور وہ غیر ارادی طور پر آگے بڑھنے لگا۔ کپڑوں کی دکانیں جوں جوں نزدیک آتی جاتی تھیں۔۔ رنجنا اور بھی بہک رہی تھی۔ اس کا اظہار محبت اور بھی نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس کی مسکراہٹ اور بھی دلنشیں ہوتی جا رہی تھی لیکن وہ بے حس سا ہو گیا تھا۔ یہ مسکراہٹ اس پر اثر نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ پھر اسی احساس نے جو ایک عرصے سے ابھر کر اسے ستایا کرتا تھا، جسے وہ ٹالنا چاہتا تھا۔ اور جو آج واضح ہو گیا تھا اور بھی شدت کے ساتھ اس کے دل اور ذہن کو جیسے شکنجے میں کس لیا۔۔۔ آج اس نے سب کچھ کھو دیا تھا۔ اپنے دوستوں کی محبت، اپنی بے پناہ مقبولیت، اپنی پوزیشن ..... اس کا آرٹ مر چکا تھا۔ اور وہ بلندیوں پر سے گر چکا تھا......

(طویل افسانے "دیپک راگ" کا ایک حصہ)

ایک انٹرویو

ذیل کا انٹرویو ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے نشر ہونے کے بعد آہنگ، قند، اور نقوش میں چھپ چکا ہے۔ لیکن ممتاز شیریں کی وفات کے بعد اُن کے مسوّدات میں اس انٹرویو کا جو مسودہ ہمیں ملا ہے اس میں بہت سی باتیں اضافی ہیں۔ لہٰذا اسے من و عن نقل کیا جا رہا ہے ——— ایڈیٹر

سوال نمبر ۱ ——— ادیب کی تحریریں اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہیں۔ آپ کا اپنا وجود اپنی تحریروں میں کن معنوں میں ہے؟

جواب ——— یہ آئینہ خانہ ہے، جہاں اپنی تحریروں کے آئینہ میں ادیب کا عکس دیکھا جاتا ہے۔

اتفاق سے میرے ایک افسانے کا نام "آئینہ" ہے۔ اسے اتفاق نہیں بلکہ لاشعوری کوشش ہی سمجھیے کہ یہاں آئینہ کو میں نے اس کے لفظی معنوں میں ہی نہیں بلکہ ایک علامت کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔

افسانہ آئینہ میں میں نے سوال کیا ہے:

"کیا آئینہ میں محض جسمانی رنگ روپ اور ظاہری خدوخال ہی نظر آتے ہیں یا اندرونی شخصیت کا اظہار بھی ہوتا ہے اور آئینہ میں باطن کا عکس بھی پیش ہوتا ہے؟"

ادیب کی تخلیق ان دونوں حیثیتوں میں ایک آئینہ ہوتی ہے اور اس میں اس کا ظاہری اور باطنی عکس ہوتا ہے۔ خواہ وہ اپنی تحریروں میں بذاتِ خود بنفسِ نفیس موجود ہو یا فن کار کا وجود، اپنے اندازِ نظر، اپنے تاثرات و تعصبات، اپنے معیار و اقدار اور اپنے تخلیقی وژن کے ساتھ غیر محسوس طور پر اپنی تحریروں میں حلول کر گیا ہو۔

میری تحریریں بھی انہیں معنوں میں آئینہ ہیں۔ چنانچہ میرے ابتدائی افسانے جو پہلے مجموعے "اپنی نگریا" میں شامل ہیں بڑی حد تک خود سوانحی ہیں۔ یہ ابتدائے سنِ بلوغت میں یعنی سترہ سال سے بیس سال تک کی عمر میں (۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک تین سال کے دوران میں) لکھے گئے تھے اور یہ بے شک ذاتی تجربوں کا عکس ہیں۔ البتہ دوسرے دور کے افسانوں میں یعنی دوسرے مجموعہ "میگھ ملہار" کے افسانوں میں میرا وجود صرف ان معنوں میں ہے کہ میرا اندازِ نظر، معیار و اقدار، تخلیقی وژن ان میں سموئے ہوئے ہیں اور سوائے ایک افسانہ "کفارہ" کے میرا ذاتی وجود ان میں کہیں نہیں ہے۔

سوال نمبر ۲ ——— آپ نے اپنی تحریروں میں کہیں یہ بھی کہا ہے کہ آپ کی کہانیاں آپ کے ذاتی المیوں کا عکس ہیں۔

جواب ——— یہاں میں آپ کے سوال کو ذرا سا درست کر لوں۔ آپ نے پوچھا ہے کیا میری کہانیاں میرے ذاتی المیوں کا عکس ہیں؟ نہیں معلوم آپ نے یہ تاثر کیسے لیا، میں نے "ذاتی المیے" نہیں، "ذاتی تجربے" کہا

ہے اور یہ تصحیح بہت ضروری ہے کیوں کہ اس سے جواب کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے۔ شاید آپ نے یہ تاثر میرے صرف ایک افسانہ 'کفارہ' سے لیا ہو جو ۱۹۶۲ء میں لکھا گیا تھا ایک ذاتی المیے سے متعلق ہے یہ سانحہ ۱۹۶۱ء میں اس وقت پیش آیا تھا جب میں بنکاک میں مقیم تھی، اسی لیے اس افسانہ کا پس منظر بھی جنوب مشرقی ایشیا کا ہے۔ اس اجنبی ماحول میں جب میں وطن سے بہت دور تھی، 'ہم وطنوں سے'، ہم مذہب احباب سے دور تھی' اپنے رشتہ داروں عزیزوں سے جدا ہو گئی تھی' موت میرے بہت قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔ موت کے قرب کے احساس کو میں نے اپنے وجود کی گہرائیوں میں محسوس کیا تھا بہت قریب آ کھڑی ہوئی تھی، لیکن موت مجھے چھوتے ہوئے میرے پاس سے گذر گئی اور تاوان میں اس ننھی سی زندگی کو ساتھ لے گئی۔ جو میرے اندر دھڑکتی تھی اور جو اپنی نشوونما کی ساری منزلوں میں میرے تصور میں واضح طور پر موجود تھی۔ بہت سی ماؤں میں اس تجربہ سے گذری ہوں گی لیکن میرا تجربہ میرے لیے صرف جسمانی درد و اذیت اور جذباتی غم و اندوہ کا تجربہ ہی نہیں بلکہ ایک گہرا روحانی تجربہ تھا۔

اس ایک سانحہ کے علاوہ میری ذاتی زندگی، خدا کے فضل و کرم سے المیوں سے دور ہی رہی ہے۔ یہ میں اپنی ذاتی زندگی کی بات کر رہی ہوں ورنہ اردگرد کی دنیا میں دکھ بھرے پڑے ہیں اور ساری دنیا آج ایک کربناک دور سے گذر رہی ہے اور ایک حساس فنکار کو اس کا اثر بھی قبول کرنا چاہیے جب میں نے باقاعدہ لکھنا شروع کیا' میری زندگی مسرتوں کی حامل تھی یہ تقسیم سے کچھ پہلے یعنی تین سال پہلے کی بات تھی اپنے وطن میسور کا خوشگوار ماحول تھا' نئی نئی شادی ہوئی تھی' نہایت موزوں' مناسب اور ہم ذوق شریک حیات ملے تھے میرے شوہر ڈاکٹر صمد شاہین بہت اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں انہوں نے میری صلاحیتوں کو پہچانا اور میری حوصلہ افزائی کی یوں میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔

میاں بیوی کی آپس میں محبت اور کامیاب اور خوشگوار ازدواجی زندگی ہی ان دنوں میرے لیے سب سے اہم حقیقت تھی۔ لہٰذا میرے پہلے مجموعے "اپنی نگریا" کے بیشتر افسانے اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ افسانے نئے ادب کے ان افسانوں کا ردِ عمل اور جواب بھی تھے جن میں جنسی افراط تفریط اور بے راہ روی کی بھرمار تھی۔

"شکست اور آندھی میں چراغ" کو آپ المیے کہیں تو یہ میرے ذاتی المیے نہیں بلکہ ذاتی مشاہدے ہیں میں نے دوسروں کی زندگی میں دکھ محسوس کیا اور یہ افسانے لکھے اور "آئینہ" میں غریب بوڑھی نانی بی کا المیہ ظاہر ہے کہ میرا ذاتی المیہ نہیں ہو سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ بوڑھی انا کی دکھ بھری زندگی غربت اور حسرتناک موت سے افسانہ کی "میں" کی شخصیت گہرا تاثر قبول کرتی ہے اور اپنے آپ میں مگن خوشی سے سرشار یہ "نرگسی" لڑکی جب زندگی کے غم سے آشنا ہوتی ہے تو اس کی شخصیت نشوونما پاتی رہے۔

سوال نمبر ۲ ——— آپ نے پوسٹ گریجویٹ ریسرچ کے لیے خاتون ناول نگار ایملی برونٹے کی "وودرنگ ہائٹس" کا انتخاب کیا اور اب آپ منٹو پر تنقیدی کام مکمل کر رہی ہیں۔ منٹو جو سوگندھی اور موزیل کے دکھوں پر چیخ چیخ اٹھتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے آپ کی معروف کہانی "کفارہ" منٹو پر آپ کے مضامین اور ریسرچ کے لیے ایمل برونٹے کا انتخاب ایک ہی سلسلہ کی کڑی ہیں۔ یعنی صنف لطیف کی طرفداری۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب ——— آپ کے سوال کا براہ راست جواب دینے سے پہلے میں ایملی برونٹے پر پوسٹ گریجویٹ ریسرچ کے سلسلے میں مختصر سا پس منظر بیان کر دوں۔ ایملی برونٹے پر کام میں نے کوئی ڈگری حاصل کرنے کے لیے شروع نہیں کیا تھا بلکہ ان پر لکھنے کی ترغیب ہی یوں ہوئی تھی کہ میں نے ایملی برونٹے سے ایک یگانگت' ایک affinity سی محسوس کی تھی اور "وودرنگ ہائٹس" سے میں متاثر تھی۔ اتنی گہری محبت جو موت اور ابدیت کی حدوں کو پار کر جائے، "وودرنگ ہائٹس" میں ایملی برونٹے سے زیادہ شدت کے ساتھ اور کس نے پیش کی ہے؟

میں نے انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے دوران ہی میں ایملی برونٹے پر چند باب لکھ لیے تھے حالانکہ کراچی یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں ایملی برونٹے کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ یہ چند باب اور دوسرے ناول ادیبوں پر میرے انگریزی مضامین اسی دوران میں نے آکسفرڈ بھیجے تھے اور وہاں مجھے عارضی داخلہ مل گیا۔ یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ میں برٹش کونسل سکالرشپ پر پوسٹ گریجویٹ ریسرچ کے لیے آکسفرڈ گئی۔

آکسفرڈ میں لارڈ ڈیوڈ سیسل بھی انگریزی ادب کے پروفیسر

تھے جو میری نظر میں ایمیل برونٹے کے سب سے اچھے نقاد تھے اور جن کی حساس تنقیدوں سے میں بہت متاثر تھی۔ اپنے ٹیوٹر پروفیسر بیامبرڈ کے توسط سے میں نے ایمیلی برونٹے پر اپنے مضامین لارڈ ڈیوڈ سیسل کی خدمت میں پیش کیے اور ان کی ہدایات اور مشوروں سے مستفیض ہو کر میں نے ایملی برونٹے پر اپنا مونوگراف (FROM HAVENS' ASTERN") تقریباً مکمل کر لیا۔

چنانچہ آپ کے سوال کے جواب میں عرض یہ ہے کہ خواہ لارڈ ڈیوڈ سیسل ہوں کہ شہرۂ آفاق نقاد ایف۔ آر۔ لیوس ایملی برونٹے کو محض خاتون ناول نگار کی حیثیت سے نہیں دیکھتے۔ بلکہ وہ یہ لکھتے ہیں کہ برخلاف دوسری خاتون ناول نگاروں کے جن میں اسم ناول نگار جین آسٹن بھی شامل ہیں جو خالص نسائی ناول نگار تھیں اور سماجی اور ذاتی رشتوں کے بارے میں لکھتی تھیں ایملی برونٹے کی جینئس مردانہ تھی اور ان کے موضوعات نسائی نہیں تھے بلکہ موت و حیات، ابدیت، خیر و شر کی کشاکش انسانی زندگی کے کائناتی عناصر سے رشتے اور معاشرتی نظام کے ساتھ کائناتی نظام، ان سب موضوعات کو انہوں نے "وودرنگ ہائٹس" میں پیش کیا ہے اور خود ایملی کی شخصیت وودرنگ ہائٹس کے ہیرو اور ہیروئن ہیتھ کلف اور کیتھرین دونوں میں بٹی ہوتی ہے۔ وودرنگ ہائٹس صنفِ لطیف کا ناول نہیں ہے اور محض خاتون ناول نگار ہونے کی بنا پر میں نے ریسرچ کے لیے ایملی برونٹے کا انتخاب نہیں کیا تھا۔

اسی طرح منٹو پر کتاب لکھنے کا خیال مجھے اسلیے نہیں آیا تھا کہ منٹو نے اپنے نسوانی کرداروں کو بلکہ طوائف تک کو ہمدردی سے پیش کیا ہے منٹو نے اگر سوگندھی اور سلطانہ، موزیل اور ممی میں اصل عورت کو اجاگر کیا ہے تو ایشر سنگھ اور بابو گوپی ناتھ اور شیام کے سے مرد کرداروں کو پیش کرتے ہوئے پڑھنے والوں کے دلوں میں پوری دردمندی اور محبت کا بیدار کیا ہے جیسے منٹو نے بلا امتیاز اپنے سارے مرد اور عورت کرداروں کو ایک صف میں کھڑا کیا ہے اور پلٹ کر ہم سے یہ پوچھا ہے۔

"انہیں دیکھو، بے شک یہ سب گنہ گار ہیں لیکن
کون ہے جو ان پر پہلا پتھر اٹھا سکے؟"

منٹو کے ہاں عورت کے تصور کے بارے میں میں نے جو باب لکھے ہیں مثلاً ترغیبِ گناہ اور کفارہ گناہ، ان میں بھی میں نے عورت کی طرفداری نہیں کی ہے بلکہ اس کے برخلاف یہ ثابت کیا ہے کہ ہمارا معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے، عورت مجبور ہے ورنہ عورت میں بدی کی قوت اتنی ہی ہے جتنی کہ مرد میں بلکہ اس سے زیادہ ہے اور عورت خود ترغیب مجسم ہے۔ کسی معاشرہ کی اخلاقی بلندی یا پستی کا انحصار عورت کی اخلاقی بلندی یا پستی پر ہے۔

البتہ عورت کو ماں کے روپ میں، میں ایک بلند تر اور مقدس ہستی سمجھتی ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عورت میں ماں بھی ہوتی ہے اور طوائف بھی۔ نفسیاتی ماہروں نے عورت کا یہ تجزیہ کیا ہے اور اس حقیقت کو ہمارے ادب میں منٹو سے بہتر اور کس ادیب نے پیش کیا ہے؟

منٹو ایک سچا اور بے باک فنکار تھا ایک آگ تھی جس میں وہ مسلسل تپتا رہتا تھا۔ منٹو کے افسانوں میں بلا کی جان ہے اور ان کا تاثر ہر سطح کے پڑھنے والے قبول کرتے ہیں یوں تو میں نے بہت سے افسانہ نگاروں کا اپنے مضامین میں جائزہ لیا ہے لیکن منٹو کو ایک کتاب کا موضوع اس لیے بنایا ہے کہ میری نظر میں منٹو آج بھی ہمارا نمائندہ اور بہترین افسانہ نگار ہے۔

سوال نمبر ۴ —— آپ کی نظر میں آپ کے سب سے اچھے تنقیدی مضامین کون سے ہیں؟

جواب —— ابتدائی مضامین میں "تکنیک کا تنوع" میرا سب سے اچھا جامع اور سیر حاصل مضمون ہے۔ یہ مضمون میرے تنقیدی مضامین کے مجموعے "معیار" میں شامل ہے اور آج بھی اس موضوع پر ایک قابلِ قدر مضمون سمجھا جاتا ہے۔ لیکن عملی اور تخلیقی تنقید کے سب سے اچھے نمونے منٹو پر میرے متفرق مضامین ہیں۔ ان میں میں نے اپنے مخصوص تاثراتی اندازِ نقد سے ہٹ کر نفسیاتی زاویۂ نظر سے جائزے لیے ہیں۔ منٹو پر لکھتے ہوئے میں جنسی نفسیات پر بہت کچھ پڑھا، فرائیڈ، ہیولاک ایلس سے لے کر کنسے رپورٹ (Kinsey Report) سیمون ڈی بووار کی دوسری جنس اور کولن ولسن تک کیوں کہ منٹو کے افسانے جنسی نفسیات کے مطالعے کے لیے بہت اچھا مواد فراہم کرتے ہیں۔ یہ مضامین دراصل منٹو پر میری زیرِ تحریر کتاب "نوری نہ ناری" کے چند باب ہیں۔

یہ کتاب میں نے اس وقت لکھنی شروع کی تھی جب منٹو زندہ تھے اور منٹو کی زندگی ہی میں اس کے دو ابتدائی باب " یہ خاکی اپنی فطرت میں " اور " ترغیب گناہ " رسالہ " سویرا " میں شائع ہو چکے تھے ۔ منٹو نے انہیں پڑھا تھا اور بے حد پسند کیا تھا ۔ دو اور باب لکھنے کے بعد میں نے لکھنا چھوڑ دیا اور یہ کتاب افسوس ہے کہ ادھوری رہ گئی ۔ منٹو کی موت کے بعد سے اب تک اس کتاب کا مکمل نہ کرنا میرے لیے ایک احساس جرم بن گیا ہے ۔

منٹو پر یہ کتاب اگر مکمل ہوتی یا مکمل کرنے کی اب بھی مجھے توفیق ہو اور خدا کرے کہ ہو ' تو اپنے افسانہ کفارہ کے ساتھ یہ بھی میری سب سے اچھی تخلیق ہوتی کیوں کہ میں اچھی تنقید کو بھی تخلیق کا درجہ دیتی ہوں ۔

سوال نمبر ۵ ——— آپ کا یہ خیال کہ اچھی تنقید بھی تخلیق کا درجہ حاصل کر سکتی ہے بالکل بجا ہے ۔ ویسے آپ کے افسانوں میں آپ بہترین تخلیق کسے سمجھتی ہیں ؟

جواب ——— افسانہ کفارہ کو میں اپنی بہترین تخلیق سمجھتی ہوں ۔ میری خاص مرکزی تھیم نے اس افسانے میں فنی تجسیم پائی ہے جو منٹو پر چند مضامین کی مرکزی تھیم بھی ہے اور وہ یہ کہ عورت میں حوا بھی ہوتی ہے اور مریم بھی ۔ عورت " ترغیب گناہ " بھی ہے ، کفارہ گناہ بھی اور عورت مریم ، ازلی ماں کے روپ میں حوا کے بنیادی گناہ کا کفارہ ادا کرتی ہے ۔

کفارہ کا اصل افسانہ (THE ATONEMENT) کے نام سے میں نے انگریزی میں لکھا تھا ۔ اس افسانہ کا موضوع ، مزاج ، فضا کچھ ایسی تھی کہ بے ساختہ معانی سے بھرپور انگریزی جملے میرے ذہن میں آتے رہے اور انگریزی میں اظہار کی یہ آمد افسانے کے کا نکائی آغاز سے لے کر آخر تک قائم رہی ۔ اردو کفارہ میں وہ بات نہیں آنے پائی جو اصل انگریزی (THE ATONEMENT) میں ہے ۔

برخلاف میرے طویل افسانے " میگھ ملہار " کے جس کے اسلوب کی شعریت اور علمیت کے اظہار میں بعض لوگوں کو تصنع نظر آتا تھا ۔ کفارہ کی شعریت ، گہری رمزیت اور علمیت افسانہ کے اندر سے ابھری ہیں ۔ کفارہ ایک مکمل " مربوط " یکائی ہے اور اس کا جذباتی اور روحانی تاثر بہت گہرا ہے ۔

مونالزا کی مسکراہٹ کی طرح کفارہ کی کئی توجیہات اور تاویلیں ہوئی ہیں ۔ چنانچہ انتظار حسین نے ایک مضمون میں لکھا " کفارہ روح کی اوڈیسی ہے " ۔ محمد سلیم الرحمٰن نے اسے کیا کنواری کے راستہ کا کٹھن سفر کہا ہے اور یہ کہ اس کرب ناک دور میں زمین ایک مسیحا کی تخلیق کے لیے کوشاں ہے لیکن اتنی خوں ریزی اور کرب و اذیت کے بعد بجائے مسیحا کی موت کی تخلیق ہوتی ہے یہ سب تاویلیں اپنی جگہ درست ہیں کیوں کہ کفارہ ایک تہ دار افسانہ ہے ۔ ایک سطح پر یہ اپنے نوزائیدہ بچے کی موت ' مجروح ممتا اور خود اپنی موت کے قرب کے احساس کا افسانہ ہے ۔ دوسری سطح پر یہ حقیقتاً ایک روح کا سفر ہے ۔ اپنے وجود کی تلاش ، خود معائنہ ، عرفان ذات ، نجات کی آرزو ، نفس مطمئنہ کی ، روشنی کی جستجو ، یہ میرے لیے ایک روحانی واردات تھی لیکن ایک ذاتی المیے کی حیثیت سے بلند کر کے میں نے اسے ایک آفاقی حیثیت دینے کی کوشش کی ہے ۔

تو پہلے افسانے " انگڑائی " کی " نرگسی " لڑکی کفارہ کی عرفانِ ذات کی منزل تک آ پہنچی ہے ۔

سوال نمبر ۶ ——— ڈاکٹر ژواگو کے اس قول کی روشنی میں جو آپ نے اپنے افسانوں کے انگریزی ترجموں کے مجموعے ——— (FOOT FALLS ECHO) کے پیش لفظ نقل کیا ہے کہ " فن موت پر غلبہ حاصل کرنے کی ایک کوشش ہے " ۔

آپ کا اپنے فن کے بارے میں کیا نظریہ ہے ؟

جواب ——— ڈاکٹر ژواگو میں پیاسترناک کا یہ قول میں نے اپنے افسانے " میگھ ملہار " کی توجیہہ میں نقل کیا تھا ۔ میرے طویل افسانے میگھ ملہار کے چاروں حصوں کی یہی مرکزی اور مشترکہ تھیم ہے کہ فن موت پر فتح پانے کی ایک کوشش ہے ۔ فنکار حیات جاودانی پاتا ہے اس کی محبت ، اس کا فن اور وہ خود امر ہے ۔ یہ حقیقت میں نے مختلف تہذیبوں کی اساطیر اور دیو مالاؤں کے ذریعہ پیش کی تھی ۔ اساطیر در اصل زندگی ہی کی گہری حقیقتوں کو رومانی ، جمالیاتی اور علامتی انداز میں اجاگر کرتی ہیں ۔ دنیا میں عظیم ادیبوں نے حیات جاوداں پائی ہے ۔ اپنی موت کے بعد بھی وہ صدیوں سے زندہ ہیں ۔

لیکن اپنے ملک میں یہ کتنے ادیبوں کے بارے میں اور خصوصیت سے موجودہ

دور کے کتنے ادیبوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے، کوئی غالب و میر ہوں، کوئی اقبال ہوں تو اور بات ہے۔ ورنہ آج منٹو کو بھی لوگ بھولتے جا رہے ہیں اس منٹو کو جس نے اپنا کتبہ لکھا تھا: "منوں مٹی کے نیچے دفن منٹو یہ سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار یا خدا؛

فن یقیناً موت پر فتح پانے کی ایک کوشش ہے لیکن میں اپنے فن کے بارے میں اتنا بڑا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

تعصّبات

مصنف : فتح محمد ملک

قیمت : ۱۶/- روپے

ناشر : مکتبۂ فنون، لاہور

دورِ حاضر کے جواں سال نقاد فتح محمد ملک کی تنقیدی کاوشوں کا مجموعہ تعصّبات مارکیٹ میں آیا ہے۔ یہ مجموعہ ان مضامین پر مشتمل ہے جو فتح محمد ملک نے ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۳ء کے دوران لکھے۔

فتح محمد ملک کا تعلق تلہ گنگ ضلع کیمبلپور سے ہے اور وہ تدریس کے پیشے سے متعلق ہیں۔ کئی سال قبل یہ انکشاف میرے لیئے باعثِ تعجب ہوا تھا کہ وہ تلہ گنگ جیسے دور افتادہ شہر کے رہنے والے ہیں اور ساتھ ہی اردو کی ہردلعزیزی اور جہاں داری پر مسرت بھی ہوتی تھی۔

قومی بحران کے اس پُرآشوب دور میں فتح محمد ملک ایک ایسے نقاد کی حیثیت سے ابھرے ہیں جسے اپنے تہذیبی سانچے بہت عزیز ہیں، اور جو بہت سے ترقی پسند نقادوں کے برخلاف خود کو ایک مسلمان نقاد کہتے ہوئے بالکل نہیں جھجکتا۔ اس حقیقت کا اعتراف مصنف نے کتاب کے ابتدائیہ میں صاف اور واضح الفاظ میں اس طرح کیا ہے۔

میں اس ترقی پسند روایت پر ایمان رکھتا ہوں جو ولی، میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور ندیم سے ہوتی ہوئی نئی نسل تک پہنچی ہے جو ہماری ادبی اور تہذیبی روایات سے پھوٹی ہے اور جس کے ناز پروردگان کی عالمگیریت قومی وجود کے اثبات سے مجروح نہیں ہوتی بلکہ منفرد رنگ و آہنگ اخذ کرتی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے مضامین کو مصنف نے خود دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے حصہ کے زیادہ تر مضامین نظریاتی تنقید کے ذیل میں آتے ہیں اور دوسرے حصہ کے تقریباً تمام مضامین پر عملی تنقید کا اطلاق ہوتا ہے۔

کتاب کی ابتدا جس مضمون سے ہوتی ہے اس کا عنوان ہے "ہماری قومی زندگی اور ادیب" میں اس مضمون کو زیرِ نظر مجموعہ کا سب سے اہم مضمون قرار دیتا ہوں کیوں کہ اس کے مطالعہ کے بعد ہی مصنف کے ان مخصوص نظریات کا واضح طور پر علم ہو جاتا ہے جو اس نے ادب اور ادیب کے بارے میں قائم کر رکھے ہیں۔ مصنف کے نزدیک ترقی پسندی کا یہ مفہوم نہیں کہ خواہ مخواہ اگلی پچھلی مذہبی اور قومی روایتوں کے خلاف بغاوت کا چراغ روشن کیا جائے اور عام قاری کی ذہنی سطح کو قطعی طور پر نظر انداز کر کے شاعری کو خالصتاً ایک ذاتی چیز بنا دیا جائے۔ آخر ادب تعمیر و تہذیب اور ابلاغ کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ اسے ذہنی عیاشی اور لذت کوشی کا ذریعہ سمجھنے والے اپنی سماجی اور اخلاقی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ فتح محمد ملک پاکستان کے ادیبوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہندی اور یونانی دیومالا سے استفادہ کرنے کی بجائے اپنی فکری رہنمائی کا سرچشمہ اپنے مذہب اور اپنے سماج کی روایات میں تلاش کریں گے اور اگر ایسا نہیں ہوگا تو یہ پاکستان جیسے نظریاتی ملک کی بہت بڑی بدقسمتی ہوگی۔

اس حصہ کا دوسرا مضمون بعنوان "تحریکِ آزادی اور ادیب" کا حصہ معنوی طور پر بڑی حد تک پہلے مضمون سے وابستہ ہے کیوں کہ اس میں سرسید، اکبر الٰہ آبادی، اقبال، فیض، احمد ندیم قاسمی اور دیگر ادیبوں کی تخلیقات کے ایک مخصوص پہلو کا اسی نظریۂ فن کی

روشنی میں جائزہ لیا ہے جو پہلے مضمون میں پیش کیا گیا ہے۔

اس حصہ کے چار دوسرے مضامین اس لحاظ سے اہم اور اچھوتے ہیں کہ وہ ہمارے ادب کے جدید ترین رجحانات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان مضامین کے عنوانات ہیں۔ "نئی شاعری اور جدید شاعری" "شاعری اور نانشاعری" "غزل اور نئی غزل" "افسانہ اور نیا افسانہ"۔

زیر تبصرہ کتاب کے دوسرے حصہ میں غالب۔ اقبال۔ فیض۔ میراجی اور احمد ندیم قاسمی کے علاوہ مختار صدیقی۔ ضیاء جالندھری۔ ا د جعفری اور منیر نیازی کی شاعری کے ان پہلوؤں کا تجزیہ کیا گیا ہے جو مصنف کی نظر میں توجہ کے قابل ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے میں اس کتاب کو یوں بھی اہمیت دیتا ہوں کہ نئے ادب اور نئی نسل کے شعراء کے بارے میں اب تک جو کتابیں دیکھنے میں آئیں ان میں جانبداری کی بو محسوس ہوتی ہے کیوں کہ ان کتابوں سے بیشتر کے مصنفین خود اسی طبقہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں البتہ فتح محمد ملک کی زیر نظر کتاب غالباً ایسی پہلی کتاب ہے جو نئی شاعری کے سلسلے میں تقابلی مطالعہ کی صورت پیدا ہو گئی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ان افراد کے لئے خاص طور پر بصیرت افروز ثابت ہو سکتی ہے جو ادب یا تاریخ ادب کے مطالعہ یا ان کی تدریس سے متعلق ہیں۔

فتح محمد ملک تنقید ہی کا نہیں بلکہ تحریر کا بھی ایک مخصوص اسلوب اپنے لئے متعین کر چکے ہیں۔ ان کے اسلوب میں تازگی، توانائی اور دلکشی ہے۔ پھر جن ترقی پسند نقادوں سے ان کا نظریاتی اختلاف ہے ان پر چبھتے ہوئے لیکن معنی خیز فقرے ان کے اسلوب کی شگفتگی میں اضافہ ہی کر دیتے ہیں۔

ندیم کی شاعری

مصنف: جمیل ملک
قیمت: ۱۶۰۰ روپے

ناشر: نوید پبلشرز۔ راجہ سٹریٹ راولپنڈی

جمیل ملک صاحب عصر حاضر کے شعراء میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں اب تک علمی اور ادبی دنیا میں انہیں ایک شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا لیکن "ندیم کی شاعری" جیسی تنقیدی کتاب شائع کر کے انہوں نے ہمیں چونکا دیا ہے۔ ہر عہد میں ادب و شعر کے بارے میں شعراء کے اپنے مخصوص نظریات رہے ہیں لیکن ایسی مثالیں کم ملتی ہیں کہ کسی شاعر نے باضابطہ طور پر اپنے نظریات کا اظہار کیا ہو اور ان کی روشنی میں اپنے ہم عصروں کی تخلیقات کا جائزہ بھی لیا ہو۔ ماضی میں ایسے ادیبوں میں حالی اور شبلی ممتاز نظر آتے ہیں اور حال میں علی سردار جعفری، عابد علی عابد، فراق گورکھپوری، ڈاکٹر وزیر آغا، فیض اور احمد ندیم قاسمی کے نام خاص طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اب جمیل ملک بھی اس فہرست میں شامل ہوا چاہتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں جمیل ملک نے احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور فن کا بڑی محبت اور خلوص سے جائزہ لیا ہے۔ اس محبت اور خلوص کے باوجود یہ کتاب "کتاب المناقب" نہیں ہے کیوں کہ اس میں جو مضامین شامل ہیں وہ کسی وقتی اور عارضی جذبہ کے تحت نہیں لکھے گئے بلکہ ندیم کی شخصیت اور فن سے ۲۵ برس کی رفاقت، وابستگی اور مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ ندیم سخن سنج بھی ہیں اور سخن شناس بھی، ان کی شخصیت اور فن سے بے پناہ عقیدت اور محبت کا یہ اثر بھی قابل دید ہے کہ آج جمیل ملک بھی ان دونوں صلاحیتوں کے حامل ہیں۔

جمیل ملک نے اپنے مضامین کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ندیم کی شخصیت اور فن کے ارتقاء کی تمام تاریخی اور تدریجی منازل خود بخود ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ ندیم کی شہرت اور مقبولیت کی ابتداء ۱۹۴۲ء میں ہوئی جب کہ ان کے قطعات کا مجموعہ "دھڑکنیں" ادبی دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور آج صرف قطعہ گو یا رباعی گو ہی نہیں بلکہ جدید نظم اور غزل کے شاعر کی حیثیت سے بھی وہ برصغیر کے منفرد اور عظیم شاعر ہیں۔ مصنف نے ندیم کے قطعے، رباعی، غزل اور نظم کا بالترتیب جائزہ لیا ہے اور تاریخی، تہذیبی، سائنسی، نفسیاتی، مارکسی، جمالیاتی غرض ہر اس پہلو سے جس سے تنقید ممکن ہے۔ ندیم کی شخصیت اور فن کا تجزیہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب ہمارے تنقیدی سرمایہ میں ایک اہم اضافہ ہے۔

شمیم نعمانی

• مقالے

شعر سازی	رضا ہمدانی
رسوا پر ایک شاخسانہ	میمونہ انصاری
اردو تنقید کا ارتقاء	آغا سہیل
احمد ندیم قاسمی	خالدہ شوکت
پنجابی ادب دی کہانی اور ہندکو	مختار علی نیّر

• افسانے

شیشے کا گھر	انور خواجہ
نئے سقراط	رشیدہ رضویہ
بیتی بات	سائرہ ہاشمی
ایک سوال، ایک ہزار سوال	رباب عائشہ
تیسرا تاریک موڑ	انجم انصار

• افسانے کا مطالعہ

دو موریہ پل کا انجینئر	مشتاق قمر
حق مغفرت کرے	زہرہ جبیں
گلو بادشاہ	خالدہ ملک

آوازوں کے مگرمچھ (افسانہ)	منصور قیصر
آوازوں کا بھنور (ڈراما)	منصور قیصر

• آئینہ (منصور قیصر کی شخصیت اور فن)

شتر مرغ	میرزا ادیب
شتر مرغ کا تجزیہ	اسرار زیدی

• منظومات

نظم	مجید امجد، فارغ بخاری
ہم مومنوں میں سے تھے	سرمد صہبائی
ایبخلا : ایبخلا	سرمد صہبائی
میں گنبد بلکتی ہوں	سرمد صہبائی
کہانی کا آج (طویل نظم)	ناصر شہزاد
میری مجبوری	صفدر سلیم سیال
گونگے عمل کا نوحہ	اعجاز راہی
لہو زنگ	جوہر میر

• ڈراما

پیاسا سمندر	جلیل حشمی

غزل گو: شیر افضل جعفری، قتیل شفائی، جعفر شیرازی، شاہین، محسن احسان، رؤف شیخ، اشرف بخاری، اکبر کاظمی، احمد رئیس، راشد مفتی، شمیم مناروی، نرگس ناہید، سعیدہ ہاشمی، صابر ظفر، سہیل اختر، شجاعت علی راہی، ریحانہ قمر، صابر آفاقی، انجم الحسن نجمی، رب نواز مائل اور دوسرے

آفسٹ کی بے داغ طباعت : دو صد صفحات ـــ قیمت : ۴/- روپے

ناشر: پریمیئر شوگر ملز مردان

ذیلی دفتر : ۴۲۷ - الف، ظہیر آباد، چارسدہ روڈ، پشاور

Regd. P. No. 12

Monthly QAND

MARDAN.

ادارۂ قند مردان فلم ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ان فنکاروں کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے جنہیں صوبہ سرحد کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پاکستان آرٹسٹس ایکویٹی (سرحد) رجسٹرڈ کی طرف سے سن ۱۹۷۳ء کے سرحد ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں پاکستان آرٹسٹس ایکویٹی (سرحد) رجسٹرڈ کے کارکنوں کی مساعی کا مشکور ہے اور متوقع ہے کہ انہوں نے کلچر کے فروغ کے لئے فنکاروں کی حوصلہ افزائی کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ اسے آئندہ بھی نبھائیں گے انشاءاللہ

Publishers :

PREMIER SUGAR MILLS & DISTILLERY CO. LTD.,

MARDAN.